جنوری ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت بیس روپے سالانہ

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کامل۔

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں نظرثانی کے ساتھ ضروری اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات۔ حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ"۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرنو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ کتابت حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۸۶ || بابت ماہ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۸۱ء || شمارہ ۱

نظرات

افسوس ہے گزشتہ مہینے خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کا کم وبیش ۸۵ برس کی عمر میں کلکتہ میں انتقال ہوگیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم قومی اعتبار سے ہندوستان کے ان پنجابی مسلمانوں میں سے تھے جو تجارت اور کاروبار میں ترقی کے لئے ممتاز ونمایاں ہیں۔ مرحوم اپنی جماعت میں بھی ممتاز اور نہایت محترم ومعزز سمجھے جاتے تھے، طبعًا نہایت مخیر اور غربا وفقرا کی انفرادی طور پر امداد کرنے کے علاوہ قومی، مذہبی اور ملکی معاملات میں بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے خرچ کرتے تھے ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ان کا قائم کیا ہوا خان بہادر شیخ محمد جان ہائر سکنڈری اسکول کلکتہ کی ایک قدیم اور نیک نام مسلمان بچوں کی تعلیم گاہ ہے، علاوہ ازیں وہ کلکتہ اور بیرون کلکتہ کے بیسیوں بلند پایہ اور ممتاز تعلیمی اداروں کے رکن تھے، دیوبند کے علماء سے ان کو بڑی عقیدت اور ارادت تھی عقیدہ اور عمل اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان تھے، پنجگانہ نماز باجماعت کی پابندی کے علاوہ تہجد گذار بھی تھے اور اوراد ووظائف کا شغل بھی رکھتے تھے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، سیاسی اعتبار سے کمٹڈ نیشنلسٹ تھے کانگرس اور جمعیۃ العلماء کے ہم خیال اور فرقہ وارانہ سیاست کے مخالف ہمیشہ رہے، اور اگرچہ تعلیم

سے پہلے مسلم لیگ کی تحریک کے سخت بحران وجوش کے باعث، دوسرے مسلم نیشنلسٹ اکابر کی طرح خان بہادر صاحب کو شدید اذیتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم انھوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور ان کے خیال اور روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، ارکان ندوۃ المصنفین کے ساتھ ذاتی تعلق کے علاوہ شروع سے ادارہ کے محسن رہے، تقسیم کے وقت جب ادارہ لٹ لٹا کر تباہ و برباد ہو گیا، ارکان ادارہ بے خانماں اور بے سروسامان ہوگئے تھے اور ادارہ کے دوبارہ قائم اور جاری ہونے کی بظاہر کوئی امید باقی نہیں رہی تھی تو اس وقت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو جنھوں نے ان سخت مایوس کن حالات میں بھی ادارہ کو از سر نو قائم کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تھا سب سے بڑی تقویت خان بہادر صاحب مرحوم کی حوصلہ افزائی اور فیاضانہ امداد سے ہی ہوئی، وہ ندوۃ المصنفین کے کاموں کے بڑے قدردان تھے، برہان اور ادارہ کی مطبوعات کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے تھے، اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے خوش طبع، مرنجاں ومرنج، ہمدرد اور متواضع تھے، اب ایسے وضعدار کہاں ملیں گے، ان کا حادثۂ وفات خود ندوۃ المصنفین کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے ادارہ اس حادثۂ فاجعہ میں مرحوم کے پسماندگان کا دل سے شریکِ غم ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں ابرار وصلحا کا مقام جلیل عنایت فرمائے اور انکی قبر ٹھنڈی رکھے۔

افسوس ہے اسی مہینہ ڈاکٹر مصطفےٰ احسن صاحب علوی کا حادثۂ وفات بھی پیش آگیا اسوقت ان کی عمر ۸۷ برس کے لگ بھگ تھی، ان کا اصل وطن کاکوری تھا۔ اردو زبان کے مشہور نعت گو جناب محسن کاکوروی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ کے درس بخاری کے آخری سال میں، دورۂ حدیث کی تکمیل کی تھی، اور اسکے بعد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کی جامع مسجد میں ان کو دستارِ فضیلت عطا فرمائی تھی، اس حیثیت سے وہ غالباً حضرت شیخ الہند کی بزم تلامذہ کے آخری چراغ تھے، اب تو دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے کثرت سے نظر آتے ہیں لیکن غالباً مرحوم پہلے شخص تھے جنہوں نے دارالعلوم دیوبند

سے باقاعدہ فارغ ہونیکے بعد انگریزی تعلیم شروع کی لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے کرکے پی۔ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اسکے بعد وہ ایک عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ سے منسلک رہے آخر میں چند برس شعبۂ عربی میں بھی کام کیا، عربی بولنے اور لکھنے کا بڑا شوق تھا شعر و شاعری کا ذوق موروثی تھا، لکھنؤ کی زبان اور اسکے رنگ میں غزلیں لکھتے، اور ترنم سے پڑھ کر اہل ذوق سے داد لیتے تھے، تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔ انکی آخری کتاب "فوائد بدر واحد" تھی جس پر بہار اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا، علاوہ ازیں عرصہ ہوا ان کو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی کا ایوارڈ بھی ملا تھا، دارالعلوم دیوبند سے بڑی محبت تھی۔ اسکی مجلس شوریٰ کے ممبر عرصہ دراز سے تھے اور پابندی سے اسکے جلسوں میں شرکت کرتے تھے، مگر ادھر چند برس سے بتقاضائے عمر ضعف ونقاہت کے باعث شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کا معمول نہیں رہا تھا۔ عجیب اتفاق ہے مارچ ۸۰ء میں جو اجلاس صد سالہ ہوا اس میں دیوبند آئے اور پھر اسکے بعد ۱۱ر۱۲ ر اکتوبر کو مجلس شوریٰ کا جو جلسہ ہوا تو وہ اسمیں بھی شریک ہوئے، ایسے موقع پر حضرت شیخ الہند کے آخری تلمیذ سمجھ کر طلباء ان کے پاس کثرت سے آتے اور ان کی زبانی اکابر دیوبند کے واقعات سنتے تھے، طلباء حسب معمول اس مرتبہ بھی انکے کمرہ میں جمع ہوئے تو ان سے بولے "بچو! آفتاب عمر لب بام ہے، پتہ نہیں اب آئندہ کبھی میں دیوبند آ بھی سکوں گا یا نہیں، اسلئے تم مجھ سے درس حدیث لے لو تاکہ میں تم کو اپنی سند دے دوں" چنانچہ انھوں نے یہی کیا، دو چار حدیثیں بخاری کی پڑھیں اور طلباء کو اسناد کی اجازت دیدی، طبعاً بڑے خلیق، شگفتہ مزاج، وضعدار و بامروت انسان تھے۔ لکھنؤ کے شرفاء کے اوصاف وکمالات کے حامل تھے، خاتمہ بھی عجیب وغریب طریقہ پر ہوا، ۲۶ر نومبر ۸۰ء کو عصر کی نماز ادا کرتے کرتے سجدہ میں گئے تو پھر سر اٹھانا نصیب نہ ہوا، جان جان آفریں کے سپرد کر دی، دوسرے دن نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اور تدفین وطن کاکوری کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

اسلام اور انسانیت کی بقاء

آج سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور اسی کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کے فقدان اور اقوامِ عالم کی باہمی کشمکش و آویزش کے باعث خود انسان کے نفسِ وجود اور اس کے حفظ و بقا کو جو عظیم خطرات درپیش ہیں انھوں نے مدبرینِ عالم کو ان خطرات کے انسداد کی کوششوں کی طرف متوجہ کردیا ہے مجلس اقوام متحدہ ایک سیاسی ادارہ ہے اس نے ان عقلاء کے مشکل کا ایک حل نکالا ہے، لیکن برسوں کے تجربات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ حل کامیاب نہیں ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ایک گرہ کھولنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دس گرہیں اور لگ جاتی ہیں اور معاملہ سلجھنے کے بجائے روز بروز پیچیدہ ہوتا جارہا ہے، اربابِ سیاست کی اس ناکامی کو دیکھ کر بہت سے اصحابِ فکر و بصیرت نے محسوس کیا کہ اگر کوئی طاقت عالم انسانیت کو اس خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی ہے تو وہ صرف مذہب کی طاقت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مذہب کی جو گرفت انسان کے فکر و خیال اور اس کے واسطہ سے عمل و کردار پر ہوتی ہے وہ کسی اور چیز کی نہیں ہوتی، اس بنا پر مذہب میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ انسانی ضمیر کو بیدار کرکے ان عوارض و اسقام کا خاتمہ کردے جو ضمیر کے مردہ ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو حضرات اس خیال کے تھے انھوں نے،

(Raligien and peace) کے نام سے ایک عالمی ادارہ قائم کیا اور دنیا کے تمام اہل مذاہب اس میں شریک ہیں اس ادارہ کا دوسرا بین الاقوامی اجلاس جو ۱۹۷۰ء میں جاپان میں ہوا تھا اس میں ناکسار نے بھی شرکت کی، مقالہ پڑھا اور بحث میں حصہ لیا تھا۔ اس عالمی ادارہ کا صدر دفتر نیویارک امریکہ میں ہے، بہرحال ان بین الاقوامی حالات کے پیش نظر وقت کا تقاضا اور مطالبہ ہے کہ اسلام کو بتانا چاہیے کہ وہ دنیا کے ایک اہم اور عظیم الشان مذہب کی حیثیت سے اس معاملہ میں کیا رہنمائی دے سکتا ہے۔ اس مقالہ کا مقصد اس سوال کے جواب میں ہی چند گذارشات پیش کرنا ہے:

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلام میں انسان کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ قرآن مجید میں تخلیقِ آدم کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو خلافت الٰہی کے خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام اسی درجہ فرمایا ہے کہ جب فرشتوں نے اس منصب عظیم وجلیل کا استحقاق اپنے لیے ثابت کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بالمقابل انسان کا استحقاق اس طرح ثابت کیا کہ اس کو حقائقِ کائنات کا علم بخشدیا گیا، فرشتے اس علم سے محروم تھے ان پر جب انسان کی یہ فضیلت و برتری عیاں ہوگئی تو اب وہ خدا سے عفو و درگزر کے خواستگار ہوئے، خدا نے عفو و درگزر کے لئے شرط یہ رکھی کہ فرشتے آدم کو سجدہ کریں، سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ابلیس اس کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتا تھا کہ وہ ناری ہونے کے باوصف ایک تپلۂ خاکی کے سجدہ ریز ہو، اس لئے اس نے سرتابی اور حکم عدولی دکھائی۔ اس کی سزا اس کو یہ ملی کہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ اور شر و فساد، عصیان و تمرد اور فسق و فجور کا سب سے بڑا منبع و سرچشمہ قرار دیا گیا۔ اب یہ پورا واقعہ جو قرآن میں بیان ہوا کیا گیا ہے اس پر غور کیجیے اور دوسری طرف یہ دیکھیے

کہ تخلیقِ آدم کے واقعہ کو انجیل مقدس میں کس طرح بیان کیا گیا ہے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے بائبل میں ہے: خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ آدم جیتی جان ہوا۔ پیدائش باب ۲ - ۵ - ۷) خیال کیجئے کہاں آدم کی تخلیق ایک کسان کی حیثیت سے اور کہاں اس کی تخلیق خالق کائنات، صانعِ عالم کے ایک نائب کی حیثیت سے، جس کی وجہ سے وہ ایک طرف مسجودِ ملائکہ ہوا اور دوسری طرف اس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں ابلیس ہمیشہ کے لئے مردود و راندۂ درگاہِ ایزدی کر دیا گیا۔ غالب نے اسی مضمون کو اپنے خاص انداز میں بڑی بلاغت سے بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن اگر مرزا غالب کی نگاہ انسانوں کے احوال و اعمال اور پھر فرمودات قرآن پر ہوتی تو غالبًا وہ یہ شعر نہ کہتے، کیونکہ انسان کو قرآن میں جہاں خلیفۂ الٰہی کہا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ یہ شرف و عظمت ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو مومنین صالحین ہیں ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہے، کیونکہ تخلیق آدم کی آیت میں جس آدم کا ذکر ہے وہ نوع کے نمائندہ ہیں افراد کے نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝	زمانہ کی قسم بے شبہ انسان بڑے گھاٹے میں ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں، اعمال صالحہ کرتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے ہیں

یہی مضمون سورۃ والتین میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

بے شبہ ہم نے انسان کو بہترین سانچہ میں پیدا کیا ہے پھر اس کے اپنے اعمال و افعال کے باعث اسے ہم نے انتہائی پستی کی طرف لوٹا دیا ہے، مگر ہاں اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو مومنین صالحین ہیں، ان کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم نہ ہوگا۔

ان دونوں سورتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ایک عالم بحیثیت عالم کے جس مرتبہ و مقام کا مستحق ہے یہ مرتبہ و مقام اس کو اسی وقت ملیگا جب کہ وہ اپنے علم پر عامل بھی ہو، ورنہ وہ عالم نہیں جاہل سے بدتر ہے، ٹھیک اسی طرح خلافت الٰہی کا منصب نوع انسان کے ان افراد کامل کو عطا ہوگا جو اس منصب عظیم و جلیل کے مقتضیات و مطالبات اور اس کے شرائط و آداب کی تکمیل بہمہ وجوہ کرتے ہوں، ورنہ صرف حیوان ناطق ہونا انسان ہونے کیلئے کافی نہیں اسی بنا پر قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو جو نیابت الٰہی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے فارسی کے مشہور صوفی اور حکیم شاعر نے کہا ہے ؎

دے شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

گفتم یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور اردو میں یہی بات غالب نے اس طرح کہی ہے ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!!

اب جب کہ انسان کو نیابت الٰہی کا فرض سونپ دیا گیا تو ضروری تھا کہ اس فرض کی خاطر خواہ انجام دہی کے لئے جو ذرائع اور وسائل ناگزیر ہیں انسان کو ان سے بھی نوازا جاتا، اصولی اور بنیادی طور پر یہ وسائل و ذرائع تین ہیں:۔

(۱) علم (۲) دستور العمل وقانونِ حیات اور (۳) اقتدار وقوت تسخیر وتصرفات قرآن نے انسان کے خلیفۂ الٰہی ہونے کا اعلان جہاں ملاءِ اعلیٰ میں کیا ہے وہاں مذکورہ بالا تینوں ذرائع کے ساتھ اس کے مشرف ومفتخر ہونے کی وضاحت کردی ہے، چنانچہ علم کے متعلق فرمایا گیا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، یعنی اللہ نے آدم کو سب اسمار کا علم عطا فرمادیا، یہاں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ آیت میں اگرچہ لفظ اسمار کا آیا ہے جو جمع اسم بمعنی نام کی ہے، لیکن درحقیقت مراد اسماء نہیں بلکہ مسمات اور اشیاء ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر فرمایا گیا: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ، عَرَضَهُمْ میں هُمْ جو ضمیر جمع مذکر غائب ہے اور ذی روح چیزوں کے لئے استعمال ہوتی ہے اس کا مرجع اسماء ہے، اگر اسمائے سے مراد نام ہی ہوتے تو عربی کے قاعدہ کے مطابق اس کے لئے ضمیر ھا ہوتی نہ کہ ھم۔ پس اب آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اشیاء کا علم عطا فرمادیا اور چونکہ علم شئی کے معنی علم حقیقت شئی ہے اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ آدم کو حقائق اشیاء کا عالم بنا دیا گیا۔ ممکن ہے کوئی صاحب اعتراض کریں کہ کلھا میں تو ضمیر "ھا" ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عربی میں یہ عام بات ہے کہ ضمیر کبھی مرجع کے لفظ کی رعایت سے آتی ہے اور کبھی اس کے معنی کی رعایت سے، اور کبھی ایک ہی مرجع کے لئے لفظ اور معنی دونوں کی رعایت سے دونوں قسم کی ضمیریں دو مختلف جگہوں پر آتی ہیں، مَنْ اور مَا اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ الاسماء میں الف لام جنس کے لئے ہو یا استغراق کے لئے، بہر حال معنی ہوں گے تمام اور سب اشیاء، لیکن اس کے باوجود صرف الاسماء فرمانے پر اکتفاء نہیں فرمایا گیا، بلکہ استیعاب واستقصائے اشیاء کو مؤکد کرنے کی غرض سے الاسماء کے بعد کلھا بھی ارشاد ہوا تاکہ کسی کو اس میں کوئی شبہ ہی نہ رہے کہ انسان کو عالم ارضی میں جمادات ونباتات اور حیوانات وبحریات اور عالم سماوی میں شمس وقمر، سیارے اور ستارے، اور عالم انفس وارواح کے اسرار ورموز

اورغرض کہ کائنات کی معقول ومحسوس ، مادی اور معنوی، ظاہری اور باطنی کوئی شے ایسی نہیں ہے جو انسان کے حیطۂ علم سے خارج ہو۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا علم سے متعلق تھا۔ رہا دوسرا وسیلہ وذریعہ یعنی دستور العمل و قانون حیات جس کے مطابق انسان کو نیابتِ الٰہی کا فرض انجام دینا ہے تو وہ قرآن مجید ہے جو خود کلام الٰہی ہے اور ساتھ ہی سنت وسیرت نبوی جو قرآن کی ہی تشریح و توضیح اور اس کی عملی تفسیر ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: وکان خلقہٗ القرآن۔ قرآن اور سنت ایک مکمل لائحۂ عمل اور ضابطۂ حیات ہیں، لیکن یہ موقع اس پر مفصل گفتگو کرنے کا نہیں ہے، البتہ مقالہ کے اصل موضوع سے متعلق قرآن و سنت کی بعض تعلیمات کا ذکر آگے آئے گا۔

اب لیجئے تیسرا ذریعۂ وسیلہ یعنی اقتدار وقوت تسخیر! تو اس سلسلہ میں کثرت سے آیات ہیں جن میں صاف طریقہ پر انسان کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ زمین، آسمان میں جو کچھ ہے وہ تمہاری خدمت واطاعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، چاند سورج اور سب اجرام علویہ تمہارے لئے مسخر کر دیے گئے ہیں، یعنی تم کو ان میں تصرف کرنے اور ان کو اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنے کی طاقت وقوت عطا فرما دی گئی ہے۔ مثلاً ایک آیت میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۝ (البقرہ)　　یہ وہ خدا ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے پیدا کیا ہے!

ایک آیت میں ارشاد ہوا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ　　اور خدا نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے

یہ اور اسی نوع کی اور بہت سی آیات ہیں جنھوں نے عرب کے صحرا نشینوں میں

کائنات عالم کے حقائق و اسرار کے کشف و تحقیق کا جذبہ پیدا کیا اور انھوں نے سائنس کے مختلف علوم و فنون پر محققانہ تصنیفات و تالیفات کے انبار لگا دیئے۔

آیئے اب دیکھیں کہ انسان جس کو زمین میں نیابت الہٰی کا منصب تفویض کیا گیا ہے جب وہ ساز و سامان کی ان تینوں قسموں سے آراستہ و پیراستہ اور مسلح ہو جاتا ہے تو جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کے فرائض کیا ہوں گے۔؟

قرآن کی رو سے انسان کا سب سے بڑا اور اہم فریضہ یہ ہے کہ اللہ کی زمین سے شر و فساد اور ظلم و جور کو مٹائے اور امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرے، اس بنا پر اللہ کے نزدیک سب سے برے اور قابل ملامت وہ لوگ ہیں جو فتنہ و فساد پیدا کر کے لوگوں کا جینا اجیرن کر دیتے ہیں۔ مدینہ میں منافقین کا گروہ اگائی بجھائی کی باتیں کر کے معاشرہ میں شر و فساد کی تخم ریزی کرتا اور آئے دن نئے نئے فتنے جگاتا تھا۔ اس لئے قرآن مجید میں اس پر سخت وعید اور منافقین کی خفیہ سازشوں کی پردہ دری کی گئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوا:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ (۲ البقرہ)	اور جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو زمین میں فساد برپا نہ کرو تو وہ کہتے ہیں: اجی ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں! لوگو! ہوشیار اور خبردار رہو کہ فساد برپا کرنے والے یہی ہیں لیکن یہ بے شعور ہیں۔

اسی گروہ کے چند لوگ تھے جو اپنی چرب زبانی، شیریں بیانی اور منافقانہ باتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رجھانے کی کوشش کرتے تھے، اندیشہ تھا کہ بربنائے بشریت حضورؐ ان کی باتوں میں نہ آ جائیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے خبردار کیا اور فرمایا:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ○ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ (البقرہ ۲)	اور اے محمد بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ دنیا کی زندگی کے بارہ میں گفتگو کرتے اور اپنے مافی الضمیر پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں تو آپ کو ان کی باتیں بھلی لگتی ہیں، حالانکہ یہ آپ کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور جب یہ لوگ آپ سے رخصت ہوکر جاتے ہیں تو زمین میں فساد پیدا کرنے اور لوگوں کے کھیتوں اور ان

کی نسلوں کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، حالانکہ اللہ فساد پسند نہیں کرتا، اور جب ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو ان کی نخوت ان کو اور گناہوں پر اکساتی ہے، تو پھر ایسے لوگوں کا ٹھکانہ تو دوزخ ہی ہوگی اور یہ بہت برا ٹھکانہ ہے،

کوئی کہاں تک گنائے، شر و فساد اور ظلم و جور کی شدید مذمت و قباحت اور فتنہ انگیزوں، فساد پروروں اور ظالم و قہر سامانوں کے لئے سخت وعید اور عذاب جہنم کی آیات سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے، اس لئے نیابت الٰہی کے منصب کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اللہ کی سرزمین سے ان چیزوں کا بیخ و بن سے قلع قمع کرکے امن و امان اور عافیت و سکون کی فضا قائم کرنے، نائب الٰہی کی زندگی کا مشن یہی ہے اور اسی کے لئے اسے جینا اور مرنا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مشن کی تکمیل کس طرح ہوگی۔؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس مشن کی تکمیل قرآن و سنت پر عمل پیرا ہونے سے ہوگی، یہ بات میں شروع میں ہی عرض کردوں کہ جہاں تک دنیا میں امن و امان قائم کرنے کا تعلق ہے

جس کے باعث انسانیت اپنے حفظ و بقا میں چند در چند خطرات سے دوچار ہے،
میں جس اسلامی نظام پر گفتگو کروں گا وہ اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے
اس درجہ سیکولر ہے کہ جیسا کہ پروفیسر TOYNBI وغیرہ نے کہا ہے غیر مسلم قومیں بھی
اسے UNITADNATIUNS کے CHARTISOFHUMAN RIGHTS کی طرح
بے تکلف اختیار کر سکتی ہیں، فرق صرف APPROACH اور ATHITUDE کا ہوگا،
اب آیئے اسلامی نظام کا جائزہ لیں:۔

اسلام عقیدہ اور عمل کا نام ہے، کوئی عمل انفرادی ہو یا اجتماعی، اس میں
استواری، خلوص اور ولولۂ وجوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک اس کی
اساس کسی محکم عقیدہ پر نہ ہو، اس بنا پر اسلام نے عقیدہ پر بار بار بہت زور دیا ہے کہ اسلامی
عقیدہ کے دو جز محرک عمل ہونے کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں، ایک ایمان باللہ اور دوسرا
یوم حساب یعنی مکافاتِ عمل پر ایمان، اسلام نے ان دونوں کا اہتمام اس درجہ کیا ہے۔
چونکہ مکہ کی زندگی تخم ریزی کا عہد تھا اس لئے قرآن مجید کی مکی سورتیں اکثر بیشتر انہیں دو
چیزوں کے نہایت پُر زور بیانوں پر مشتمل ہیں، اس کا نتیجہ اور اثر یہ ہے کہ اچھا ہو یا بُرا
مسلمان اپنے ہر عمل کے لئے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ اور مسئول سمجھتا اور اس
کے مطابق قیامت کے دن جزا یا سزا کا سزاوار یقین کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں اس عقیدہ کی تخم ریزی اس شدت اور قوت سے کی کہ پھر
اس کے بعد مدینہ کے دس برسوں میں احکام و تعلیمات اسلام کے درس وارشاد کے
ذریعہ پوری تاریخ عالم کا رخ موڑ دیا اور دنیا جو جہنم کدۂ شر و فساد بنی ہوئی تھی۔ وہ بہشتِ
امن و عافیت میں تبدیل ہو گئی، یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جو تعلیمات دیں ان سے انسان کی تہذیبی اور اجتماعی زندگی میں فتنہ و فساد اور
ظلم و جور کے تمام اسباب کا قلع و قمع خود بخود ہو جاتا ہے۔

اگر تجزیہ وتحلیل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شر وفساد اور ظلم وعدوان کے اسباب حسب ذیل ہوتے ہیں:-

(۱) اتباعِ ہوا یعنی ایک فرد یا ایک جماعت چند غلط تصورات کے ماتحت اپنی خواہشات نفس اور اہوائے فاسدہ وباطلہ کا غلام بن کر ایک ایسا اقدام کرتی ہے جو سوسائٹی کے شیرازۂ امن وعافیت کو درہم وبرہم کرکے رکھدیتی ہے۔

(۲) مذہب کا اختلاف۔ (۳) رنگ ونسل اور قومیت ووطنیت کا اختلاف اور (۴) سرمایہ داری اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی طبقاتیت ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اسلام نے ان سب اسباب کی بیخ کنی کس طرح کی ہے؟

اتباعِ ہوی ایک انسان خواہشات نفس کی پیروی اس وقت کرتا ہے جب کہ ان کے لئے کوئی قدغن نہ ہو۔ اسلام نے عقیدۂ توحید ویوم آخرت کے ذریعہ نفس انسانی کو اپنی ذاتی خواہشات سے ایسا پاک وصاف کیا کہ اب اس کی اپنی کوئی ذاتی خواہش رہی ہی نہیں اور اس کا جو کام بھی تھا وہ رضائے رب اور خوشنودئ الٰہی کے لئے تھا۔ نفس انسانی میں یہ صفت تزکیہ کا ذریعہ پیدا ہوتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو تین مقاصد بیان کئے گئے ہیں ان میں نمبر ۲ تزکیہ کا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ٥ (الجمعہ)

یہ وہی ہے جس نے ناواقف لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول اٹھایا جو ان لوگوں کو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

پھر عقیدہ کے ذریعۂ تذکیۂ نفس کے علاوہ اتباع ہوا کی مذمت اور ترک ہوا کی ترغیب و تحریض میں شدومد کے ساتھ قرآن میں اس کثرت سے آیات ہیں کہ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اسلام نام ترک ہوا یعنی SELF CONTROL اور SELF RESISTENCE کا ہی ہے، چنانچہ ایک مقام پر تو جنت و دوزخ کا انحصار ہی ترک و اتباع ہوا پر رکھا گیا ہے، فرمایا گیا۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ہ (النازعات)	پس وہ لوگ جو سرکشی کرتے ہیں اور دنیا کی زندگی کو چمٹے ہوئے ہیں تو بس ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور اس کے مقابل وہ لوگ جن کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کا ڈر ہے اور جو

نفس کو خواہشات کی پیروی کرنے سے روکتے ہیں ان کا ٹھکانہ جنت ہے۔

یہ خواہشاتِ نفس وہی ہیں جن کو فلسفۂ اخلاق کی زبان میں رذائل اور سائیکالوجی کی اصطلاح میں منفی جذبات (NEGATIVI PASSION) کہتے ہیں، امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم اور مشائخ و صوفیائے اسلام کے ملفوظات و مکتوبات کا مطالعہ کیجئے، آپ کو اندازہ ہوگا کہ امراضِ نفسانی کے ان طبیبوں نے ایک ایک مرض، اس کی قسموں اور علامتوں (SYMPTOMS) کا جائزہ کس دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر سے لیا ہے اور پھر کس حذاقت و دیدہ وری سے ایک ایک مرض کا علاج تجویز کیا ہے کہ اگر کوئی شخص صحابۂ کرامؓ اور اولیائے عظام کی طرح شفاخانۂ حجاز کے اس نسخہ پر عامل ہوجائے تو اقبال کی زبان میں کہہ سکتا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے   یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

اس نے کو ذرا اور بڑھائیے تو معلوم ہوگا کہ یہی ترکِ ہوا ہو حقیقت لا الٰہ ہے

اور جب نفی نفی سے ایک مثبت حقیقت ابھرتی ہے تو وہ الا اللہ کا روپ دھار لیتی ہے۔

(۲) اختلاف مذہب!۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے پیغمبر آئے۔ اور یہ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں آئے " وَمَا مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔ وہ بنیادی طور پر ایک ہی پیغام ایمان وعمل صالح کا لے کر آتے رہے، البتہ ان کی شریعتیں زمانی اور مکانی حالات وظروف کے اختلاف کی رعایت کے باعث مختلف اور متنوع رہیں! اور ہر پیغمبر سابق اپنے بعد آنے والے یعنی پیغمبر لاحق کی آمد سے اپنے پیروؤں کو مطلع کرتا رہا تاکہ جب وہ آجائے تو لوگ اس کی اطاعت اور نئی شریعت پر عمل کریں، اسی طرح ہوتے ہوتے یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، اور آپ پر ختم ہوگیا، اس کے وجوہ یہ ہیں (الف) قرآن مجید میں وہ تمام صداقتیں اور سچائیاں یکجا مجتمع ہیں جو انبیائے سابقین میں سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہیں۔ (ب) انبیائے سابقین کی تعلیمات میں بعض تاریخی عوامل کے زیر اثر جو تحریفات ہوگئی تھیں قرآن میں ان کی تصحیح کردی گئی ہے (ج) انبیائے سابقین کی جو تعلیمات تشنہ تھیں انہیں مکمل، جو مجمل تھیں انہیں مفصل اور جو وقتی اور مکانی تھیں انہیں ہمہ گیر و عالم گیر اور ابدی بنا کر بیان کر دیا گیا ہے (د) انبیائے سابقین کی بعثت کسی خاص قوم کی طرف ہوتی تھی اس لئے ان کی شریعت میں اس خاص قوم کے زمانی ومکانی حالات کی رعایت ہوتی تھی، لیکن محمد رسول اللہ کی بعثت ساری دنیا کے اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔ اس لئے شریعت محمدی نہایت جامع ہے اور اس میں ہر دور اور ہر زمانہ کے اقوام عالم کے تہذیبی وتمدنی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے؛ ان وجوہ کی بنا پر اسلام کہتا ہے کہ اب مدار نجات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے۔

لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں، ہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کی تحقیر و تذلیل کو روا رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن کا اعلان تو یہ ہے:۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ، (۲ البقرہ ۲)

سب لوگ ایک ہی امت تھے، اس لئے اللہ ان میں بشیر و نذیر انبیاء مبعوث کرتا رہا اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتابیں نازل کیں تاکہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کرنے لگے ہیں یہ کتابیں ان میں فیصلہ کریں۔

اس بنا پر اسلام نے مومن ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ اللہ، یوم آخرت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ساتھ انبیائے سابقین اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لایا جائے یعنی اپنے اپنے زمانہ میں ان کے برحق اور صادق ہونے کا اقرار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلام میں بت پرستی سے زیادہ کوئی چیز مبغوض اور قبیح نہیں ہے، لیکن اسلام جن اخلاق فاضلہ اور تہذیب و شائستگی کی تعلیم دیتا ہے، ان کے پیش نظر قرآن میں بتوں کو بھی برا بھلا کہنے کی ممانعت کردی گئی ہے، اسلام انسانی عقل و فہم اور تدبر و نظر سے یہ اپیل ضرور کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں، لیکن اگر کوئی اسے قبول نہیں کرتا تو وہ اس پر جبر بالکل نہیں کرتا، اس معاملہ میں وہ مکمل آزادی کا قائل اور حامی ہے، قرآن میں ارشاد ہوا:۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ یعنی اب جبکہ کھرا کھوٹا اور حق و ناحق عیاں ہوگئے ہیں تو دین میں جبر کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں، ایک مقام پر فرمایا گیا:۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ یعنی اے محمد! آپ کا فرض ہے دعوت و تبلیغ، وہ کرتے رہئے، لیکن اگر وہ نہ مانیں تو آپ کہئے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا

ہے اور وہ صاحب عرش عظیم ہے،

قرآن میں اس مضمون کی اور بھی آیات ہیں، یہ کہیں نہیں ہے کہ جو شخص آپؐ کا پیغام قبول نہ کرے اس کی گردن ناپ لیجئے، کسی مذہب یا اہل مذہب کے بارے میں بد زبانی کرنا تو کجا، ارشاد نبوی ہے: اکرموا کریم کل قوم: یعنی جو قوم بھی ہو، اسے مسلمانو! تم اس کے سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ احترام اور تکریم کے ساتھ پیش آؤ، اس معاملہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اہتمام اس درجہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آپ کے پاس سے گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے، لوگوں نے کہا۔ یہ تو یہودی کا جنازہ تھا" آپؐ نے جواب دیا: ہاں! مگر کیا یہ انسان نہ تھا؟" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی آداب پر اختلاف مذہب کا اثر نہیں ہونا چاہیئے۔

مرض وصحت اور اسلام

سید جلال الدین عمری

روحانی علاج دوا ایک ظاہری تدبیر ہے۔ اس تدبیر کو کامیاب بنانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو کوئی بھی تدبیر کامیاب ہوگی اور نہ چاہے تو کامیاب نہ ہوگی۔ ہم سب کا رات دن کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات حکیم اور ڈاکٹر صحیح تشخیص ہی نہیں کرپاتے اور تشخیص ہوتی بھی ہے تو اتنی تاخیر سے کہ مرض قابو سے باہر ہوجاتا ہے اور علاج ممکن نہیں رہتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہتر سے بہتر دوا کے باوجود کبھی فائدہ نہیں ہوتا اور جس علاج کو تیر بہدف کہا جاتا ہے وہ بھی ناکام ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوا اسی وقت کام کرتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو خاک بھی اکسیر بن جائے۔ اس کی مرضی نہ ہو تو مجرب سے مجرب نسخہ بھی اپنی تاثیر کھودے۔ اس لئے دوا علاج کے ساتھ مریض کو اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا چاہیئے اور ظاہری تدابیر سے زیادہ اس کی مدد اور کرم پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

تعلق باللہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مریض اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرے یہ تعلق خود بھی ایک علاج ہے اور بہت بڑا علاج ہے۔ اس سے مریض کو سکون اور راحت ملتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا خدا اس کے ساتھ ہے

جو اس کے حالات سے اچھی طرح باخبر اور اس کے دکھ درد سے واقف ہے، جو سراپا رحیم و کریم ہے، جو بڑی حکمتوں اور مصلحتوں والا ہے جس کی قدرت بے پایاں اور لامحدود ہے اور جو چاہے تو آن کی آن میں اسے صحت و تندرستی عطا کر سکتا ہے، یہ احساس اسے مایوسی اور ناامیدی سے بچاتا اور اسے نئی زندگی اور توانائی عطا کرتا اور اس کے اندر مرض کے مقابلہ کا عزم اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

قرآن ایک نسخۂ شفا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے اور اسے بڑھانے کا بہترین ذریعہ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا کہا ہے۔ اس نسخۂ شفا سے ہر طرح کے مریض صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا (بنی اسرائیل ۸۲)	ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں اس میں مومنوں کے لئے تو شفا اور رحمت ہے اور یہ ظالموں کے خسارے ہی میں اضافہ کرتا ہے۔

امام رازی نے اس آیت کے ذیل میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن، روحانی امراض کے لئے بھی شفا ہے اور جسمانی امراض کے لئے بھی، روحانی امراض کے لئے اس کا شفا ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ اس لئے کہ یہ باطل عقائد اور فاسد اخلاقیات کی اصلاح کرتا ہے اور ان کی جگہ صحیح عقائد اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ باقی رہا امراض جسمانی کے لیے اس کا شفا ہونا تو یہ بھی طے ہے۔ اس کی تلاوت کی برکت سے بہت سے امراض دور ہوتے ہیں فلاسفہ اور جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے سب ہی جانتے ہیں کہ بے معنی قسم کے منتروں اور تعویذوں کے بھی اثرات ہیں۔ ان کے ذریعہ فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے اور نقصان سے بچا بھی جاتا ہے، پھر اس قرآنِ عظیم کی تلاوت، جس میں اللہ کے جلال اور کبریائی، ملائکہ

مقربین کی عظمت اور سرکش شیاطین کی تحقیر کا بیان ہے اس سے دین و دنیا کا نفع کیوں نہیں حاصل ہوگا۔ اس کی تائید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے آپ نے فرمایا:۔

من لم یستشف بالقرآن فلا شفاہ اللہ تعالیٰ [1]　　جو شخص قرآن سے اسے حقیر اور بے فائدہ سمجھ کر شفا نہ طلب کرے اللہ اسے شفا نہ دے۔

قرآن طب کی کتاب نہیں ہے وہ بیماروں کے علاج معالجہ سے بحث نہیں کرتا اس کا موضوع انسان کی فکری و اخلاقی اصلاح ہے۔ لیکن اگر اس سے جسمانی مریض بھی صحتیاب ہوتے ہیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ خدا کے کلام میں ضمناً اس طرح کی تاثیر پائی جا سکتی ہے عقل اس کو ناممکن اور بعید نہیں سمجھتی، پھر یہ کہ احادیث میں صراحت کے ساتھ قرآن کی اس خصوصیت کا ذکر موجود ہے، اس لئے بھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

خیر الدواء القرآن [2]　　بہترین دوا قرآن ہے۔

قرآن مجید میں شہد کو بھی شفاء کا سبب بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (النحل ۶۹)　　شہد کی مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر ۵/۴۴۴ یہ روایت تفسیر کی بعض اور کتابوں میں بھی نقل ہوئی ہے۔ لیکن حدیث کی کسی مستند کتاب میں مجھے نہیں ملی کنز العمال ۱۰/۴ میں دارقطنی کی الافراد کا حوالہ ہے۔ اس کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس سلسلہ کی دوسری روایات جو آگے آرہی ہیں ان سے اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ [2] ابن ماجہ، ابواب الطب، باب الاستشفاء بالقرآن۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علیکم بالشفائین العسل والقرآن[1] دو چیزیں جن میں شفا ہے انہیں نہ چھوڑو یعنی شہد اور قرآن۔

اس حدیث میں گویا قرآن کے ان دونوں بیانات کو جوڑ دیا گیا ہے کہ قرآن شفا ہے اور شہد میں شفا ہے علاج دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مادی۔ دوسرا روحانی۔ اس حدیث میں دونوں طرح کے علاج کا ذکر ہے۔ شہد کی خوبی یہ ہے کہ وہ غذا بھی ہے اور دوا بھی۔ اس کے بے شمار طبی فوائد ہیں۔ اس لئے مادی علاج کے طور پر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن شریف سے روحانی علاج ہوتا ہے اور اس سے بھی بیمار شفایاب ہوتے ہیں۔ تجربہ جس طرح مادی علاج سے فائدہ کی شہادت دیتا ہے۔ اسی طرح اس بات کی بھی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے کلام میں تاثیر ہے اور اس سے مریضوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔

قرآن کی تلاوت

بیماری میں قرآن سے فائدہ اٹھانے کی مختلف صورتیں ہیں ان میں کی ایک صورت قرآن کی تلاوت ہے۔ مریض خود بھی تلاوت کرسکتا ہے اور دوسرے بھی اس کے پاس بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت واثلہ بن الاسقع رضؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حلق میں تکلیف کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا تم قرآن پابندی سے پڑھو۔

اسی طرح ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سینہ میں درد کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا قرآن

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الطب، باب العسل۔ مستدرک حاکم ۴/۲۰۰ تفصیلی بحث کے لئے دیکھی جائے علامہ ابن قیم کی کتاب الطب النبوی۔

پڑھو، دیکھو، اللہ تعالیٰ نے قرآن کو شفاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُورِ، کہا ہے (یعنی اس میں سینوں کے امراض کی شفا ہے)

ابو عبید کی روایت ہے (مشہور تابعی) طلحہ بن مصرف فرماتے ہیں (صحابہؓ کے دور میں) یہ کہا جاتا تھا کہ مریض کے پاس قرآن پڑھنے سے وہ بیماری میں کمی محسوس کرتا ہے۔ [1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی مریض کے سامنے خدا کی قدرت و حکمت کا بیان ہو، اس کے لطف و عنایت کا تذکرہ کیا جائے، یہ بتایا جائے کہ وہ مجیب الدعوات، مشکل کشا اور حاجت روا ہے، مصائب و مشکلات میں صبر و ثبات کا بڑا اجر و ثواب ہے تو اس سے وہ قلبی راحت اور سکون محسوس کرتا ہے، اس سے اس کا اضطراب اور بے چینی کم ہوتی اور غم و اندوہ کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے مریض کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت سے یہ مقصد پوری طرح حاصل ہوتا ہے۔

قرآن دم کرنا قرآن شریف پڑھ کر دم کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔

عمرہ بنت عبدالرحمٰن کہتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی طبیعت ناساز تھی حضرت ابوبکرؓ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک یہودی عورت کچھ پڑھ کر پھونک رہی ہے۔ آپؓ نے فرمایا۔

ارْقِيهَا بِكِتَابِ اللهِ [2]		اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھ کر پھونکو۔

یہاں بظاہر کتاب اللہ سے قرآن مجید مراد ہے۔ توریت بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ جو حصہ پڑھا جائے اس میں کسی غلط بات کی آمیزش نہ ہو۔

---

[1] - الاتقان فی علوم القرآن ۲/۱۶۳ [2] موطا، کتاب الجامع، باب التعوذ والرقیہ من المرض۔

اس روایت کے ذیل میں امام محمد فرماتے ہیں:-

وبهذا نأخذ لا بأس بالرقى بما كان فى القرآن وما كان من ذكر الله فاما ما كان لا يعرف من الكلام فلا ينبغى أن يرقى به۔ لہ	اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ جو جھاڑ پھونک قرآن سے یا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن جس کلام کا معنی و مفہوم معلوم نہ ہو اس سے جھاڑ پھونک نہیں کرنی چاہئے

قرآن کی بعض سورتوں کا اس سلسلہ میں خاص طور پر ذکر آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فى فاتحة الكتاب شفاءٌ من كلّ داء۔ لہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ کا بیان ہے اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اسی مفہوم کی آئی ہے، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ کا ایک چشمہ پر سے گزر ہوا، وہاں ایک قبیلہ رہتا تھا۔ ان لوگوں نے قبیلہ والوں سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنا مہمان بنالیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں قبیلہ کے سردار کو سانپ یا کسی زہریلے بچھو نے ڈس لیا۔ ایک شخص نے آکر ان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں میں کوئی جھاڑ پھونک جانتا ہے؟ ایک صاحب نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں، لیکن تم لوگوں نے ہمیں کچھ کھلایا پلایا نہیں اس لئے

لہ موطا، امام محمد ص ۳۷۳۔ لہ رواہ الدارمی، فضائل القرآن، فضل فاتحۃ الکتاب، والبیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ، فضائل القرآن۔

جب تک اس کا معاوضہ نہیں دو گے میں زہر نہیں اتاروں گا۔ چنانچہ (تیس)[۳] بکریوں پر معاملہ طے ہوا۔ انھوں نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر پھونکی تو وہ ٹھیک ہوگیا۔ وہ بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہونچے تو ان لوگوں نے کہا تم نے کتاب اللہ کی اجرت لی ہے ہم اسے پسند نہیں کرتے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ مسکرانے لگے اور فرمایا تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ سے جھاڑ پھونک ہوسکتی ہے؟ اسے آپس میں تقسیم کرلو اور میرا بھی حصہ لگا دو[۱]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں:۔

فیہ التصریح بانھا رقیۃ فیستحب ان یقرأ بھا علی اللدیغ والمریض وسائر اصحاب الاسقام والعاھات[۲]

اس میں صراحت ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک رقیہ (دعا) ہے۔ جس شخص کو سانپ یا بچھو ڈس لے اس پر اور جو مریض ہے اس پر غرض یہ کہ سب ہی بیماروں اور آفت زدہ انسانوں پر اس کا پڑھنا پسندیدہ ہے

اسی قسم کی ایک اور روایت خارجہ بن الصلت سے آئی ہے۔ وہ اپنے چچا[۳] سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ واپسی میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا ایک قبیلہ پر سے گزر ہوا۔ اس قبیلہ میں ایک پاگل تھا جو زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ قبیلہ والوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ لوگ اس شخص (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس سے دین و دنیا کی بھلائی لے کر آئے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی دعا یا دوا ایسی ہے کہ اس کا علاج ہوسکے۔ ہم نے کہا ہاں! چنانچہ وہ لوگ اس پاگل کو باندھ کر لائے

---

[۱] بخاری، کتاب الطب، باب الرقی بفاتحۃ الکتاب۔ مسلم، کتاب السلام، باب جواز اخذ الاجرۃ علی القرآن [۲] شرح مسلم ۲/۲۲۴ [۳] ان کا نام راجح قول کے مطابق علاقہ بن صحار تمیمی ہے۔

ہں نے تین دن صبح و شام سورۂ فاتحہ اس پر دم کی۔ تو وہ اس طرح ٹھیک ہوگیا جیسے رسی سے کھول دیا گیا ہو۔ انھوں نے مجھے سو بکریاں دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تاکہ معلوم ہو کہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور تو کچھ نہیں پڑھا۔ میں نے عرض کیا نہیں! آپؐ نے فرمایا لوگ باطل قسم کے منتر پڑھ کر اس کا معاوضہ کھاتے ہیں اور تم تو ایک جائز دعا پڑھ کر اس کا معاوضہ کھا رہے ہو۔[1]

سورۂ اخلاص اور معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) کا مرض اور صحت دونوں حالتوں میں پڑھ کر دم کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ آدمی انہیں خود بھی اپنے اوپر دم کر سکتا ہے اور دوسروں سے کرا بھی سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ سورتیں بہت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔ سورۂ اخلاص میں مشرکانہ تصورات کی بھرپور تردید اور توحید کا مکمل اثبات ہے، یہ اسلام کے عقیدۂ توحید کی بہترین ترجمان ہے، اس کی بار بار تلاوت اور اس پر غور و فکر انسان کو غلط عقائد سے محفوظ رکھ سکتا ہے، معوذتین میں سحر، جادو، ظلمت شب کے مضرات، کسی کے حسد اور اس کے اثرات و نتائج، بُرے خیالات اور شیاطین جن و انس کے ہر طرح کے شر سے اللہ تعالی کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ یہ جامع و مانع اور مکمل استعاذہ ہے۔

حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر لیٹتے تو سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیوں پر پھونکتے اور انہیں اپنے چہرہ پر

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقی۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا یا آیات کے ذریعہ علاج کر کے اس کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ ان دو واقعات کے علاوہ کوئی اور واقعہ دور رسالت میں ہمیں نہیں ملتا۔ آج کل دعا تعویذ وغیرہ کا جس طرح کاروبار چل رہا ہے ان واقعات سے اس کے جواز کا حکم لگانا مشکل ہے۔

اور جسم پر جہاں تک وہ پہونچ سکیں پھیرتے تھے جب آپ بیمار ہوئے تو مجھ سے فرماتے تھے کہ تم ان سورتوں کو پڑھ کر میرے چہرہ اور جسم پر ہاتھ پھیرا کرو۔[1]

ایک اور روایت میں ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوتی تو آپؐ معوذتین پڑھ کر اپنے اوپر پھونکتے اور بدن پر ہاتھ پھیر لیتے۔ مرض الموت میں یہ سورتیں پڑھ کر میں پھونکتی اور اپنے ہاتھ کی جگہ آپؐ کا دست مبارک پھیرتی تھی اس لئے کہ وہ زیادہ بابرکت تھا۔[2]

ایک اور روایت میں فرماتی ہیں کہ آپؐ کے گھر کے لوگوں میں سے جب کوئی بیمار ہوتا تو آپؐ معوذتین پڑھ کر اس پر پھونکتے تھے۔[3]

امام نووی فرماتے ہیں :-

وفی ھذا الحدیث استحباب الرقیۃ بالقراٰن وبالاذکار انما رقی بالمعوذات لانھن جامعات للاستعاذۃ من کل المکروھات جملۃ وتفصیلاً[4]	اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور دوسرے اذکار کا پڑھ کر پھونکنا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر معوذات اس لئے پڑھ کر پھونکیں کہ یہ جامع استعاذہ ہیں۔ ان میں اجمالی اور تفصیلی طور پر ہر طرح کے مکروہات سے پناہ طلب کی گئی ہے۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام اور اس کے اسمار پڑھ کر دم کرنا جائز ہے اگر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو تب تو مستحب ہے[5]

---

[1] بخاری، کتاب الطب، باب النفث فی الرقیۃ [2] بخاری، کتاب الطب، باب الرقیٰ بالقراٰن والمعوذات [3] مسلم، کتاب السلام، باب استحباب رقیۃ المریض۔ [4] مسلم حوالہ سابق [5] شرح مسلم ۲/۲۲۳ [6] الاتقان فی علوم القرآن ۲/۱۶۶۔

قرآنی تعویذ بعض احادیث میں تعویذ سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ

إِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ[1]

بے شک جھاڑ پھونک، تعویذ اور سحر (جو عورت کی طرف شوہر کو مائل کرنے کے لئے کیا جاتا تھا) شرک ہیں۔

(تمائم، سوراخ دار دانوں کو کہا جاتا ہے جن کو پرو کر جاہلیت میں اس خیال سے بچے کے گلے میں ڈالا یا بازو پر باندھا جاتا تھا کہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے اور کسی مصیبت کا شکار نہ ہو۔ علامہ ابن قتیبہ فرماتے ہیں:-

التمائم خرز، کانت الجاهلية تجعلها فی العنق وا لعضد تسترقی بها وتظن انها تدفع عن المرء العاهات وتمد فی العمر[2]

تمائم، سوراخ دار اور نقش والے دانوں کو کہا جاتا ہے جن کو دورِ جاہلیت میں عرب گلے میں ڈال لیتے یا بازو پر باندھ لیتے تھے۔ اس سے وہ جھاڑ پھونک کا فائدہ حاصل کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ دانے انسان کی مصیبتوں کو دور کرتے اور اس کی عمر میں اضافہ کرتے ہیں۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں:-

كانت العرب تعلقها علی اولادهم یتقون بها العین فابطلها الاسلام

اہل عرب اسے نظر بد سے حفاظت کے لئے اپنے بچوں کے گلوں میں ڈالتے تھے، اسلام نے اسے ختم کر دیا۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم۔ ابن ماجہ، ابواب الطب، باب فی تعلیق التمائم
[2] تاویل مختلف الحدیث ص ۳۰۴۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

مَن عَلَّقَ تمیمۃً فلا اتم اللّٰہ لہ — جو شخص تعویذ ڈالے اللہ اس کی مراد پوری نہ کرے۔

اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

کانھم یعتقدون انھا تمام الدواء والشفاء وانما جعلھا شرکا لانھم ارادوا دفع المقادیر المکتوبۃ علیھم وطلبوا دفع الاذی من غیر اللّٰہ الذی ھو دافعہ [1]

گویا وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ مکمل دوا اور شفاء ہے آپؐ نے اسے شرک اس لئے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تقدیر میں جو لکھ دیا ہے اسے وہ اس ذریعہ سے دور کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ جو تکلیف کو دور کرنے والا ہے اسے چھوڑ کر غیر اللہ سے تکلیف دور کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں تعویذ کے طور پر جو چیزیں ڈالی جاتی تھیں ان کے پیچھے مشرکانہ تصورات موجود تھے۔ وہ ان کو نظر بد سے بچنے کی تدبیر ہی نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے خیال میں ان سے تقدیر بھی بدلی جا سکتی تھی۔ ان کے نزدیک ان کا استعمال ہی سب کچھ تھا۔ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ گویا خدا کی جگہ ان دانوں اور تعویذوں نے لے لی تھی۔ اس کے شرک ہونے میں ظاہر ہے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن جو تعویذ قرآن کی آیات، اللہ تعالیٰ کے اسمارِ حسنیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں پر مشتمل ہو اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ علامہ قسطلانی اوپر کی حدیث کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] النھایہ فی غریب الحدیث ۱/۱۱۹۔

انما کان ذالک من الشرک لانھم ارادوا دفع المضار وجلب المنافع من عند غیر اللہ ولا یدخل فی ذالک ما کان باسماء اللہ وکلامہ [1] (المواہب اللدنیہ مع شرح الزرقانی ۷/۴۲)	یہ شرک اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے دفع مضرت اور جلب منفعت غیر اللہ سے چاہی۔ اس میں وہ چیز داخل نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسمار اور اس کا کلام ہو۔

اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمیں چند کلمات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان کلمات کو ہم خوف اور گھبراہٹ سے بچنے کے لئے سوتے وقت پڑھتے ہیں۔ وہ کلمات یہ ہیں:

بِسْمِ اللّٰہِ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعِقَابِہٖ وَشَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَنْ یَّحْضُرُوْنَ	اللہ کے نام سے سوتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے کلمات کاملہ کے ذریعہ اس کے غضب سے، اس کے عقاب اور سزا سے، اس کے بندوں

کے شر سے، شیاطین کی اکساہٹ سے اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں، پناہ طلب کرتا ہوں۔

حدیث کے راوی فرماتے ہیں:

کان عبد اللہ بن عمر یعلمھا من بلغ من ولدہ ان یقولھا عند نومہ ومن کان منھم صغیرا لا یعقل ان یحفظھا کتبھا لہ فعلقھا فی عنقہ [1]	عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے جو بچے اس قابل ہوتے کہ وہ ان کلمات کو سوتے وقت کہہ سکیں انہیں وہ سکھا دیتے تھے جو بچے چھوٹے ہوتے اور انہیں یاد نہیں کر سکتے تھے انہیں وہ کسی کاغذ پہ لکھ کر گلے میں ڈال دیتے تھے۔

---

[1] مسند احمد تحقیق احمد محمد شاکر اسنادہ صحیح ۱۰/۲۲۳ ابوداؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقیٰ ترمذی کتاب الدعوات۔

سب ہی جانتے ہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اس طرح کے مسائل میں بہت سخت ہیں وہ اپنی مشہور تصنیف کتاب التوحید' میں فرماتے ہیں کہ تعویذ قرآن کی آیات پر مشتمل ہو تو سلف میں سے بعض نے اس کی اجازت دی ہے اور بعض نے اسے جائز کہا ہے۔ ان ہی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ہیں۔

کتاب التوحید کی شرح ان کے پوتے شیخ عبدالرحمان بن حسن نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کے درمیان ایسے تعویذوں کے بارے میں اختلاف رہا ہے جن میں قرآن کی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات لکھے گئے ہوں۔ ایک گروہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ یہی عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا قول ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بھی بظاہر روایت یہی مروی ہے، ابوجعفر باقرؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اسی کی تائید میں ہے۔ ان لوگوں نے اس حدیث کو جس میں تعویذ کو شرک کہا گیا ہے ایسے تعویذ پر محمول کیا ہے جس میں کلماتِ شرک ہوں۔

ایک دوسرے گروہ نے اسے ناجائز کہا ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے ہے۔ حضرت حذیفہ، عقبہ بن عامر اور ابن عکیم کی رائے بھی بظاہر یہی ہے۔ یہی رائے تابعین کی ایک جماعت کی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ بھی داخل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کی بھی رائے ہے۔ اسی کو ان کے بیشتر اصحاب نے اختیار کیا ہے۔ متاخرین نے قطعیت کے ساتھ اسی کو امام احمد کی رائے قرار دی ہے۔ یہ حضرات عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت اور ان کی ہم معنی روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ آخر میں کتاب کے شارح نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے[1]

---

[1] فتح المجید شرح کتاب التوحید تحقیق محمد حامد الفقی ص ۱۲۷ - ۱۲۸۔

جب قرآن کی آیات اور احادیث سے ثابت شدہ دعائیں مریض دم کرا سکتا ہے تو بلاشبہ ان کا تعویذ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اسے ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

حضرت سعید بن مسیب کے نزدیک قرآن سے لکھے ہوئے تعویذ کو بانس وغیرہ کی نلکی میں رکھ کر گلے میں ڈالنا جائز ہے۔ البتہ بیوی سے ہم بستری کرتے یا بیت الخلار جاتے وقت اسے اتار دینا چاہیئے۔ امام باقر فرماتے ہیں کہ بچوں کو جو تعویذ ڈالے جاتے ہیں وہ جائز ہیں۔ ابن شیرین فرماتے ہیں کہ جس تعویذ میں قرآن کی آیات ہوں اسے بچہ ہو یا بڑا سب ہی ڈال سکتے ہیں۔ علامہ آلوسی ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اسی پر تمام ممالک میں قدیم سے اب تک عمل رہا ہے[1]

فقہ حنفی میں بھی اس طرح کے تعویذ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اس کے استعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی چیز میں لپٹا ہو تو اسے ناپاک شخص اور حیض والی عورت بھی اپنے بازو پر باندھ سکتی ہے۔[2]

فقہ مالکی میں ہے کہ جس تعویذ میں اللہ تعالیٰ کے اسمار یا قرآن کی آیات لکھی ہوں اس کو مریض، تندرست، حائضہ، نفاس والی اور ناپاک آدمی سب ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ جانوروں کو بھی اس طرح کا تعویذ باندھا جا سکتا ہے۔[3]

قرآن دھو کر پلانا قرآن کی آیات کسی کاغذ یا برتن پر لکھ کر اسے دھو کر پلانا بھی سلف سے ثابت ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں تم میں سے جو شخص شفا چاہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کوئی آیت کسی کاغذ پر لکھ کر اسے بارش

---

[1] روح المعانی جزر ۱۵/۱۴۶ [2] ردالمختار علی الدارالمختار ۱/۱۱۹ [3] الشرح الصغیر ۴/۷۶۹

کے پانی سے دھوئے اور بیوی سے ایک درہم اس کی خوشی سے لے کر شہد خریدے (اور اس کے ساتھ ملا کر) پی لے۔ اس سے (انشاء اللہ) اسے شفا حاصل ہو گی۔[1]

بیہقی نے کتاب الدعوات میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جس عورت کی زچگی میں زحمت ہو اسے ایک کاغذ میں یہ لکھ کر پلایا جائے:-

بسم اللّٰہِ الذی لا الٰہ الا ھو الحلیم	اس اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی
الکریم سبحان اللّٰہ وتعالٰی رب العرش	معبود نہیں ہے، جو بردبار اور کریم ہے
العظیم الحمد للّٰہ رب العالمین	ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں جو عرش عظیم
کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃً	کا رب ہے۔ ساری حمد و ثنا اللہ رب العالمین
او ضحٰھا کانھم یوم یرون ما یوعدون	کے لئے ہے، جس روز وہ اسے (قیامت)
لم یلبثوا الا ساعۃ من نھار بلاغ	دیکھیں گے محسوس کریں گے گویا وہ بس
فھل یھلک الا القوم الفاسقون[2]	ایک شام یا ایک صبح رہے۔ جس روز وہ اس

چیز کو دیکھ لیں گے جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے تو یوں محسوس کریں گے گویا دن بھر میں بس ایک گھڑی رہے۔ ہلاک تو نافرمان ہی کئے جاتے ہیں۔

امام احمدؒ کے صاحب زادے عبد اللہ کہتے ہیں کہ جس عورت کو ولادت میں دشواری ہوتی امام احمد اسے اوپر والی یہ دعا لکھ کر دیتے تھے۔ حافظ ابوبکر احمد بن علی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امام احمدؒ سے کہا کہ ایک عورت دو دن سے دردِ زہ میں مبتلا ہے، زچگی نہیں ہو رہی ہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ وہ ایک بڑا برتن اور زعفران لائے تاکہ اس میں دعا لکھ کر دیں۔ (اور وہ اسے پلائی جائے) مروزی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ امام احمدؒ نے متعدد آدمیوں کو اس طرح لکھ کر دیا۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱/۴۷۵ [2] الاتقان ۲/۱۶۵ [3] المواہب اللدنیہ مع الشرح ۷/۱۰۴۔

امام نووی فرماتے ہیں حسن بصریؒ، مجاہدؒ، ابوقلابہؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک قرآن کی آیات کسی برتن پر لکھ کر مریض اسے دھو کر پی سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے امام نخعیؒ نے اسے ناپسند کیا ہے۔ ہمارے مذہب (شافعی) کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قاضی حسین اور امام بغوی فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کسی میٹھی چیز یا کھانے پر لکھ کر کھایا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے [1]

علامہ ابن الحاج مالکی فرماتے ہیں کہ کسی کاغذ یا پاک برتن پر قرآن کی کچھ سورتیں یا کسی سورت کا کچھ حصہ یا ایک سورت کی متفرق آیتیں یا مختلف سورتوں کی مختلف آیتیں لکھ کر ان کے ذریعہ علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہت سے شیوخ قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کو لکھ کر مریضوں کو پلاتے تھے اس سے انہیں شفا ہوتی تھی اس سلسلہ میں بزرگوں کے واقعات اور تجربات بھی انھوں نے بیان کئے ہیں۔ [2]

فقہ حنفی میں ہے کہ قرآن شریف مریض پر پڑھ کر دم کرنا، سورۂ فاتحہ پڑھ کر سانپ اور بچھو کا زہر اتارنا، کسی کاغذ پر لکھ کر اس کا تعویذ ڈالنا، یا کسی برتن پر لکھ کر اسے دھو کر پلانا اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن اب اسے جائز سمجھا جاتا ہے، اسی پر عمل ہے اور احادیث و آثار سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ [3]

علامہ قسطلانی کہتے ہیں :-

"وقد رخص جماعة من السلف فی کتابة بعض القرآن وشربه وجعل ذالك من الشفاء الذی جعل الله فيه" [4]

سلف میں سے ایک جماعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ لکھ کر پلایا جائے، اسے اس نے اس شفا کا ایک حصہ سمجھا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھ دی ہے۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ۲/۱۴۲ [2] المدخل ۴/۱۲۱-۱۲۲ [3] رد المحتار علی الدر المختار ۵/۲۱۹ [4] المواہب اللدنیہ ۲/۱۰۶

لیکن اب، جیسا کہ اوپر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، چاروں فقہوں میں اس کا جواز ملتا ہے۔

نماز سے استعانت قرآن میں نماز اور صبر کے ذریعہ مشکلات میں استعانت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے ہو

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَوٰةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ (البقرہ: ۴۵، ۴۶)

مدد طلب کرو صبر سے اور نماز سے۔ بے شک نماز بھاری ہے مگر ان لوگوں پہ جو اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

آدمی اگر اپنی مشکلات میں نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرے تو حدیث میں آتا ہے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی کو کوئی حاجت درپیش ہو، اس کا تعلق چاہے اللہ تعالیٰ سے ہو یا اس کے کسی بندہ سے تو وہ اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین اسألک موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والغنیمة من کل بر والسلامة من کل اثم لا تدع لی ذنبا الا غفرته ولا ھما الا فرجته ولا حاجة ھی لک رضا الا

نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ جو بردبار اور بخشنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پاکی ہے جو عرش عظیم کا پروردگار ہے، ساری حمد و ثنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے اے اللہ میں تجھ سے ایسے اعمال کی توفیق طلب کرتا ہوں جس سے تیری رحمت نازل ہو

قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْن [1] اور ایسے اعمال کی توفیق چاہتا ہوں جن کی وجہ سے تیری بخشش مجھے حاصل ہو۔ میں تجھ سے ہر نیکی کا فائدہ اور ہر برائی سے حفاظت کا طالب ہوں۔ میرے ہر گناہ کو تو بخش دے، میری ہر پریشانی کو دور کر دے اور ہر ضرورت کو جس میں تیری رضا ہو، اے ارحم الراحمین تو اسے پوری کر دے۔

ایک روایت میں اتنا اضافہ اور ہے:۔

ثم لیسأل اللّٰہ من امر الدنیا والاخرۃ ما شاء فانہ یقدر پھر وہ دنیا و آخرت کے امور میں سے جو چاہے اللہ سے مانگے۔ وہ اس کیلئے مقدر کی جائے گی۔

اس حدیث میں ایک عمومی بات کہی گئی ہے کہ آدمی نماز پڑھ کر کسی بھی حاجت کے سلسلہ میں دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ اس طرح کی دعا جہاں اور حاجتوں میں ہو سکتی ہے اسی طرح صحت کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔

نماز تہجد بھی اس سلسلہ میں مفید ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رات جیسے جیسے گزرتی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف خاص توجہ فرماتا ہے، اس وقت ان کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔ مرادیں پوری کی جاتی ہیں، توبہ قبول ہوتی ہے اور مغفرت کی جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[1] ترمذی، ابواب الوتر، باب ماجاء فی صلوٰۃ الحاجہ۔ اس کے ایک راوی فائد بن عبدالرحمان کے بارے میں امام ترمذی فرماتے ہیں کہ حدیث میں وہ ضعیف سمجھا جاتا ہے لیکن اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت ابو درداءؓ سے مسند احمد میں ہے وہ صحیح ہے مگر اس میں الدعاء کا نہیں صرف نماز کا ذکر ہے۔ مرعاۃ المفاتیح ۲/۲۵۱ ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی صلوٰۃ الحاجہ۔

ینزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یبقیٰ ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجیب لہ من یسئالنی فاعطیہ من یستغفرنی فاغفر لہٗ [1]

ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات جب کہ اس کا آخری تہائی حصّہ باقی رہتا ہے آسمان دنیا پر اترتا ہے اور کہتا ہے! کون مجھے پکارتا ہے کہ میں اس کی پکار سنوں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اسے عطا کروں، کون مجھ سے مغفرت چاہتا ہے کہ میں اس کی مغفرت کروں؟

اس حدیث میں رات کے آخری تہائی حصہ کا ذکر ہے لیکن مسلم کی ایک روایت میں ہے "حین مضیٰ ثلث اللیل الاول" (جب رات کا پہلا تہائی حصّہ گزر جاتا ہے) ایک اور روایت میں "اذا مضیٰ شطر اللیل او ثلثاہ" کے الفاظ ہیں (یعنی جب آدھی یا دو تہائی رات گزر جاتی ہے) یہ کیفیت حتیٰ یضیٔ الفجر صبح کے طلوع ہونے تک باقی رہتی ہے۔ ایک اور روایت میں پوری رات ہی کا ذکر ہے [2]

ان سب روایتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رات میں اور وہ بھی ایک تہائی رات کے بعد اللہ کی رحمتوں کا خصوصی نزول شروع ہو جاتا ہے اور صبح تک جاری رہتا ہے۔ اس وقت انسان دنیا اور آخرت کی بھلائی کی جو دعا بھی کرتا ہے وہ سنی جاتی ہے، ایک روایت میں بیماری سے شفا کا بھی خصوصیت سے ذکر ہے، چنانچہ اوپر والی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔

اذا مضیٰ ثلث اللیل الاول ھبط اللّٰہ تعالیٰ الی السماء الدنیا فلم

جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر اترتا ہے۔

---

[1] بخاری، ابواب التہجد، باب الدعاء والصلوٰۃ فی آخر اللیل۔ [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ اللیل۔

یزل مکانہ حتیٰ یطلع الفجر فیقول قائل الا سائل یعطی الا داع یجاب الا سقیم یستشفی فیشفیٰ الا مذنب یستغفر فیغفر لہ [1]

اور طلوع فجر تک وہیں رہتا ہے ایک اعلان کرنے والا اس کی طرف سے، اعلان کرتا ہے کیا کوئی سائل نہیں ہے کہ اسے دیا جائے، کیا کوئی دعا کرنے والا نہیں ہے کہ اس کی دعا سنی جائے، کیا کوئی بیمار نہیں ہے جو شفا چاہے اور اسے شفا دی جائے، کیا کوئی گناہ گار نہیں ہے جو مغفرت چاہے اور اسے معاف کر دیا جائے۔

نماز تہجد کے علاوہ مطلقاً نفل نماز بھی اس سلسلہ میں مفید ہے حدیث سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مجاہد، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لیٹے ہوئے دیکھا۔ میرے پیٹ میں تکلیف تھی۔ آپ نے فرمایا، یا ابا ہریرہ اشکمت درد؟ اے ابوہریرہ! کیا پیٹ میں درد ہے؟ (گویا یہ فارسی جملہ آپ نے استعمال فرمایا) میں نے عرض کیا۔ ہاں آپ نے فرمایا۔

قم فصل فان فی الصلوٰۃ شفاءً [2] اٹھو، نماز پڑھو، نماز میں شفا ہے۔

---

[1] مسند احمد تحقیق احمد محمد شاکر ۱۳/ ۲۵۰۔ ۲۵۱ حضرت ابوہریرہؓ کی یہی روایت روایات علیؓ میں بھی موجود ہے ۲/۲۰۳۔ [2] ابن ماجہ، ابواب الطب، باب الصلوٰۃ شفاء اس کے ایک راوی ذاؤد بن علیہ کو ابن معین وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن ابن نمیر نے اسے صدوق کہا ہے اور امام ابوداؤد نے اسکے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی حدیث لکھی جاتی ہے (تہذیب الکمال) امام ابن قیم فرماتے ہیں۔ یہ حدیث موقوف بھی روایت کی گئی ہے یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت مجاہد سے یہ بات کہی تھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے الطب النبوی ۱۶۳۔ ۱۶۴ یہ روایت مسند احمد ۲/ ۳۹۰ میں بھی ہے لیکن اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے پر حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ پیٹ میں درد نہیں ہے نماز کا حکم اس میں بھی ہے۔

صدقہ وخیرات بیماری میں صدقہ وخیرات بھی مفید ہے۔ اس سے کم زور بے کسوں کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں یہ خود بھی ایک علاج ہے انسانوں کی حق تلفی، ان کے ساتھ ظلم وزیادتی اور بدسلوکی سے جس طرح اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے اسی طرح ان کے ساتھ حسن سلوک، غم خواری اور مواسات سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے

داووا مرضاکم بالصدقۃ [۱] اپنے مریضوں کا صدقہ کے ذریعہ علاج کرو

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ صدقہ وخیرات سے خدا کا غضب ٹھنڈا ہوتا ہے اور اس کے فیصلہ کے تحت موت آہی جائے تو بری حالت میں مرنے سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان الصدقۃ لتطفئ غضب الرب وتدفع میتۃ السوء [۲] بے شک صدقہ اللہ کے غضب کو بجھاتا ہے اور بری حالت میں موت آنے نہیں دیتا۔

مسنون دعائیں اس سلسلہ کی آخری لیکن بہت ہی اہم چیز وہ دعائیں ہیں جو کسی بھی تکلیف یا بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ ان میں بڑی تاثیر ہے۔ اگر پورے خلوص اور یقین کے ساتھ یہ دعائیں پڑھی جائیں تو انشاء اللہ ضرور ان سے فائدہ پہونچے گا۔

یہ دعائیں تین طرح کی ہیں، ایک تو وہ دعائیں ہیں جن میں کسی بھی مصیبت میں اللہ کی حمد وثنا، اس کی تسبیح وتہلیل اور اپنی کمزوری اور بے بسی کا اعتراف ہے۔ یہ طلب والتجا کا بہترین اسلوب ہے۔ یہ خدائے رحیم وکریم کے دربار میں کچھ کہے بغیر سب

---

[۱] رواہ ابن حبان والطبرانی وغیرہ عن ابی امامۃ باسناد حسن التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۲/۲ ۵

[۲] ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ما جاء فی فضل الصدقۃ۔

کچھ کہہ دیتا ہے۔ اس میں صراحت نہ ہونے کے باوجود سب سے بڑی صراحت ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول عند الکرب لا الٰہ الا اللہ العظیم الحلیم لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم لا الٰہ الا اللہ رب السموات ورب الارض ورب العرش الکریم [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف کے وقت فرمایا کرتے تھے لا الٰہ ..... الخ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ جو عظمت والا اور بردبار ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ جو عرش عظیم کا مالک ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ جو آسمانوں کا رب ہے، زمین کا رب ہے اور عرش کریم کا رب ہے۔

حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مصیبت میں گھر گیا ہو اُسے یہ دعا کرنی چاہیئے۔

اللّٰھُمَّ رَحْمَتَکَ اَرْجُوْ فَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ [2]

اے اللہ تیری رحمت ہی کی امید رکھتا ہوں تو ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے میرے نفس کے حوالہ نہ فرما۔ اور میرے سارے حالات ٹھیک کردے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

حضرت اسماء بنت عمیسؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ کلمات کی تعلیم دی کہ تکلیف اور پریشانی کے وقت میں انہیں پڑھتی ہوں۔ وہ کلمات یہ ہیں۔

اللہ۔ اللہ ربی ولا اشرک بہ شیئاً [3]

اللہ اللہ میرا رب ہے میں اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

---

[1] بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الکرب۔ مسلم، کتاب الذکر، باب دعاء المکروب۔ [2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التسبیح عند النوم۔ مسند احمد ۴۲/۵ [3] ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب الدعاء عند الکرب۔

یہ دعائیں بہترین تمہید بھی ہیں۔ ان کے بعد آدمی اصل مقصد کے لئے الگ سے بھی دعا کر سکتا ہے۔

بعض دعائیں وہ ہیں جن میں اپنی غفلت اور کوتاہی کے اعتراف گناہوں سے توبہ و استغفار، غلطیوں پر ندامت تضرع اور آہ و زاری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لئے کہ تکلیف اور آزمائش ہماری بے عملی اور بدعملی کا بھی نتیجہ ہوسکتی ہے۔ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اس فروگزاشت کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑنے میں جلدی کی تھی تو وہ معجزانہ طور پر اس سے باہر نکل آئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

دعوۃ ذی النون اذ دعا بہا وھو فی بطن حوت لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین لم یدع بہا رجل مسلم فی شیٔ قط الا استجاب اللّٰہ لہ [1]	حضرت یونسؑ کی دعا جو انھوں نے اس وقت کی تھی جب کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے یہ تھی لا الٰہ الا انت الخ۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر تو۔ تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ بے شک میں ہی ظلم کرنے

والوں میں سے تھا۔ جب بھی کوئی مسلمان اپنی کسی بھی تکلیف میں یہ دعا کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبول فرمائے گا۔

بیمار کے لئے بھی یہ دعا مفید ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

ایما مسلم دعا بہا فی مرضہ اربعین مرۃ فمات فی مرضہ ذالک اعطی	جو مسلمان بھی اپنے مرض میں چالیس بار یہ دعا پڑھے اور اپنے اس مرض میں مر جائے

---

[1] ترمذی، ابواب الدعوات۔ مستدرک حاکم ۱/۵۰۵ مسند احمد میں تفصیل سے یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد کب فرمایا تھا ۱/۱۷۰۔

اجر شهيد وان برأ برأ وقد غفرله جميع ذنوبه [1]

تو اسے ایک شہید کا اجر ملے گا اگر صحتیاب ہوجائے تو اس طرح صحت یاب ہوگا کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو چکے ہوں گے۔

توبہ و استغفار کے ساتھ شفا بھی طلب کی جا سکتی ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص خود یا اس کا کوئی بھائی بیمار ہو تو یہ دعا پڑھے، اسے صحت ہوگی۔ انشاء اللہ۔ وہ دعا یہ ہے:

ربنا الذي في السماء تقدس اسمك امرك في السماء والارض كما رحمتك في السماء فاجعل رحمتك في الارض اغفر لنا حوبنا وخطايانا انت رب الطيبين نزل رحمة من رحمتك وشفاء من شفائك على هذا الوجع [2]

اے ہمارے رب جو آسمان میں ہے۔ تیرا نام پاک ہے تیرا حکم آسمان پر بھی چلتا ہے اور زمین پر بھی جس طرح تیرا رحم و کرم آسمان پر ہے اسی طرح اپنا رحم و کرم زمین پر بھی نازل فرما۔ ہمارے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرما تو نیک لوگوں کا رب ہے۔ اپنی رحمت اور شفا کا ایک حصہ اس بیماری پر بھی نازل فرما۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی بہت سی دعاؤں میں صراحت کے ساتھ بیماری سے شفا بھی طلب کی گئی ہے۔ پریشانی میں اللہ تعالیٰ کو پکارنا اس سے التجا کرنا اور اپنا دکھ درد اس سے بیان کرنا عبودیت کی علامت ہے۔ ذیل میں اس طرح کی دو چار دعائیں نقل کی جاتی ہیں۔

---

[1] مستدرک حاکم ۱/ ۵۰۶ [2] ابوداؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقی۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی مریض لایا جاتا یا آپؐ کسی کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو یہ دعا فرماتے:

اذھب الباس رب الناس	اے اللہ! انسانوں کے پروردگار!
اشفہ انت الشافی لا شفاء الا شفاءک	تکلیف کو دور فرما، اسے شفا دے تو
شفاءً لا یغادر سقماً ۱؎	ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری ہی شفا

شفا ہے (اس کے علاوہ کوئی شفا نہیں ہے) ایسی شفا دے جو کسی مرض کو باقی نہ رکھے۔

عثمان بن العاص ثقفی بیان کرتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد سے ان کے جسم میں ایک تکلیف تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا! جہاں تکلیف ہے وہاں اپنا ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

اعوذ باللہ وقدرتہ من شر ما	میں پناہ طلب کرتا ہوں اللہ کی ذات
اجد واحاذر ۲؎	اور اس کی قدرت سے اس تکلیف

سے جو مجھے اس وقت ہے اور جس سے میں ڈرتا ہوں۔

فرماتے ہیں میں نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے میری یہ تکلیف دور فرمادی چنانچہ میں اپنے گھر والوں کو اور دوسرے لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہوں ۳؎

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ بخاری، کتاب المرضیٰ، باب دعاء العائد للمریض۔ مسلم، کتاب السلام، باب استحباب رقیة المریض ۲؎ مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع یدہ علی موضع الالم مع الدعاء ۳؎ ترمذی، کتاب الطب۔

فرمایا اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کی عیادت کرے اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھے
اس کی موت ہی کا وقت نہیں آگیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس مرض سے اسے عافیت
دے گا۔ دعا یہ ہے:

أَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ أَنْ يَّشْفِيَكَ [1]	اللہ بزرگ و برتر اور عرش عظیم کے پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں شفا دے۔

بیماری اور مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے بھی دعائیں بتائی گئی ہیں حضرت
عثمان رضی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص صبح تین
مرتبہ یہ دعا پڑھے تو شام تک اور شام تین مرتبہ پڑھے تو صبح تک کوئی چیز اسے
نقصان نہیں پہونچائے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ اس پر اچانک کوئی مصیبت
نہیں آئے گی۔ وہ دعا یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ [2]	اللہ کے نام سے کہ جس کے نام کے ساتھ زمین اور آسمان کی کوئی بھی چیز نقصان نہیں پہونچاتی۔ وہ سننے اور جاننے والا ہے

حضرت عثمان رضی کے صاحبزادے اَبان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہی یہ روایت
بیان کر رہے تھے ایک شخص نے تعجب سے انہیں دیکھا تو انھوں نے فرمایا تعجب
کیوں کر رہے ہو۔ نہ تو میں نے عثمان رضی کی طرف اور نہ عثمان رضی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس دن مجھ پر اس کا حملہ ہوا
تو یہ دعا پڑھنی میں بھول گیا اور اللہ نے تقدیر میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا [2]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الدعاء للمریض عند العیادہ۔ ترمذی، ابواب الطب ہستہ

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التسبیح عند النوم ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی الدعاء اذا اصبح و امسیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب عافیت کی دوسروں کو بھی تلقین کرتے اور خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے۔ آپ صبح وشام جو دعائیں کرتے تھے ان میں سے ایک دعا ان الفاظ میں مروی ہے:۔

اللھم عافنی فی بدنی اللھم عافنی فی سمعی اللھم عافنی فی بصری لا الٰہ الا انت [1]

اے اللہ مجھے بدن کی تکلیفوں سے عافیت میں رکھ، اے اللہ، مجھے کان کی تکلیفوں سے عافیت میں رکھ، اے اللہ مجھے آنکھ کی تکلیفوں سے عافیت میں رکھ۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح وشام کبھی یہ دعا ترک نہیں فرماتے تھے:۔

اللھم انی اَسْئَلُکَ الْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِیْ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِکَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ [2]

اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے عفو ودرگزر اور عافیت کا طالب ہوں اپنے دین اور دنیا میں اور اپنے اہل وعیال اور مال میں۔ اے اللہ! میرے عیوب پر پردہ ڈال دے مجھے جو خوف لاحق ہیں۔ ان سے محفوظ رکھ، اے اللہ میری حفاظت فرما، میرے آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے اوپر سے، اور میں اس بات سے تیری عظمت کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ مجھے میرے قدموں کے نیچے سے اچک لیا جائے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح [2] ابوداؤد، کتاب الادب۔

یہ اس سلسلہ کی چند دعائیں ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی دعائیں آتی ہیں۔ ان دعاؤں کا پڑھنا سنت ہے ان کی افادیت کا ہر دور میں بے شمار انسانوں نے تجربہ کیا ہے۔ اگر خلوص کے ساتھ انہیں پڑھا جائے تو آج بھی ان کی افادیت آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر کسی کام کے اسباب فراہم نہ ہوں یا وہ بے سود ثابت ہونے لگیں یا مخالف اسباب جمع ہو جائیں تو مادی ذہن رکھنے والے انسانوں پر مایوسی اور ناامیدی طاری ہونے لگتی ہے اور وہ خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن جب انسان خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کا دل اس سکون سے بھر جاتا ہے کہ اس نے اپنا معاملہ مسبب الاسباب کے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ چاہے تو غیب سے اسباب فراہم کر سکتا ہے۔ اسے ایک ایسا سہارا ہاتھ آگیا ہے کہ دنیا کے سارے سہارے ٹوٹ بھی جائیں تو وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ دعا خدا پر اپنے بھرپور توکل اور اعتماد کا اظہار ہے۔ جو خدا پر پورا بھروسہ کرے، یہ اس کا قانون ہے کہ وہ اسے کبھی ناکام و نامراد نہیں چھوڑتا۔ بظاہر اس کا مقصد پورا نہ بھی ہو تو اسے دل کے سکون سے نوازتا ہے اور دل کا سکون وہ نعمت ہے جس کا اس دنیا میں کوئی بدل نہیں ہے۔

فارسی نثر کے موضوعات

ترجمہ ڈاکٹر شریف حسن قاسمی - دہلی یونیورسٹی

(۳)

اس نوعیت کی کتابوں کے بعد اب ہم "ترجمہ ہای احوال شاعران" پر تبصرہ کریں گے۔ ایسی کتابوں کو فارسی زبان میں عام طور پر "تذکرہ" کا نام دیا جاتا ہے اور گویا یہ نام "تذکرۃ الشعرا، دولت شاہ سمرقندی" کے نام سے ماخوذ ہے۔ فارسی میں تذکرہ نگاری کا رواج سلجوقیوں کے عہد سے شروع ہوا۔ اوائل میں ایسی کتابوں کی تالیف کا معمول نہ تھا جن کا مقصد تذکرہ نویسی ہو۔ بیشتر شاعروں کے حالات کے بارے میں حکایات جمع کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں قدیم ترین اطلاع مناقب الشعرا نامی ایک کتاب کے متعلق ہے جس کا ذکر دولت شاہ سمرقندی نے "تذکرۃ الشعرا" اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے۔ مناقب الشعرا کے مولف، موفق الدولہ ابوطاہر الخاتونی، عہد سلجوقی کے ایک معروف شخص تھے اور پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے اوائل (گیارھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں حیات تھے۔ چونکہ اس کتاب کے بارے میں اس سے زیادہ اطلاع دستیاب نہیں اس لئے اس کی نوعیت پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

دوسری کتاب جسے حق تو یہ ہے کہ تذکروں کی ردیف میں شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن آج کل اس کتاب سے بیشتر اسی مقصد کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے، "مجمع النوادر" معروف بہ "چہار مقالہ" ہے اسے ابوالحسن نظام الدین احمد بن عمر بن علی سمرقندی معروف بہ نظامی عروضی نے تالیف کیا ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کے شاعر اور لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مؤلف نے اپنی کتاب شنسبانی غور خاندان کے ایک شاہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام پر تالیف کی ہے۔ چہار مقالہ، دبیری، شاعری، طب اور نجوم، چار فنون کے تعارف کی غرض اور دبیروں، شاعروں، طبیبوں اور منجموں کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے جو سلاطین کی خدمت میں فرائض انجام دیتے تھے، لکھی گئی ہے۔ ہر مقالے کے آغاز میں اس فن کی مختصر تعریف بھی کی گئی ہے جس کے بارے میں اس مقالے میں بحث ہوئی ہے۔ مصنف کے قول کی تصدیق کے لئے حکایات بھی بیان کی گئی ہیں جو تاریخی فوائد کی حامل ہیں اس وضاحت کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ چہار مقالہ اصلاً تذکرہ نویسی کے مقصد سے نہیں لکھا گیا۔ لیکن اس کتاب سے اگر شاعروں، مصنفوں اور عالموں کے حالات زندگی سے متعلق استفادہ کیا جاتا ہے تو اس کا سبب وہ حکایتیں ہیں جو شواہد کے طور پر ہر مقالے میں مؤلف کے نظریات کی تصدیق میں بیان ہوئی ہیں۔ بہرحال چہار مقالہ فی الحال وہ قدیم ترین ماخذ ہے جو سامانی، غزنوی اور اوائل سلجوقی دور کے چند عظیم شعراء کے احوال زندگی کے بارے میں ہمیں دستیاب ہے۔

لیکن وہ کتاب جسے درحقیقت فارسی کو شعراء کے احوال کا واقعی تذکرہ شمار کرنا چاہیئے، سید بہاء الدین (یا نورالدین) محمد بن محمد عوفی بخاری کا لباب الالباب ہے عوفی چھٹی صدی ہجری اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل (بارھویں صدی کا اواخر اور

تیرھویں صدی کا اوائل) کا ایک نہایت معروف دانشور اور مصنف ہے۔ یہ سلطان محمد خوارزمشاہ کے اواخر عہد یعنی چنگیز کے حملے کے ابتدائی زمانے میں ماوراءالنہر اور خراساں میں حیات تھا اور اہم لوگوں سے ملاقات کے دوران قابل قدر اطلاعات کی فراہمی میں جو اس نے اپنی کتاب میں سپرد قلم کی ہیں مشغول تھا۔ مغلوں کے حملے کے وقت، یہ ماوراءالنہر اور خراسان سے فرار ہو کر، سندھ چلا گیا اور ناصرالدین شاہ قباچہ (متوفی: ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۷ء) کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے لباب الالباب اس بادشاہ کے وزیر عین الملک فخرالدین حسین بن شرف الملک کے نام پر تالیف کی لباب الالباب ساتویں صدی ہجری تک کے ایرانی شعراء کا دو جلدوں میں تذکرہ ہے پہلی جلد میں مولف کے عصر تک کے ان شعراء کے حالات زندگی کا بیان ہے جو بادشاہوں، وزراء، امراء اور علماء کے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جلد میں ان ایرانی شعراء کے طبقوں کا ذکر ہے جو طاہریوں کے عہد سے ناصرالدین قباچہ کے عہد سلطنت یعنی کتاب کے زمانۂ تالیف تک ایرانی درباروں سے وابستہ ہے۔ عوفی اس کتاب میں اپنے کلام کو جوامع الحکایات کے مقابلے میں بہت زیادہ آراستہ کرنے پر نظر رکھتا ہے۔ جن شعراء کا ذکر اس نے کیا ہے، ان کے القاب وصفات اور حتیٰ کہ ان کی جائے پیدائش کی مناسبت سے مسجع اور مزین و مرصع جملے استعمال کرتا ہے۔ لباب الالباب کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ فارسی گو شعراء کے حالات زندگی پر قدیم ترین دستیاب تذکرہ ہے بلکہ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ مؤلف مختلف شہروں اور علاقوں کا سفر کرنے کی وجہ سے اپنے ہمعصر ایسے متعدد شعراء سے آشنا تھا جن کے دیوان ابھی مکمل طور پر منظر عام پر بھی نہیں آئے تھے کہ مغول حملے کی زد میں آ کر مفقود ہو گئے اور ان کے کلام کے نمونے عوفی نے اس کتاب میں

محفوظ کر دئے ہیں۔ اس کے علاوہ عوفی کی ایسے منابع اور اطلاعات تک دسترس کے نتیجے میں جو مغلوں کے ہاتھوں وحشت ناک غارتگری اور بربادی سے نابود ہوگئیں، اس نے سامانی اور غزنوی دور کے چند شعراء کے بارے میں ہمیں ایسی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں کہ اگر اس کی کتاب نہ ہوتی تو ان کے بارے میں کوئی اطلاع ہم تک نہ پہنچتی عوفی نے لباب الالباب کے آغاز میں منشیانہ مقدمے کے علاوہ چند ابواب میں نظم و نثر کے درمیان مقایسہ، شعر و شاعری کی فضیلت اور شعر کے لغوی معنی، سب سے پہلے شعر کس نے کہا، اور سب سے پہلا فارسی شاعر کون ہے، وغیرہ ایسے موضوعات سے بحث کی ہے۔ ملوک وسلاطین و وزراء و علماء کے اشعار کے لطیف نکات اور ان کے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ طاہری عہد اور اس کے بعد کے مختلف ادوار کے شعراء کے حالات اور اشعار کے نمونے دئے ہیں۔

لباب الالباب سے تقی الدین اوحدی اصفہانی نے اپنے عرفات العاشقین جو ۱۰۲۲ ہجری (۱۶۱۳ء) میں تالیف ہوئی، سید علی بن محمود حسینی نے تذکرۂ بزم آرا جو ۱۰۰۰ ہجری (۱۵۹۱ء) میں لکھا گیا، امین احمد رازی نے تذکرۂ ہفت اقلیم جو ۱۰۰۲ ہجری (۱۵۹۳ء) میں مرتب ہوا، اور حسن بن لطف اللہ رازی نے تذکرۂ میخانہ میں جو تقریباً ۱۰۴۰ ہجری (۱۶۳۰ء) میں لکھا گیا، استفادہ کیا ہے۔ یہی بات میر غلام علی آزاد (متوفی: ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء) کے خزانۂ عامرہ اور علی قلی خاں والہ داغستانی (متوفی: ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء) کے تذکرۂ ریاض الشعراء کے بارے میں جو ۱۱۶۱ ہجری (۱۷۴۸ء) میں مکمل ہوا، کہی جا سکتی ہے[1]

---

[1] لباب الالباب، مطبوعہ سعید نفیسی، تہران، ۱۳۳۵ شمسی، آغاز سخن، ص ۱۔

ایک اہم تذکرہ جو مرتبہ کے لحاظ سے لباب الالباب کے بعد آتا ہے، تذکرۃ الشعراء مؤلفہ دولتشاہ بن علاؤ الدولہ سمرقندی (متوفی: ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء یا ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) ہے۔ دولت شاہ سمرقندی، سلطان حسین بایقرا کے ندمار اور مقربین میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے، بایقرا کے دانشمند وزیر امیر علی شیر نوائی کی تشویق پر اپنا یہ تذکرہ لکھا ہے۔ اس تذکرہ میں ایک سو پچاس شعراء کے حالات زندگی مندرج ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں بے شمار تاریخی اشارات بھی ملتے ہیں لیکن اس تذکرے میں مختلف امور میں اشتباہ اور عدم تقین اس درجہ ہے کہ بیشتر مواقعوں پر مؤلف کے بیانات پر از سر نو تحقیق کئے بغیر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔[1]

اسی زمانے میں ایک مصنف کمال الدین حسین گازرگاہی نے ۹۰۸ ہجری (۱۵۰۲ء) میں ایک کتاب "مجالس العشاق" تالیف کی اور اسے سلطان حسین بایقرا سے منسوب کیا۔ اس کتاب میں چند شعراء اور صوفی مشائخ کا ذکر شامل ہے۔

بہارستان جامی (متوفی: ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی تالیف سے جامی کا مقصد تذکرہ لکھنا نہیں، بلکہ جامی چاہتے تھے کہ اپنے لڑکے کے لئے جو مکتب جاتا تھا، ایک درسی کتاب تیار کریں۔ اسی ارادے سے انھوں نے کتاب کے دوسرے مطالب پر، معروف شعراء کے بارے میں اطلاعات کا اضافہ کر دیا۔ تاکہ ایک مبتدی کے کام آ سکے۔

تذکرہ نویسی پر عہد صفوی میں گزشتہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ اس دور کی تذکرے کی کتابوں میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے لڑکے سام مرزا (متوفی: ۹۸۳ھ/۱۵۷۷ء) کا تحفۂ سامی ہے اس میں نویں صدی ہجری کے اواخر سے دسویں صدی ہجری کے اواخر دور کے کچھ شعراء

[1] تاریخ تحول نظم و نثر پارسی، طبع سوم، ص ۱۶۱۔

کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اور تذکرہ "لطائف نامہ" ہے جو امیر علی شیر کی مجالس النفائس کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ فخری بن امیری نے ۹۲۷ ہجری (۱۵۲۰ء) میں مکمل کیا۔ اسی مترجم کی ایک دوسری اہم کتاب بھی ہمیں ملتی ہے جس کا نام تذکرۃ النساء یا "جواہر العجائب" ہے۔ نثاری بخارائی کی "مذکر الاحباب" جس میں امیر علی شیر نوائی کے عہد کے تقریباً ۹۷۴ ہجری (۱۵۶۶ء) تک زمانے کے شعراء کے حالات شامل ہیں۔ "نفائس المآثر" میں ان ایرانی شعراء کا ذکر ملتا ہے جو اکبر شاہ کے عہد میں ہندوستان میں تھے۔ اور تقی الدین کاشانی کی خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار" جو ۹۸۵ ہجری (۱۵۷۷ء) میں تالیف ہوئی، اسی قسم کی دوسری کتابیں ہیں۔

عرفات العاشقین، بزم آرا، ہفت اقلیم، میخانہ، خزانۂ عامرہ اور ریاض الشعراء معتبر تذکروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس قسم کے اہم اور بامقصد تذکروں کی ردیف میں معروف تذکرے "صحف ابراہیم" کا نام شامل کیا جانا چاہئیے۔ اس تذکرے کا صرف ایک خطی نسخہ موجود ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ تذکرہ، تیرھویں صدی ہجری کے ایک مصنف ابراہیم خان کی تالیف ہے جس نے اس مفصل تذکرے کو ۱۲۰۵ ہجری (۱۷۹۰ء) میں ترتیب دیا۔ اس میں ایران اور ہندوستان کے ۳۲۷۸ فارسی گو شعراء کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ اس ضخیم کتاب کے علاوہ، ابراہیم خان نے ایک دوسری کتاب "خلاصۃ الکلام" بھی لکھی ہے۔

لطف علی بیگ بن آقا خان بیگدلی شاملو متخلص بہ آذر (متوفی: ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) کا "آتشکدہ" معتبر اور مفصل تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس تذکرے میں بھی ہفت اقلیم کی مانند، شعراء کا نام قصبوں، اور شہروں کے ناموں کے ذیل میں

آیا ہے۔اسی وجہ سے شعرا کے ناموں کو آسانی سے نکالنے کے لئے ایک مخصوص فہرست کی ضرورت ہے۔

تذکروں کے اس بیان کے ذیل میں، چند مندرجہ ذیل معتبر تذکروں کا ذکر لازمی معلوم ہوتا ہے سفینۂ خوشگو تالیف بندرابن داس خوشگو۔ اس میں ہندوستانی فارسی گو شعرا کی بہت بڑی تعداد کے حالات ملتے ہیں یہ تذکرہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۳۱۔ ۱۱۶۱ھ/۱۷۱۸۔۱۷۴۸ء) میں لکھا گیا۔

سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس آرزو ۱۱۶۴ ہجری (۱۷۵۰ء) میں مکمل کیا۔ شیخ احمد علی خاں سندیلوی کا مخزن الغرائب، ایک مفصل تذکرہ ہے اور ۱۲۱۸ ہجری (۱۸۰۳ء) میں مرتب ہوا۔

قیام الدین حیرت کا مقالات الشعرا ۱۱۷۴ ہجری (۱۷۶۰ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا وسفینۂ ہندی تالیف بھگوان داس ہندی میں شاہ عالم بادشاہ کے جلوس یعنی ۱۱۷۳ ہجری (۱۷۵۹ء) سے کتاب کے زمانۂ تالیف یعنی ۱۲۱۹ ہجری (۱۸۰۴ء) تک ہندوستان میں رہنے والے فارسی شعرا کے حالات اس میں قلمبند کئے گئے ہیں۔

بہارستان سخن العبض فارسی ادبی فنون کا مجموعہ ہے اور ایران وہندوستان کے عظیم فارسی گو شعرا کے احوال زندگی پر ایک کارآمد تذکرہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے مؤلف میر عبدالرزاق معروف بہ نواب صمصام الدولہ (متوفی: ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء) ہیں۔

مآثر الکرام موسوم بہ سروآزاد کو میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی: ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء) نے ۱۱۶۶ ہجری (۱۷۵۲ء) میں تالیف کیا۔ اس میں ۱۰۰۰ ہجری (۱۵۹۱ء) کے بعد سے تذکرے کے زمانۂ تالیف تک ایران اور ہندوستان اور بیشتر ہندوستان میں رہنے والے متاخر شعرا کے حالات زندگی شامل ہیں۔

تذکرہ مرآۃ الخیال تالیف امیر شیر علی خان لودی ۱۱۰۲ ہجری (۱۶۹۰ء) میں مکمل ہوا۔ اس میں متقدم اور متاخر شعرار کی ایک بڑی تعداد کے احوال زندگی بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس تذکرے میں دوسرے متفرق مطالب بھی ملتے ہیں۔

زبدۃ المعاصرین تالیف سید ہبرجیلی حسینی شیرازی تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی ہجری) میں مکمل ہوا۔ اس میں ایران و ہند کے متاخر شعرائے کے ایک طبقے کے حالات و اشعار شامل کئے گئے ہیں۔

مولانا محمد قدرت اللہ گوپاموی نے نتائج الافکار کو ۱۲۵۶ ہجری (۱۸۴۰ء) میں تالیف کیا۔ اور اس میں ایران و ہند کے بہت سے متقدم اور متاخر شعرائے کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے شامل کئے ہیں۔

ان چند کتابوں میں جو ایک مخصوص علاقے اور شہر کے شعرائے کے احوال و آثار پر لکھی گئی ہیں "مقالات الشعرا" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں میر علی شیر قانع ٹھٹھوری (متوفی ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء) نے سندھ کے سات سو انیس فارسی گو شعرا کے احوال زندگی سپرد قلم کئے ہیں۔ مؤلف خود ایک عظیم خاندان کا فرد تھا جس نے اصلاً شیراز سے ہندوستان مہاجرت کر لی تھی اور ٹھٹھہ میں اقامت گزیں ہو گیا تھا۔ اس پرارزش تذکرے کے علاوہ، مؤلف کی چند دوسری کتابیں بھی ملتی ہیں۔

"نظیر مقالات الشعرا" وہ تذکرہ ہے جسے اصلح بن محمد اسلم خان کشمیری متخلص بہ مرزا نے عالمگیر بادشاہ کے عہد (۱۰۶۹-۱۱۱۸ھ/۱۶۵۸-۱۷۰۶ء) سے محمد شاہ کے عہد سلطنت (۱۱۳۱-۱۱۶۱ھ/۱۷۱۸-۱۷۴۸ء) تک کشمیر کے شعرائے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس تذکرے میں شاعروں کی کثیر تعداد کا نام مندرج ہے۔

آخری اہم تذکرہ نویس جس کا ذکر ہم یہاں کر رہے ہیں، رضا قلی خاں ہدایت متوفی: ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء) ہے۔ مجمع الفصحا اور ریاض العارفین اس کے دو

معروف تذکرے ہیں۔ مجمع الفصحا، دو جلدوں میں ہے۔ اس میں متقدم اور متاخر شعراء کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مزید برآں، اس میں ان شعراء کا ذکر بھی شامل ہے جو بادشاہوں اور سیاسی لوگوں میں سے تھے۔ اس کی بیشتر اہمیت، ایران میں صفوی دور سے مؤلف کے عہد تک فارسی شعراء کے حالات زندگی پر مبنی ہے [۱]

[۱] ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اپنی کتاب تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، مطبوعہ تہران ۱۹۶۸ء میں ۱۱۰ ایسے محض فارسی تذکروں کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں ترتیب دئے گئے ہیں۔ لیکن اس فہرست کے کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرصورت ایران میں بھی، تذکرے خاصی بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر، کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صفا نے تذکروں کے ضمن میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے۔ (م)

کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ کے دو نادر قلمی نسخے

از :۔ نظام الدین احمد صاحب کاظمی رامپوری

الترغیب فی الصلوٰۃ ابو المظفر محمد شاہ معروف بہ سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں تصنیف ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف محمد بن احمد بن محمد الزاہد الملقب بالزین ہیں کتاب کی تصنیف کے آغاز و انجام کے سنین کا انھوں نے دیباچہ یا ترقیمہ میں ذکر نہیں کیا، لیکن دیباچہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ... علاؤ الدین خلجی (متوفی ۱ ماہ شوال ۷۱۵ھ) کے دور حکمرانی میں مرتب ہوئی جو ۶۹۵ھ سے شروع ہوکر شوال ۷۱۵ھ میں اس کی وفات پر ختم ہوئی۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں مصنف علیہ الرحمۃ نے ایکسو ساٹھ کتابوں سے مدد لی اور ان میں سے مشہور و معتبر متعدد علوم و فنون کی ستاسی کتابوں کے نام مقدمہ کتاب میں تحریر کئے ہیں جن سے ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کی ترتیب اور ابواب کی جامعیت سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے فقہ، اصول فقہ اور فتاویٰ کی متداول اور مستند کتابوں سے بھرپور استفادہ

کیا ہے۔ لاریب کہ فاضل مصنف نے کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں فرائض، واجبات، سنن ومستحبات، مکروہات ومنہیات، انواعِ طہارت اور امدادت وانجاس کے مسائل کو پوری تحقیق اور شرح وبسط کے ساتھ بیان کرکے ایک عظیم کام کیا ہے۔ مقدمہ کتاب میں ماخذوں کا ذکر کرکے انھوں نے مصنفین کے لئے ایک روشن مثال قائم کی ہے جس پر زمانۂ ماضی میں بہت کم عمل ہوا لیکن عہدِ حاضر میں اس کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے اور کسی علمی کتاب کے مباحث ومطالب کی تصدیق کے لئے یہ کام مصنفین ومؤلفین کو کرنا ہی چاہیئے۔

اس مضمون میں جو معلومات پیش کئے جارہے ہیں وہ بیشتر مقدمۂ ترغیب فی الصلوٰۃ سے ماخوذ ہیں اس لئے مقدمہ کی ضروری عبارت مصنف کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے۔:

"پس از تحمید باری تعالیٰ وتعظیم درود مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہمی گوید بندۂ ضعیف راجی احمۃ اللہ الواحد محمد بن احمد بن محمد الزاہد وقاہ اللہ عن آفات العین الملقب بالزین کہ چوں بعضی از کتب اصول فقہ وفروع آں خواندم، پس بقرأتِ احادیث وتفسیر مشغول گشتم، در اثنا آنکہ بعضی از کتب احادیث وتفسیر خواندم، بدین حدیث رسیدم کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ از رسول صلی اللہ علیہ وسلم روایت می کند۔ اول ما یحاسب بہ العبد یوم القیامۃ بعد التوحید الصلوٰۃ فان اصلح فقد افلح وان افسد فقد خاب۔ یعنی اول حسابیکہ روز قیامت با بندہ کنند نماز باشد، چوں از عہدۂ نماز بیروں آمد از جملۂ فائزاں باشد کہ فقد فاز فوزاً عظیما واگر از عہدۂ نماز بیروں نتوانداآمد از زمرۂ خاسراں باشد کہ فقد خسر خسراناً مبینا۔ ازیں جہت بفارسی در بیانِ نماز وشرائط آں پرداختم۔ ایں کتاب از صد وشصت کتاب معتبر جمع کردم وکتاب الترغیب فی الصلوٰۃ نام کردم وبرشش قسم نہادم قسم اوّل در فرضیت نماز از بیان کتاب وسنت واجماع امت ودر بیان فرائض در

جبات وسنن ومستحبات وآداب ومکروہات، ومنہیات، قسم دوم دربیان انواع طہارت
سوم دربیانِ احداث وانجاس وہر قسمے ازیں اقسامِ ثلثہ مفصل آوردوم وفہرست کتب
معتبرہ مشہورہ مع روایاتی کہ دریں مجموعہ آوردہ شدہ است۔ اسامی آں کتب این است
قدوری۔ شرح قدوری۔ منظومہ۔ شرح منظومہ۔ شرح غلائی۔ متفق۔ نافع۔ شرح نافع
یہ۔ فتاوی مسعودی۔ منافع۔ اصول فقہ۔ خلاصہ فقہ۔ صلوٰۃ مسعودی۔ کیمیائے سعادت
حقائق سلمی۔ فتاوی صیرفی۔ مناقب العلوم۔ ملتقط کافی۔ ہدایہ فقہ۔ فتاوی ظہیری۔ فتاوی
ۃ البلخ۔ فتاوی اوحدی۔ ادانی وشرح وافی۔ کنز۔ شامل علامہ بیہقی۔ جامع صغیر
سامی۔ جامع الصغیر خانی۔ کمصفی۔ فتاوی حجہ۔ ذخیرۃ الفقہ۔ اصول حسامی محیط۔
جامع الکبیر اوحدی۔ جامع الاصول۔ اصول بزدوی منتخب۔ طحاوی۔ شرح طحاوی احسان
قعات ناطقات۔ فتاوی کبری۔ ملتقی البخاری۔ زاد الفقہاء فتاوی سراجی۔ فتاوی خانی
زمۃ الاسلام۔ نوادر الاصول۔ تاج الاسامی۔ فتاوی تجنیس۔ فتاوی النسفی۔ تہذیب۔ شرح
تہذیب۔ فروق نیشاپوری۔ عیون المسائل۔ فتاوی حسامی۔ فتاوی برہانی۔ فتاوی مرغینانی
تاب السیر فوائد۔ جامع الصغیر المنابی۔ نصاب الفقہ۔ فروق ناطقی تحفۃ الفقہاء۔ فتاوی
عتابی۔ مختلف منظومہ۔ شرح علامہ کرخی۔ فقہ ابو اللیث۔ جامع اوحدی۔ جامع المضمرات
غایۃ شعبی۔ ینابیع۔ عمدۃ الفتاوی۔ عدۃ الکفی۔ جامع الصغیر عتابی۔ کفایہ بیہقی۔ نصاب الفقہ
سامی فی الاسامی۔ ہارونیات۔ لوامع البیان۔ ریاحین الاحادیث۔ تفسیر زرد۔ احیاء العلوم
مشارق الانوار۔ تفسیر کنز المعانی۔ تفسیر امام زاہد۔ اگر کسی را چیزی دریں مسائل مشکل شود بدین
نسخہ رجوع کنند واقف گردد انشاء اللہ وباللہ العصمۃ التوفیق ۔۔۔۔ واز حضرت،
ذو الجلال، خداوند لایزال امید دارم کہ ثواب وبرکات ایں خیر بہ ایام سلطنت بادشاہ عالم
نواز وجاہل گداز، سلطانِ سلاطین علاء الدولہ والدین، وارث ملک سلیمان ابو المظفر محمد شاہ
برسد، انشاء اللہ تعالیٰ۔ (ماخوذ از نسخہ مخطوطہ رضا لائبریری رامپور صفحہ ۱ تا صفحہ ۶)

مصنف علیہ الرحمۃ نے کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ کے ماخذ و مصادر میں اکیسو ساٹھ کتابیں بتائی ہیں جیسا کہ مقدمۂ کتاب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے لیکن ان میں سے ستاسی کتابوں کے نام خاص طور پر لکھے ہیں اور ان کتابوں کو "کتب مشہورہ معتبرہ" کہا ہے۔ ان میں سے متعدد کتابیں ایسی ہیں جو عرصۂ دراز سے نایاب ہیں۔ کتابوں کی مطبوعہ اور مہر فہرستوں (کیٹلاگس) سے ان کی موجودگی معلومہ کتب خانوں میں ثابت نہیں ہوتی، تاہم ترغیب فی الصلوٰۃ کے ماخذوں میں ان کا نام آجانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ترغیب فی الصلوٰۃ کے عہد میں وہ مقبول و معروف کتابوں میں شمار ہوتی تھیں اور ان سے علماء و فقہا استفادہ کرتے تھے۔

کتاب الترغیب اور اس کے مصنف کے ذکر سے تذکروں کی کتابیں بالعموم خالی ہیں۔ "اخبار الاخیار" بھی جو ہندوستان کے مشائخ و علماء کا مشہور تذکرہ اور جسے اس کے بعد لکھے گئے بیشتر تذکرے اس سے ماخوذ و مستفاد ہیں، اس باب میں خاموش ہے۔ "کشف الظنون" میں البتہ کچھ ذکر ملتا ہے لیکن وہ اتنا کم ہے کہ اس کی روشنی میں مصنف اور کتاب کے بارے میں کوئی سیر حاصل تبصرہ پیش نہیں کیا جا سکتا تاہم اس سے مصنف اور کتاب کا نام معلوم ہو جاتا ہے۔ کشف الظنون کی عبارت کا ترجمہ اور ماحصل درج ذیل ہے۔

"ترغیب الصلوٰۃ" محمد بن احمد الزاہد کی تصنیف ہے جو فارسی زبان میں ایکسو کتابوں کی مدد سے مرتب کی گئی۔ اس کو مصنف نے تین اقسام میں ترتیب دیا ہے پہلی قسم نماز کی فرضیت کے بیان میں، دوسری قسم طہارت کے بیان میں اور تیسری نواقض وضو کے بیان میں ہے۔"

(کشف الظنون جلد اول صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ مصر ۱۲۷۴ھ)

مصنف نے جن کتابوں سے اخذ و استفادہ کیا ہے ان کی تعداد کتاب الترغیب

فی الصلوٰۃ، کے مقدمہ میں ایکچو ساٹھ لکھی ہے، کشف الظنون میں صرف سو کتابیں بتائی ہیں۔ کتاب کا صحیح نام از روئے مقدمہ کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ "ہے لیکن صاحب کشف الظنون نے "ترغیب الصلوٰۃ" لکھا ہے۔ یہ دونوں اختلاف مقدمۂ کتاب کے مطابق قابل تصحیح ہیں۔

یہ مضمون سپرد قلم کرتے وقت کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ کے دو عمدہ اور اہم ترین خطی نسخے راقم الحروف کے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ رامپور کے مشہور کتب خانہ (رضا لائبریری) میں موجود ہے اور یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی جدولیں مطلا ہیں خط نستعلیق ہے سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں۔ اندازاً گیارہویں صدی ہجری کا مخطوطہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا نسخہ جناب حکیم ظل الرحمان صاحب (طبیہ کالج علی گڑھ) کے پرائیویٹ کلکشن میں ہے جو اپنی اعلیٰ کتابت، عمدہ کاغذ، دیدہ زیب طلائی جدولوں اور لوح کی وجہ سے بیش قیمت اور قابل قدر مخطوطہ ہے۔ یہ نسخہ بھی دو جلدوں میں ہے، کتابت کا سنہ اور کاتب کا نام اس میں بھی درج نہیں، غالباً بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ یہ دونوں مکمل نسخے ہندوستان میں موجود ہیں احقر نے ان کو بچشم خود دیکھا اور براہ راست استفادہ کیا ہے۔ مذکورہ دونسخوں کے علاوہ کوئی اور مکمل نسخہ علم میں نہیں۔ ان کی باہمی مطابقت سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ یقیناً محمد بن احمد بن محمد الزاہد الملقب بالزین کی تصنیف ہے جو سلطان علاؤ الدین خلجی متوفی ۷۱۵ھ کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ اور یہ وہی علاؤ الدین ہے جس کے متعلق مصنف نے بادشاہ عالم نواز وجاہل گداز اور سلطان سلاطین کے الفاظ مقدمۂ کتاب میں لکھے ہیں اور حضرت امیر خسرو اپنی مشہور کتاب "قران السعدین" میں اس کی مدح میں یوں رطب اللسان ہیں ؎

بازم رخ زیبائی کسی در نظر آمد — عشقی بدل افتاد و ہوائی بسر آمد
آن شاہ علاء الدین اسکندر ثانی — کز لشکر او زلزلہ در بحر و بر آمد
زین پس نخورم ہیچ غمی خاصہ از چرخ — بر شاہ جہاں مژدۂ فتح و ظفر آمد
سلطان جہانگیر محمد شہ اعظم! — گز داد و دہش ہمچو علیؓ و عمرؓ آمد
از زلزلہ جیش تو دہلی زجا خویش — جنبید و زمین بوسہ زناں بیشتر آمد

ان اشعار میں سلطان الشعراء امیر خسرو نے محمد شاہ علاء الدین خلجی کو اسکندر ثانی، سلطان جہانگیر کہا ہے اور داد و دہش میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عمر فاروقؓ کے مماثل قرار دیا ہے۔ یہی نہیں اس مبالغہ آرائی سے بہت آگے بڑھ کر یہ بھی کہا ہے ؎

جہاں از ین دو محمد گرفت رتبت و جاہ
یکی محمدِ مرسل، دوم محمد شاہ

سیر المتاخرین اور مفتاح التواریخ وغیرہ کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کا مرید تھا اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے بھی بہت عقیدت رکھتا تھا چنانچہ خانقاہ سلطان المشائخ میں "مسجد علائی" اسی نے تعمیر کرائی تھی جو بزبانِ حال اب بھی اسلامی شان و شوکت اور علائی حسنِ عقیدت کی ترجمانی کرتا ہے۔

نزھۃ الخواطر کے مؤلف مغفور نے محمد بن احمد بن محمد الزاہد کے تعارف میں جو سطور قلمبند کی ہیں وہ ذیل میں درج ہیں :-

"الشیخ الصالح محمد بن احمد بن علی بن آل احمد مودود چشتی الدھلوی المشہور بمحمد الزاہد کان من نسل الشیخ قطب الدین

مودود چشتی رحمہ اللہ ولد ونشار بدار الملک دہلی واخذ عن ابیہ
عن جدہ وعلم جرا واخذ عنہ الشیخ رکن الدین مودود النہروالی
الگجراتی وتلک الطریقۃ الوحیدۃ فی الہند تصل علیٰ مشائخ چشت
بغیر واسطۃ الشیخ معین الدین حسن السنجری الاجمیری رحمۃ اللہ"

نزھۃ الخواطر کی یہ عبارت اگرچہ مختصر ہے۔ اس میں محمد بن احمد بن محمد الزاہد کا سال ولادت اور وفات مذکور نہیں، ان کا عہد اور عمر بھی متعین نہیں، نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ یا کسی اور کتاب کے وہ مؤلف ومصنف ہیں، بایں ہمہ یہ چند سطریں بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ہمارے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ محمد بن احمد بن محمد الزاہد (مصنف کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ) شیخ قطب الدین مودود چشتی کی نسل سے تھے۔ ان کا مولد ومنشا دہلی ہے اور انھوں نے طریقۂ چشتیہ مودودیہ اپنے اَب وجَد سے اخذ کیا۔ ان کا یہ سلسلۂ طریقت ہندوستان میں واحد سلسلہ ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری، اجمیری کے واسطے کے بغیر مشائخ چشت سے ملتا ہے اور شیخ رکن الدین نہروالی، گجراتی طریقۂ چشتیہ مودودیہ میں ان کے مرید تھے۔

(نزہۃ الخواطر جلد دوم صفحہ ۱۲۲)

ان معلومات کی روشنی میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ نزھۃ الخواطر میں جن بزرگ کا ذکر خیر محمد بن احمد بن محمد الزاہد کے نام سے کیا گیا ہے، یہی مصنفِ کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ ہیں اور اس نام کی پوری مطابقت اُس نام سے ہوتی ہے جو مقدمۂ کتاب میں خود مصنف نے لکھا ہے۔

راقم السطور نے ایک مختصر مضمون جون ۱۹۷۶ء کے ماہنامہ برہان" میں تفسیر کاشف الحقائق وقاموس الدقائق" سے متعلق پیش کیا تھا، اس مضمون میں کتاب کے مقدمہ کے بیان کے مطابق مصنف کا نام محمد بن احمد بن محمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری ثم الگجراتی، ظاہر کیا تھا اور دوسرے مضمون نگار حضرات کو اس باب میں جو غلط فہمیاں تھیں ان کا ازالہ کیا تھا۔اب ترغیب فی الصلوٰۃ سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنے کے سلسلہ میں کچھ ایسے قرائن وشواہد بعض تذکروں میں ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الترغیب فی الصلوٰۃ اور تفسیر کاشف الحقائق، دونوں ایک ہی مصنف کی مایۂ ناز تصنیفیں ہیں۔انشاء اللہ العزیز آئندہ مضمون میں اس کی صراحت ماہنامہ برہان، میں پیش کی جائے گی۔

انتخاب الترغیب والترہیب

مولفہ حافظ محدث ذکی الدین المنذری ترجمہ مولوی عبداللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر زجر و عتاب متعدد کتابیں لکھی ہیں ، لیکن اس موضوع پر المنذری کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اسکے متعدد تراجم وقتاً فوقتاً شائع ہوئے مگر نامکمل ہی شائع ہوئے ۔ کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اسمیں سے مکررات اور سندوں کے اعتبار سے کمزور حدیثوں کو نکال کر اصل متن تشریحی ترجمہ اور حواشی کیساتھ ملاکر طبع کرایا جائے

ندوۃ المصنفین دہلی نے نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کیساتھ شائع کرانے کا پروگرام بنایا جسکی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے اس جلد کے شروع میں حدیث اور اس کے متعلقات پر ایک مبسوط اور طویل مقدمہ بھی ہے اسکے بعد اصل کتاب مع تشریحی ترجمہ شروع ہوئی ہے ۔

جلد اول جس میں کتاب الطہارۃ کتاب الصلوٰۃ پر ۱۹ احادیث مذکور ہوئیں تقطیع متوسط ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۵۰۴ قیمت ۲۰ روپے ۔

جلد دوم :- بقیہ ابواب الصلوٰۃ کتاب الصلات ، کتاب الصوم اور نماز عیدین پر مشتمل ہے جس میں احادیث ہوئیں صفحات ۴۰۰ قیمت ۲۰/- روپے ۔

جلد سوم :- جلد سوم میں کتاب الحج کتاب الجہاد اور فضائل قرآن وحدیث کے ابواب آگئے ہیں اسمیں ۱۳۶۰ احادیث شامل ہیں ۔ ابواب حج ۱۸ احادیث ابواب جہاد میں ۲۰۸ اور فضائل القرآن میں ۶۵ احادیث ۔ قیمت ۲۰/- روپے ۔

مکتبہ برہان

فروری ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ: بیس روپے

مرتّبہ
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء کمالات اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم" بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ"۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۸۶ | بابت ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۱ء | شمارہ ۲

مقالات

نظرات

اخبارات سے یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوا کہ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی گزشتہ ماہ جنوری کے تیسرے ہفتہ میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مرحوم برصغیر ہند و پاک کے نامور مورخ اور ماہر تعلیم تھے، ان کا اصل وطن مارہرہ (اترپردیش) میں ضلع ایٹہ کا ایک مردم خیز قصبہ تھا، وہیں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ انٹرنس کا امتحان مولوی بشیر الدین مرحوم کے قائم کئے ہوئے اٹاوہ کے ہائی اسکول سے پاس کیا، مولوی صاحب سرسید مرحوم کے صحبت یافتہ تھے اس لئے ایک زمانہ میں اسی اسکول کی مسلمان لڑکوں کی بہترین تعلیم گاہ وتربیت گاہ کی حیثیت سے بڑی شہرت تھی ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین نمان   اسی اسکول کے فیض یافتہ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے ساتھی تھے، اس کے بعد ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ تحریکِ خلافت شروع ہوئی۔ یہ شروع سے ہی تھے بڑے جذبیلے اور جوشیلے، انھوں نے تحریک میں اس جوش وخروش سے حصہ لیا کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، چند برسوں کے بعد جب کمال اتاترک کے الغائے خلافت کے باعث مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تو مرحوم نے پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور بی۔ اے کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں داخل ہوکر دہلی یونیورسٹی سے تاریخ اور فارسی دونوں میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی کالج میں تاریخ کے لکچرر ہوگئے، سات آٹھ برس کے بعد کالج کے معمول اور دستور مطابق کیمبرج یونیورسٹی گئے اور ڈاکٹر ہوکر واپس ہوئے، ڈاکٹریٹ کے لئے انھوں نے جو مقالہ لکھا تھا وہ "دہلی سلطنت کا نظم ونسق" کے نام سے اسی زمانہ میں ہی شائع ہوکر ارباب علم وتحقیق میں مقبول ہوچکا تھا، کیمبرج سے آنے کے بعد چند برس کالج میں رہے اور پھر دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر قائم ہوئی تو یہ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر تاریخ مقرر ہوکر وہاں چلے گئے اور ساتھ ہی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے، کالج اور یونیورسٹی میں ان کا بڑا وقار اور مرتبہ تھا، اساتذہ اور طلبا سب ان

کا لحاظ اور احترام کرتے تھے۔

مرحوم نہایت پختہ عقیدہ، نماز روزہ کے پابند اور بڑے جوشیلے اور جذباتی مسلمان تھے سیاسی خیالات کے اعتبار سے کٹر مسلم لیگی اور تحریک پاکستان کے سرگرم حامی تھے، چنانچہ وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ۱۵ راگست ۴۷ء کو اسمبلی کا جو پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا ڈاکٹر صاحب اس میں شریک تھے، چند روز کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کی توقع کے برخلاف دہلی واپس آگئے اور یونیورسٹی میں باقاعدہ کام کرنے لگے تو سب کو بڑی حیرت ہوئی، ڈاکٹر صاحب کالج اور یونیورسٹی میں تو میرے رفیق کار تھے ہی یوں بھی ذاتی طور پر میرے نہایت بے تکلف اور عزیز دوست تھے، ایک دن میں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب کیا واقعی آپ نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" بولے: "جی ہاں! میں کراچی سے آیا تو ہوں اسی عزم اور ارادہ کے ساتھ" میں نے کہا "پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ ہوں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور رہیں ہندوستان میں" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: "میں کراچی اسی ارادہ سے گیا تھا کہ اب ہندوستان میں نہ رہوں گا، لیکن قائد اعظم نے مجھ سے فرمایا: "اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے مجھ کو امید ہے کہ دونوں ملک مل جل کر رہیں گے، اس لئے تم جیسے مسلمان جو اعلیٰ عہدہ پر ہیں، میں چاہتا ہوں کہ وہ ہندوستان میں ہی رہیں" چنانچہ قائد اعظم کے اس ارشاد پر میں واپس آگیا ہوں، حالات اگر ٹھیک رہے تو میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے استعفیٰ دے دوں گا" لیکن اس گفتگو کے چند روز بعد ہی دلی میں قتل و غارتگری کا بازار ایسا گرم ہوا کہ ۱۸۵۷ میں بھی ایسا گرم کیا ہوا ہوگا۔ ستمبر ۴۷ء کے پہلے ہفتہ میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی اور دلی یونیورسٹی کے مسلمان رجسٹرار کے مکان پر یونیورسٹی کے کیمپس میں شدید حملہ ہوا اور دونوں کو اپنی جانیں بچا کر ترک وطن کرنا پڑا۔ ———

ذاتی واقفیت کی بنا پر مجھ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان چند مخلص مسلمانوں میں

سے تھے جنہوں نے نیک نیتی اور ایمانداری سے یہ سمجھا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم ہوگا، وہاں کے مرد عورت جوان اور بوڑھے عقیدہ اور عمل اور اخلاق و عادات کے اعتبار سے بہتر مسلمان ہوں گے اور دونوں ملک امن و سلامتی سے رہیں گے، لیکن وہاں ان معصوم توقعات کے بالکل برعکس جو حالات رونما ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو سخت مایوس کردیا اور وہ اس صورت حال پر اپنے غم و غصہ اور درد و کرب کا اظہار تقریروں، تحریروں اور نجی گفتگوؤں میں برملا اور علی الاعلان کرتے تھے، تاہم قائد اعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں ان کے بڑے قدردان تھے، اس بنا پر وہ آبادکاری کے وزیر مقرر کئے گئے تھے بڑے شریف اور دوست، اس زمانہ میں میں کلکتہ میں تھا۔ وہاں سے میں نے کراچی اور لاہور کے بعض دوستوں اور عزیزوں کی سفارش میں ڈاکٹر صاحب کو خطوط لکھے تو ان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے فراخدلی سے ان کی مدد کی، نواب زادہ کی شہادت کے بعد جب پاکستان میں الٹ پلٹ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب بددل ہوکر امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر ہو کر چلے گئے، یہاں انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر لکچر دیئے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور ہماری نظر سے گزرے ہیں، مرحوم کے بلند پایہ مؤرخ اور محقق ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا، لیکن مجھ کو ہمیشہ ان سے یہ شکایت رہی کہ ان کی غیر معمولی جذباتیت کہیں کہیں مؤرخانہ معروضیت پر غالب آجاتی ہے، یہ رنگ ان کی اس کتاب میں بھی ہے اور ایک دوسری کتاب "علماء" میں بھی، آپ کہیں گے "ہندو مؤرخین بھی تو غیر متعصب نہیں ہیں" میں عرض کروں گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم "یعنی بلا سے کوئی گمراہ ہوتا ہے تو ہونے دو، تم اے مسلمانو! بہرحال سیدھے راستہ پر رہو" اس بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی لاکھ دھاندلی کرے ایک مؤرخ کو بہر صورت تاریخ کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے۔

امریکہ اور دوسرے ملکوں کے دورہ کے بعد کراچی واپس آئے تو یہاں مختلف اوقات میں مختلف عہدوں پر رہے۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ آخر میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور بھٹو گورنمنٹ کے عہد میں اس سے سبکدوش ہوکر خانہ نشین ہوگئے، لیکن سیاسیات سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی جس کی وجہ سے وہ بھٹو گورنمنٹ کے معتوب بنے رہے، ڈاکٹر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ میں پاکستان گیا اور کراچی بھی پہونچا تو ایک دن صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی غرض سے کراچی یونیورسٹی بھی گیا، ڈاکٹر صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے۔ میں نے اطلاع کرائی نام سنتے ہی فوراً باہر نکل آئے، ۲۳ برس کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی فرط محبت میں بغلگیر ہوگئے اور دفتر کے اندر آکر "سخنِ گزشتہ گفتن وگلہ را دراز کردن" کا دور شروع کردیا۔ ابھی ہم کافی پی رہے اور باتیں کرہی رہے تھے کہ اچانک ایک نہایت شائستہ وبائستہ خاتون کمرہ میں داخل ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب سے بولیں: وقت ہوگیا! آپ انتظار ہورہا ہے، ڈاکٹر صاحب نے فوراً گھڑی دیکھی اور کھڑے ہوگئے، مجھ سے بولے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے ڈپارٹمنٹ کے ماتحت ایک شعبہ اسلامک سوشیالوجی کا قائم ہوا ہے، یہ خاتون ڈپارٹمنٹ کی صدر ہیں اور ڈاکٹر صاحب اس وقت اسلامک سوشیالوجی کے سکشن کا افتتاح کرنے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مجھے ساتھ لئے ہوئے ڈپارٹمنٹ کے ایک وسیع اور کشادہ کمرہ میں داخل ہوئے جو اساتذہ، طلبار اور طالبات اور اخبارات کے نامہ نگاروں سے بھرا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب ڈائس پر اپنی کرسی پر بیٹھے اور ایک قریب کی کرسی پر مجھے بٹھادیا، قرآن مجید کی تلاوت کے بعد فوراً ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوگئے اور میرے تعارف میں ایک مختصر تقریر کی جس میں بڑی محبت سے برہان اور میری کتابوں خصوصاً صدیق اکبر کا تذکرہ کرتے کے

ساتھ مجھ سے اپنے دیرینہ تعلق کا بھی ذکر کیا، یہاں تک تو خیر غنیمت تھا، غضب یہ ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے تقریر کی بھی فرمائش کر دی۔ میں یہ سنتے ہی سٹ پٹا کے رہ گیا، تاہم اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک منٹ کے لئے سرنگوں ہو کر خدا سے دعا کی: بار الہا! تو نے میرے دوستوں کے دلوں میں یہ حسن ظن پیدا کیا ہے کہ میں ہر موضوع پر ہر وقت فی البدیہہ تقریر کر سکتا ہوں تو اس وقت میری مدد بھی فرما۔ اس کے بعد میں کھڑا ہوا اور بولنا شروع کر دیا۔ پون گھنٹہ بولا ہونگا۔ تقریر میں میں نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ ان کے عہد میں یہ ڈپارٹمنٹ قائم ہو رہا ہے اور پھر میں نے بتایا کہ اسلامک سوشیالوجی کیا ہے؟ اسلام کس طرح انسانی معاشرہ کو مختلف طبقات پر تقسیم کرتا ہے، ہر طبقہ کے الگ الگ حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے، ان سب کی بنیاد اور اساس ایک ہے اور اس کے ذریعہ اسلام کس طرح کثرت میں وحدت اور سماج میں ہم آہنگی اور توازن و اعتدال پیدا کرتا ہے، آخر میں میں نے یہ بھی کہا کہ اب جب کہ انسانی معاشرہ بدل رہا ہے ضروری ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ اسلامی سماجیات کے جدید مسائل و معاملات کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ میری تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی اور ڈپارٹمنٹ کا افتتاح کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک دن لیاقت آباد میں اپنی کوٹھی پر کھانے پر مدعو کیا اور بس یہ میری اور ان کی آخری ملاقات تھی، انتقال کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ میرا اندازہ ۷۴، ۷۵ کا برس کا تھا۔ لیکن علی گڑھ کے ایک ممتاز خاندان کے ایک پیر کہن سال جو میرے قریب رہتے ہیں ابھی چند روز ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر صاحب ہاربہہ کے ایک اسکول میں سکنڈ ماسٹر تھے اور وہ خود ان کی کلاس میں تھے، مزید برآں انھوں نے یہ بھی کہا کہ انکے پاس اب تک ڈاکٹر صاحب کے قلم کی ایک تحریر موجود ہے جس پر ان کے دستخط ہیں اور ۱۹۱۳ء کی تاریخ پڑی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ان کی عمر میرے اندازہ سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے واللہ اعلم بہر حال بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑی آن بان کے مسلمان تھے اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں دینی حمیت و غیرت اور ایمانی حمیت و جسارت کے ایسے لوگ کم ہی ہوں گے، اللھم اغفرلہٗ۔

اسلام اور انسانیت کی بقار

سعید احمد...... اکبر آبادی

۳ - اختلاف رنگ ونسل وقومیت ووطنیت

وحدت ومساواتِ انسانی سے متعلق اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ اس درجہ روشن اور معلوم عوام وخواص ہیں کہ یہاں اس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مستشرقین اور دوست دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ محمد رسول اللہؐ کا یہ کارنامہ نہایت حیرت انگیز اور بے مثال ہے کہ کل دس برس کی مدت میں عربوں میں جو خاندانی قبائلی اور رنگ ونسل کے شدید امتیازات تھے انہیں محو کر کے پورے جزیرۃ العرب کو ایک قوم اور ملتِ واحدہ بنا دیا اور محمود وایاز کو ایک ہی صف میں دوش بدوش اس طرح لا کھڑا کیا کہ آقا و مولا کا امتیاز ناممکن ہو گیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ بلال حبشی تھے اور غلام، مگر جب انھوں نے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو بڑے بڑے سرداران قریش ان کو اپنا داماد بنانے کی پیش کش کر رہے تھے۔ زینبؓ بنت جحش قریش کی نہایت معزز خاتون اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما پر ان کا نکاح زیدؓ بن حارثہ سے ہوا تھا جو آزاد کردہ غلام تھے۔ پھر انہی زیدؓ کے بیٹے اسامہ تھے جنہوں نے نو عمر اور غلام زادہ ہونے کے باوصف ایک ایسے عظیم الشان لشکر کی قیادت کی تھی جس میں نامور مہاجرین و انصار سب شریک تھے، سالم بن حذیفہؓ ایک غلام تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر سالمؓ زندہ ہوتے تو میں

ان کو خلیفہ بناتا۔

یہ دنیا کا نہایت حیرت انگیز انقلاب درحقیقت نتیجہ تھا ان تعلیماتِ ربانی وحقانی کا جو قرآن اور سنت کے سرچشمۂ قدسی سے پھوٹی اور سننے والوں کے قلب وجگر کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:-

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم کو ذاتوں اور برادریوں میں اسلئے بانٹ دیا کہ تمہاری شناخت ہو سکے، اور اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے، بیشک اللہ علیم وخبیر ہے

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا:-

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء)

اے لوگو! تم اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اسی نفس سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے اور پھر اس جوڑے یعنی آدم وحوا سے بکثرت مرد پیدا کئے ہیں اور عورتیں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی تشریح وتوضیح اس طرح کی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے جس اسلامی منشور MENIFESTO OF ISLAM کا اعلان عام کیا اس میں دوسری نہایت اہم باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا:-

ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا

اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو کہ بے شبہ تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ

نفضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ :-

ایک ہے یا درکھو کہ کسی عرب کو غیر عرب پر اور کسی غیر عرب کو عرب پر کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت اور برتری نہیں ہے مگر ہاں پرہیزگاری سے

(سیرت النبی شبلی ج ۲ حصہ دوم ص ۱۵۴)

یہ وہ اعلان عام تھا جس نے دفعتہً ویران کدۂ عالم کو چمن زار ہستی میں تبدیل کر دیا۔

۴۔ سرمایہ داری اور طبقائیت

سرمایہ داری (CAPITALISM) دنیا کی وہ سب سے بڑی لعنت ہے جو انسانی معاشرہ میں فساد پیدا کرتی ہے۔ طبقۂ متوسط و ادنیٰ کے اقتصادی جسم کا خون جونک کی طرح چوس کر جسم کو نحیف و زار کر دیتی ہے جس سے طبقائیت یعنی گروہ بندی کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اسلام دولتمندی کا ہرگز مخالف نہیں اور دولت کو خیر کہتا ہے۔ "وانہ لحب الخیر لشدید" لیکن سرمایہ داری کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور کسب زر و صرف زر کے لئے ایسے ضوابط و قوانین مقرر کرتا ہے کہ ایک شخص دولتمند تو ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے لیکن سرمایہ دار نہیں ہو سکتا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ داری کے عناصر ترکیبی تین چیزیں ہیں :- (۱) حب و طمع زر (۲) جمع و ادخار زر CONCENTRATION OF WEALTH (۳) استحصال اور معاشی لوٹ ECONOMIC EXPLOITATION

اب آیئے ملاحظہ کیجئے اسلام نے کس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک پر ضرب کاری لگائی ہے (۱) اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن و حدیث میں اولاً اور ان کی وجہ سے پورے اسلامی لٹریچر میں کس کثرت سے حب اور حرص و طمع زر کی مذمت کی گئی ہے قرآن میں ہے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (العادیات)

بیشک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس کا گواہ بھی ہے، اور وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے۔

جمع و ادخار زر

اسلام میں دولت ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے نہ کہ مقصود بالذات اور اس لئے وہ دل لگانے سینت سینت کر رکھنے اور جمع کرنے کی چیز ہرگز نہیں ہے: ملاحظہ کیجئے، قرآن بنیا پن اور مہاجنی ذہنیت کی شدید مذمت کس بلاغت سے کرتا ہے، ارشاد ہے :-

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ

سخت ہلاکت ہے ان عیب چینوں اور مذاق اڑانے والوں کے لئے جو روپیہ پیسہ سینت سینت کے رکھتے ہیں اور اس کا شمار کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی دولت ان کو حیاتِ جاوید دے گی، خوب یاد رہے یہ سب لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

جو لوگ اپنی دولت پر گھمنڈ کرتے ہیں، قرآن ان کو کس درجہ سخت تنبیہہ کرتا ہے ارشاد ہے:-

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ

تم لوگوں کو دولت کی بہتات نے بے راہ کر دیا ہے، اچھا یہ اس وقت تک کی بات ہے جب تم قبروں کی زیارت کرو گے۔

اس کے بعد جو آیات ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو تمہیں خوب اچھی طرح پتہ چل جائے گا کہ جس دولت کی بہتات پر تم اتراتے تھے اس کی حقیقت کیا تھی، اور پھر اس روز تم سے پوچھا جائیگا کہ اب بتاؤ تمہارا وہ سامان عیش و عشرت کہاں گیا۔

ایک اور آیت میں وعید اس سے بھی زیادہ سخت ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اس میں اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتے قیامت کے دن اسی سونے اور چاندی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

ایک طرف دولت کے جمع کرنے پر یہ قدغن اور دوسری طرف ایک شخص کی دولت

میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اور خلق اللہ کے حقوق ایسے اور اتنے مقرر کر دیے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بڑی آمدنی کا مالک ہو بہرحال سرمایہ دار نہیں ہو سکتا، زکوٰۃ کے علاوہ جو صاحب نصاب پر نماز کی طرح فرض اور اساس سے دوسرے نمبر پر ہے اور جس میں دولت کا ڈھائی فیصد حصہ ہر سال دینا پڑتا ہے اور بھی متعدد مصارف خیر ہیں جن میں ایک دولتمند کو اپنی دولت صرف کرنی چاہیئے۔ قرآن مجید میں ان مصارف خیر کو صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کا دائرہ اس درجہ وسیع ہے کہ اس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام محتاجوں اور ضرورتمندوں کو شامل کر لیا ہے، ارشاد ہوا۔

وَفِي أَمْوَالِكُمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۝ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ — اور لوگو! تمہاری دولت میں تمام ضرورتمندوں اور نادار لوگوں کا مقرر حق ہے

یہ آیت قرآن مجید میں دو جگہ آئی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک مقام پر ہُم ضمیر غائب کے ساتھ ہے اور دوسری جگہ کُم ضمیر خطاب کے ساتھ! بہرحال مطلب یہ ہوا کہ ایک انسان کی دولت جتنی جتنی بڑھتی جاتی ہے حقوق عباد اللہ بھی اسی تناسب بڑھتے جاتے ہیں، چنانچہ یہ آیت اور اس کے ساتھ دوسری آیت: یَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ یعنی اے محمد! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں، آپ جواب دے دیجئے کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ سب خرچ کر دو، انہیں دونوں آیتوں کی اساس پر حضرت عثمانؓ کے آخری دور خلافت میں افراط زر اور دولت کی بہتات کے باعث شام میں دولتمندوں نے تزک و احتشام سے رہنا شروع کر دیا تھا حضرت ابوذر غفاری نے اعلان عام کر دیا تھا کہ فقراء و مساکین جبراً ان دولتمندوں کی دولت سے اپنا حصہ وصول کر سکتے ہیں، حضرت ابوذر غفاری کی اس تحریک سے شام میں چل چل مچ گئی تو امیر معاویہؓ نے جو شام کے گورنر تھے خلیفہ سوئم کو لکھا۔ انھوں نے

ابوذر غفاری کو مدینہ بلالیا اور وہاں سے خود ان کی خواہش پر انہیں مکہ اور مدینہ کے درمیان ربذہ نامی ایک گاؤں میں منتقل کر دیا۔

اسلام میں زکوٰۃ اور دوسرے مصارف خیر کا جو حکم ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ دولت کو سوسائٹی میں دائر و سائر (CIRCULATE) رہنا چاہئے تاکہ اکتناز یعنی CONCENTRATION OF WEALTH نہ ہو۔ قرآن مجید میں اس کی صراحت بھی ہے۔ فرمایا گیا:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ (الحشر)	بستیوں کے لوگوں کی طرف سے جو کچھ رسول کو ملے اس میں اللہ، رسول، اعزا و اقرباء یتیم، مساکین اور مسافر ان سب کا حق ہے تاکہ یہ دولت کہیں دولتمندوں میں ہی دائرہ سائرہ ہو کر نہ رہ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اس وقت آپ نے زکوٰۃ و صدقات کی وصولی سے متعلق جو ہدایات دی ہیں ان میں فرمایا تھا۔

توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم (صحیح بخاری)	زکوٰۃ ان لوگوں میں جو دولتمند ہیں ان سے وصول کی جائے اور اس کو ان کے فقیروں کی طرف لوٹا دیا جائے۔

دولت جب اس طرح سوسائٹی میں گردش کرتی رہے گی تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی بتا دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُكْثِرِيْنَ هُمُ الْمُقِلُّوْنَ۔ (بخاری کتاب الرقاق)	جو کثیر المال ہوں گے وہی قلیل المال ہوں گے۔

یعنی سوسائٹی میں لوگ کثیر المال بھی ہوں گے اور قلیل المال بھی — اور یہ فرق

بالکل طبعی اور فطری ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ لیکن یہ فرق طبقاتیت پیدا نہیں کرے گا، کیونکہ تعاون باہمی کے اصول پر سب مل جل کر رہیں گے اور ایک دوسرے کے کام آئیں گے، صحابہؓ کرام میں بڑے بڑے دولتمند بزرگ بھی تھے۔ مگر ان کی دولتمندی سے سرمایہ داری اور اس کے ہلاکت خیز عواقب ونتائج پیدا نہیں ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دو لفظوں میں کمال بلاغت سے اقتصادی طور پر اسلامی سماج کا جو نقشہ کھینچا ہے ایک عربی شاعر نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:-

وعلی مکثریھم حق من یعتریھم وفی المقلین السماحۃ والبذل

ترجمہ:۔ ان لوگوں میں جو کثیر المال ہیں ان پر ان لوگوں کا حق ہے جو ان کے پاس آتے ہیں، اور ان میں جو لوگ قلیل المال ہیں ان میں عالی ہمتی اور سخاوت پائی جاتی ہے:۔

ہمارے ملک میں اس تنظیم کی ایک اچھی مثال بوہرہ جماعت ہے لیکن یہ جماعت صرف اپنے لئے جیتی ہے، اس کے برخلاف مسلمان ساری دنیا کے لئے جیتے ہیں، اگر ان میں بحیثیت ایک امت کے یہ تنظیم پیدا ہو جائے تو کیا وہ دنیا سے غربت کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ استحصال مالی (ECONOMIC EXPLOITATION)

اب رہا سرمایہ داری کا تیسرا عنصر ترکیبی یعنی استحصال مالی! اس کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ سود ہے، عرب میں یہود کی سرمایہ داری اسی پر مبنی تھی۔ اسلام نے اسی کو حرام محض قرار دیا ہے۔ اور یہاں تک اس میں شدت برتی گئی ہے کہ صاف فرمایا گیا: جو لوگ سود کا لین دین اور کاروبار کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ یہ لوگ اللہ اور رسول سے جنگ کر رہے ہیں، قرآن مجید میں یہود کے جن اعمال و افعالِ ذمیمہ وقبیحہ کا بار بار ذکر ہے ان میں ان کی سود خواری خاص طور پر نمایاں ہے، سود خواری کی معلوم ومعروف شکل کے علاوہ لین دین کی اور بھی بہت سی شکلیں ہیں جن کو حدیث میں ربوٰا فرما کر نا جائز قرار

دے دیا گیا ہے، حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب بلوغ المرام میں کتاب البیوع کے تحت ان سب کو جمع کر دیا ہے، ان احادیث کو بیک نظر دیکھنے سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکلتا ہے کہ اسلام میں لین دین کی ہر وہ شکل ناجائز ہے جس میں دھوکہ (CHEATING) یا استحصال (EXPLOITATION) یا عدم (UNCERTAINTY) پائی جائے، اسی بنا پر اسلام میں ذخیرہ اندوزی (HOARDING) اسمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ، قمار (GAMBLING) سٹہ بازی (SPECULATING) نیلام (AUCTIONEERING) وغیرہ سب حرام ہیں، اور ان کے مرتکب لوگوں کے لئے سخت وعیدیں عذاب آخرت کی ہیں۔"

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ دنیا کے موجودہ بین الاقوامی تنازعات و اختلافات کے اسباب و علل جن سے خود انسان اور انسانیت کا حفظ و بقاء خطرہ میں پڑ گیا ہے ان کے متعلق اسلام کے احکام اور تعلیمات کیا ہیں، اب آئیے ذرا یہ بھی دیکھیں کہ ایک اعلیٰ قسم کا پُرامن و عافیت اور نہایت مہذب و شائستہ انسانی اور بین الاقوامی معاشرہ قائم کرنے کی غرض سے اسلام کن اخلاق فاضلہ کی تعلیم دیتا ہے؟ اسلام میں اخلاق کی اہمیت اس درجہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے "اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاق" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری بعثت ہی اس لئے ہوئی ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔ اخلاق پر بے شمار ضخیم ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم صرف قرآن سے مختصراً چند اخلاقی احکام نقل کرتے ہیں جن کا تعلق اجتماعی اور تمدنی زندگی سے ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا

اے ایمان والو دیکھو! کوئی ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔ ممکن ہے تم جس کا مذاق اڑا رہے ہو وہ تم سے بہتر ہو اور

مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوٓا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝ (الحجرات)

اسی طرح عورتیں عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے جن کا مذاق اڑایا گیا ہے وہ مذاق اڑانیوالیوں سے بہتر ہوں، اور ہاں! آپس میں ایک دوسرے کو طعن وتشنیع نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کا نام دھرو ایمان لانے کے بعد یہ بدتہذیبی بہت بُری ہے، اور جو لوگ ان چیزوں سے توبہ نہیں کرتے بس ظالم وہی ہیں، اے ایمان والو! لوگوں کی نسبت زیادہ بدگمانی سے بچتے رہو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے جس سے تم نفرت کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے

ہر شخص جانتا ہے کہ غلط افواہوں اور بے بنیاد باتوں کے اڑجانے کو لڑائی جھگڑا اور فتنہ وفساد کے برپا کرنے میں کتنا دخل ہوتا ہے، قرآن کس طرح اسے نظر انداز کرسکتا تھا۔ ارشاد ہوا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ۝ (الحجرات)

اے ایمان والو! اگر کوئی غیر ذمہ دار شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی خوب چھان بین کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی نادانی میں تم کسی قوم سے مڈبھیڑ کر بیٹھو اور پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔!

اخلاقیات میں عدل وانصاف کی کیا اہمیت ہے، ہر ایک کو معلوم ہے۔ آج دنیا کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ کہنے کو ہر فرد بشر اور ہر قوم عدل وانصاف کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن یہی ایک وہ جنس گرانمایہ ہے جو آج انسانی معاملات ومعاشرت کے بازار میں

سب سے زیادہ ارزان اور بے مایہ ہے. آئیے ملاحظہ کیجئے کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے. قرآن میں پہلے سادہ طریقہ پر ارشاد ہوا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ — اللہ عدل اور احسان کرنے کا حکم فرماتا ہے

اس ایک عام حکم کے علاوہ عدل کرنے میں جو چیز مانع ہوتی ہے وہ دوسروں کی خواہشات کی رعایت ہوتی ہے یا کوئی اپنی ذاتی خواہش، کسی سے نفرت یا کسی چیز سے محبت اس راہ کی رکاوٹ بنتی ہے. قرآن مجید میں اس پر سخت تنبیہ کی ہے، امر اول کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر خطاب کر کے فرمایا گیا۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ — اگر یہ یہودی اپنا جھگڑا لے کر آپ کے پاس آئیں تو اللہ نے آپ پر جو کچھ اتارا ہے اس کی روشنی میں فیصلہ کیجئے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے،

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا!

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ — لوگوں کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کیجئے، اور خواہش کی پیروی نہ کیجئے، ورنہ یہ چیز آپ کو راہ خدا سے ہٹا دے گی۔

رہا امر ثانی جبکہ اپنی ذاتی نفرت یا محبت عدل سے مانع ہوتی ہے اس کے متعلق فرمایا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۝ (مائدہ) — اے ایمان والو تم اللہ کے گواہ بن کر عدل وانصاف کو بحال کرنے والے بنکر رہوا اور خبردار کسی قوم کی دشمنی سے مغلوب ہو کر ناانصافی نہ کر بیٹھنا تم ہر حالت میں انصاف کرو، کیونکہ عدل ہی پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے

ایک انسان کے لئے سب سے کٹھن اور نازک مرحلہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے کسی ایسے معاملہ کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے جس میں وہ خود ملوث ہو یا اس کے والدین یا اس کا کوئی عزیز قریب آلودہ ہو، ایسے موقع پر اگر وہ دل پر جبر کر کے حق بات کہتا بھی ہے تو رک رک کر، زبان تتلانے لگتی ہے، سانس کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، غور فرمایئے، قرآن نے اس حالت کی تصویر کشی کس بلاغت سے کی ہے اور انسان کو اس پر سختی سے متنبہ کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا، فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء)

اے ایمان والو! تم اللہ کے گواہ بن کر عدل پر قائم رہو، اگرچہ یہ عدل تمہاری اپنی ذات، یا تمہارے ماں باپ اور اعزا و اقربا کے خلاف ہو، تمہارا باپ اور ماں مالدار ہوں یا فقیر، اللہ ان کو دیکھنے والا ہے، تم بہر حال ان کے مفاد کے پیش نظر عدل کرنے میں نفس کی پیروی نہ کرو اور اس کا خیال رکھو کہ انصاف سے کام لینے میں اگر تم نے الفاظ چبائے یا بات ادھوری کہی تو اللہ تو تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

اب اخلاقیات سے صرف نظر کر کے ایک اور پہلو سے غور کیجئے، وہ یہ ہے کہ ایک سماج کو ہموار و معتدل اور متناسب و متوازن رکھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ سماج جن طبقات پر مشتمل ہے ان میں سے ایک ایک طبقہ کو سماج میں جو اہمیت حاصل ہے اور اس کی وجہ سے جو اس کا مرتبہ و مقام ہے اسے کھلے دل اور نیک نیتی سے تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق اس کے حقوق کا احترام کیا جائے، ورنہ

اگر ایسا نہ ہوگا۔ تو اونچ نیچ پیدا ہونے کے باعث طبقاتی کشمکش پیدا ہوگی۔ اور اس سے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے، فتنہ و فساد کو ابھرنے کا موقع ملے گا اور سماج تباہ ہوگا،

آیئے آخر میں ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں کہ اس معاملہ میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اسلام نے اس باب میں بھی جس دقت و وسعتِ نظر سے کام لیا ہے کسی نے نہیں لیا، اس نے عورتوں، مزدوروں، کسانوں، اعزا و اقربا۔ ہمسائے، اپنے اور پرائے، دور کے اور نزدیک کے، ہم مذہب اور غیر ہم مذہب، یہاں تک کہ جانوروں اور چوپایوں کے حقوق اس تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ مصنفین نے ان پر ضخیم ضخیم مجلدات لکھی ہیں، اردو میں غالباً سب سے بہتر اور سب سے پہلی وہ کتاب ہے جو مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے "الحقوق والفرائض" کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں مرتب کی ہے، حقوق سے متعلق اگر اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح انجیل کی تمام اخلاقی تعلیمات کی روح حضرت عیسیٰ کا یہ فرمانا ہے کہ LOVE THY NAIGHBOUR یا یہ کہ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات کا مغز اور اس کی اسپرٹ صحیح بخاری کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ایمان کامل کی نشانی یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جسے تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، بلکہ قرآن مجید میں تو ایک قدم اور آگے بڑھا کر مومنین کاملین کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ

بہرحال یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ موجودہ عالمگیر حالات میں جو تمام اقوام عالم کے لئے سخت تشویش انگیز بنے ہوئے ہیں، اسلام حفظ و بقائے انسانیت کا ضامن اور کفیل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تعلیمات پر صدق دل اور خلوص نیت سے عمل ہو، اقبال نے اسی وجہ سے بالکل درست کہا ہے۔

نیست ممکن جز بقرآں زیستن!

شاہ ولی اللہ کی اخلاقیات

از: ڈاکٹر تصدق حسین
شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ......

× × × × × × ×

مقالہ نگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بڑے ہونہار نوجوان ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر طہٰ حسین (مصر) کی طرح نابینا ہونے کے باوجود فلسفہ میں ایم اے کیا اور شروع سے آخر تک ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرتے رہے ایم۔ اے کے بعد شاہ ولی اللہ الدھلوی کے فلسفہ پر ایک اعلیٰ تحقیقاتی ——— مقالہ شعبۂ فلسفہ کے ماتحت لکھ کر یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی اور اب چند ماہ سے اسی شعبہ میں لکچرر مقرر ہوئے ہیں، آدمی نہایت ذہین ہیں، حافظہ بہت اچھا اور علمی وتحقیقی ذوق پختہ ہے، امید قوی ہے اگر ان کو اپنے حوصلہ اور ذوق کے مطابق کام کرنے کی سہولتیں میسر آئیں تو یہ علم وتحقیق کی دنیا میں بڑا نام پیدا کریں گے۔ موصوف میرے بھی شاگرد رہے ہیں اور مجھ سے ربط خاص کے باعث اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میری تحریض وترغیب سے انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا ہے؛ یہ حضرت شاہ صاحب پر ان کا دوسرا مقالہ ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کے مابعد الطبیعیات پر ان کا مقالہ آسکے گا۔ (ایڈیٹر)

اسلام سے قبل عرب میں بلند ہمتی اور فیاضی کو ہی نیکی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ اور کسی اخلاقی قدر سے واقف نہ تھے بلکہ وہ غارت گری چونکہ بہادری کا عمل تھا اس لئے سبد سمجھا جاتا تھا۔ نیز ان کی اخلاقیات محض کھاؤ پیو اور خوش رہو پر مبنی تھی۔ اسلام نے ان کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ جہالت کا خاتمہ کیا اور ان کو نیک اور صحیح راہ پر چلنے کا سبق سکھایا۔ وہ تمام برائیاں جو ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں ختم ہو گئیں۔ قرآن نے انھیں اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی۔

پروفیسر مارگولیتھ (PROF. MARGOLIOUTH) کا خیال ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں میں صرف دو خوبیاں پیدا کیں یعنی (۱) بلند ہمتی اور (۲) نظم و نسق۔ صحیح نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کے معمولی مطالعہ سے بھی ایسے بہت سے حوالے جمع کئے جا سکتے ہیں جن میں ان کے علاوہ دیگر اخلاقی اقدار کا تذکرہ ہے۔[۱]

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا[۲]	والدین قریبی رشتہ داروں یتیموں مسکینوں ضرورت مندوں پڑوسیوں ہمسفروں راہ گیروں اور کنیزوں کے ساتھ نیکی کرو۔
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ	بے شک خدا انصاف کرنے نیکی کرنے اور رشتہ داروں کو تحائف دینے کا حکم

۱۔ UMARUDDIN, M., THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL-GHAZZALI, ALIGARH-1962

۲۔ قرآن سورہ ۴ آیت ۳۶

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ [۳]

کرتا ہے اور برائی غلط کاری اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ [۴]

جو خوشحالی اور کامیابی میں خیرات کرتے ہیں جو غصہ پر قابو رکھتے ہیں اور دوسروں کو معاف کرتے ہیں خدا ان نیکی کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے۔

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ [۵]

نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو جو کچھ گزرے صبر سے برداشت کرو یہ تمہارا فرض ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ [۶]

سب عقیدت مند بھائی ہیں لہٰذا بھائیوں کے درمیان امن رکھو۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا

رشتہ دار ضرورت مند اور راہ گیر کو اس کا حق دو فضول خرچ شیطان کے بھائی ہوتے ہیں

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا [۷]

اپنے ہاتھ نہ تو قطعی باندھ لو اور نہ اتنے وسیع کرو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ

اے لوگو ہم نے تمکو پیدا کیا مرد اور عورت اور ہم

---

[۳] قرآن سورہ ۱۶ آیت ۹۰۔ [۴] قرآن سورہ ۳ آیت ۱۳۴۔ [۵] قرآن سورہ ۳۱ آیت ۱۷۔ [۶] قرآن سورہ ۴۹ آیت ۱۰۔ [۷] قرآن سورہ ۱۷ آیت ۲۶، ۲۹

مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ

نے تمہیں گروہ گروہ اور خاندان خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً تم میں عزت والا سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

غرضیکہ قرآن میں بہت سی نیکیوں کا ذکر ہے۔ والدین رشتہ دار اور پڑوسی کے حقوق۔ انصاف پسندی پرہیزگاری شرم وحیا۔ ہمت وحوصلہ مندی خواہشات وحواس کی مناسب نگہداشت اور اس قسم کی دوسری تمام نیکیوں کا جابجا بیان موجود ہے۔ ان حوالہ جات سے پروفیسر مارگولیتھ کے خیال کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔

قرآن کی اخلاقیات کی بنیاد سیرت محمدی پر ہے اور سیرت محمدی مثالی کردار پر مبنی ہے رسول اکرمؐ کی زندگی میں کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو اخلاقی معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ آپ کی زندگی تمام احکامات ربانی کی تشریح ہے جس میں کردار کی تشکیل پر بالخصوص زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں رسول اکرمؐ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے "ہم نے آپ کو مثالی کردار بنا کر بھیجا ہے۔"[۹] اسی کی شرح اس حدیث سے ہوتی ہے۔" رسول اکرمؐ نے فرمایا مجھے اخلاق درست کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔"[۱۰] کسی نے آپ سے پوچھا مذہب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اچھا کردار۔[۱۱] تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسلام نے جو اخلاقی نظام پیش کیا گیا اس سے عرب جیسے بدو قوم کا کردار درست ہو گیا۔ رسول اکرمؐ نے اپنے عمل سے اچھے کردار کے معنی بخوبی طور سے واضح کر دیئے۔ زندگی میں ایک شخص کی بہت سی حیثیتیں ہوتی ہیں وہ باپ ہوتا ہے، بیٹا ہوتا ہے، بھائی ہوتا ہے، شوہر ہوتا ہے، شہری ہوتا ہے اور رہنما ہوتا ہے۔ اچھے کردار کے معنی ہیں کہ وہ ان تمام حیثیتوں سے صحیح کردار کا نمونہ

---

۸ قرآن سورہ ۴۹ آیت ۱۳ UMAYUDDUI, M. THE ETHICAL PHILOSOPHY AL GHAZZALI, 9
قرآن سورہ ۶۸ آیت ۴ [۱۰] الغزالی۔ احیاء العلوم جلد سوم صفحہ ۳۴ ALIGARH, 1962
HAUMAYUD, M. THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL GHAZZALI, 1962, P. [۱۱]
الغزالی۔ احیاء العلوم جلد سوم ص ۳۴

پیش کرے۔ رسول اکرمؐ نے ایسا ہی نمونہ پیش کیا ہے۔

گوکہ اسلامی اخلاقیات کے بنیادی اصول قرآن میں موجود ہیں لیکن اس کو علم کی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب مسلمانوں نے یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا۔ یہ بات صرف اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ دراصل اسلامی فلسفہ کی تاریخ بھی یونانی فلسفہ کے مطالعہ سے ہی شروع ہوئی ہے۔ رسول اکرمؐ کے زمانے میں جو مسئلہ مسلمانوں کے سامنے آتا اس کی تشریح رسول اللہؐ کے ذریعہ کردی جاتی۔ آپ کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی مسلمانوں کو مسائل کے حل میں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اس وقت تک صحابہ کرامؓ نے جو کچھ رسول اللہؐ سے سنا تھا۔ یا جس طرح دیکھا تھا اس کی روشنی میں حل پیش کردیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد یہ صورتحال باقی نہ رہی جو مسائل مسلمانوں کے ذہن میں آتے وہ خود ہی ان پر غور وفکر کرتے۔ اس کے علاوہ خلافتِ راشدہ میں اسلام عربی حدود سے باہر نکلا۔ بہت سے عیسائیوں، مجوسیوں، یہودیوں، اور دیگر قوموں نے اسلام قبول کیا۔ یہ نومسلم اپنے ساتھ اپنے آبائی مذہب کی روایات بھی لائے اور ان کو۔ اسلامی نظام میں خلط ملط کرنے کی کوشش کی۔ نیز اسلام کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر غیر مسلموں نے اسلام پر قلم کے ذریعہ ضرب لگانے کی کوشش کی لہٰذا عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں ابو الحسن حضیل الالاف نے پہلی کتاب لکھی جس میں عقلی دلائل کے ذریعہ اسلام پر اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب دیا۔ مسلم علماء نے اس کارخیر کو انجام دینے کے لئے۔ یونانی فلسفہ کو پڑھا اور اسی کے مطابق اعتراضات کا جواب دیا۔ اس طرح اسلام میں علم الکلام کی بنیاد پڑی۔ بایں صورت اسلامی فلسفہ یونانی فلسفہ کی بنیاد پر شروع ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ تقریباً تمام اسلامی علوم جن میں اخلاقیات بھی شامل ہے کی بنیاد یونانی فلسفہ بن گیا۔ [۱۲]

۱۲۔ علامہ شبلی نعمانی۔ الکلام ص ۳۔۱۔ ۳۵

مسلمانوں میں پہلا اخلاقی مفکر ابن مسکویہ ہے۔ اس سے قبل کندی، فارابی اور ابن سینا اخلاقیات کو سیاسیات کا حصہ سمجھتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یونانی فلسفہ میں بھی مشائین اور مستشرقین اخلاقیات کو سیاسیات کا حصہ سمجھتے تھے گو کہ پارفیرد اور گیلن کی ارسطو پر لکھی کتاب پر شرح شائع ہو چکی تھی لیکن مسلم مفکرین نے ابن مسکویہ سے قبل علم الاخلاق پر توجہ نہیں دی[۱۳]

ابن مسکویہ پہلا فلسفی ہے جس نے اخلاقیات پر باقاعدہ توجہ دی۔ وہ اپنی کتاب تہذیب الاخلاق میں روح کی فطرت سے بحث کرتا ہے جو اپنے وجود کا شعور رکھتی ہے جو باعتبار ذات قدسی ہے۔ روح جتنی الضوارانی اور قدسی علم کی حامل ہوتی ہے۔ نیز یہ علوم عقلیہ سے بھی متمیز ہوتی ہے۔ عقل انسان کو کامل بناتی ہے لیکن ہر شخص اس کمال کو نہیں پہونچتا۔ یہ صرف انہیں لوگوں کا حصہ ہے جو فطری طور پر نیک پیدا ہوتے ہیں۔ مسکویہ کے خیال کے مطابق کچھ لوگ فطری طور پر نیک، کچھ بد اور کچھ نہ نیک نہ بد پیدا ہوتے ہیں۔ ماحول اور تربیت سے ان کے کردار کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ وہ نیکی (GOOD) کی بہت سی قسمیں بتاتا ہے مکمل نیکی (SBSOLUTE GOOD) سب میں افضل ہے تمام نیکیاں مکمل نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں جو اس انسان کو اس نیکی کے حصول سے روکتے ہیں لیکن اس میں ارادے کی استعداد ہوتی ہے جو نیک و بد میں تمیز کرتی ہے اور جو اس کے اثر کو ختم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان میں ۳ اور قوتیں ہوتی ہیں شہوت (APPILIFION) غضب (ANGER) اور عقل (INTEPPECT) جو انسان کے اندر ۳ اجزاء سے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی بہیمیت (BEASTLY) غضب (FEROCIOUS) اور عقلیت (RATIONAL) اگر یہ اجزاء متوازن ہوتے ہیں تو انسان میں چار نیکیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمت (COURAGE) اعتدال (TEMPERANCE) عقل (WISDOM) اور عدالت (JUSTICE)

۱۳۔ علامہ شبلی نعمانی۔ الکلام ص ۴۵ - ۴۶

عقل (INTELLECT) میں دو استعداد ہوتی ہیں ایک عملی اور دوسری نظریاتی عملی استعداد کے ذریعہ انسان کامل کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کا کام اچھے اور برے میں تمیز کرنا ہے۔ تکمیل انسان کا کردار ہے اور وہی اس کے لئے سب سے اعلیٰ مسرت مسکویہ کی اخلاقیات میں یونانی بالخصوص افلاطینی اور اسلامی اخلاقیات کے عناصر موجود ہیں۔ ۱۴

اسلامی اخلاقیات کی تاریخ میں دوسرا بڑا نام غزالی کا ہے جنہوں نے اخلاقیات پہ کئی کتابیں لکھیں ان میں سے خاص طور پہ احیاء العلوم اور المیزان بالخصوص اخلاقیات سے ہی بحث کرتی ہیں۔ تہذیب الاخلاق جو کہ احیاء کا ایک حصہ ہے ابواب کے تقسیم و عنوان کے اعتبار سے مسکویہ کی کتاب سے ملتی ہے یہاں غزالی نے بنیادی اعتبار سے انہیں مسائل پر اظہار خیال کیا ہے جن پر اس سے قبل مسکویہ لکھ چکا تھا۔ کردار اور اس کی تشکیل بہیمیت، غضب اور عقلیت کا بیان اور شہوہ، غضب اور عقل کا بیان وغیرہ مسکویہ کے بیان کے مطابق ہے ۱۵ ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے المنقذ میں لکھا ہے کہ "میں نے جو کچھ لکھا میری فکر کا نتیجہ ہے۔ مجھے مذہب اور صوفیاء کی کتابوں سے یہ مواد فراہم ہوا ہے۔ لوگوں کا خیال غلط ہے کہ میں نے یونانی اساتذہ سے خیالات چرائے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ کچھ چیزیں ملتی جلتی ہیں" ۱۶۔ اسی سے واضح ہوتا ہے کہ غزالی نے جو کچھ بیان کیا اس کی بنیاد مذہب اسلام، کتب صوفیاء اور ان کی اپنی فکر ہے۔

14- UMARUDDIN, M., THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL GHAZZALI ALIGARH 1962 P.P 47-48

ANSARI, ABDUL HQ "THE CONCEPT OF SAADA."

15- UMARUDDIN, M., THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL-GHAZZALI ALIGARH, 1962. P.P -49

16- ALGHAZZALI, "AL-MUNQIDH MIN AD DALAL" P. 1-2 CLOUD FIELD P -57

غزالی کے بعد اسلامی اخلاقیات کی تاریخ میں شاہ ولی اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اور بڑا نام نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر صوفیاء کے یہاں اخلاقی تعلیمات موجود ہیں لیکن ان سے باضابطہ اخلاقیات تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی مختلف کتابوں میں اخلاقی مسائل سے بحث کی ہے۔ ان میں سے بالخصوص حجت اللہ البالغہ ہے۔

افلاطون۔ ارسطو، مسکویہ، فارابی، اور غزالی وغیرہ کی طرح شاہ ولی اللہ کی اخلاقیات کی بنیاد بھی مابعدالطبیعیات پر ہے نیز یہ کہ ان کی اخلاقیات نوعیت کے اعتبار سے متصوفانہ ہے اس کا تصوف پر مبنی ہونا اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ شاہ ولی اللہ بنیادی اعتبار سے خود صوفی تھے۔

اخلاقیات خیر و شر کا علم ہے لہذا اسی کی نوعیت کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ اس کا آغاز خیر کی تعریف سے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام مخلوقات خواہ وہ جاندار ہوں یا غیر جاندار، اپنے اندر کچھ کمالات رکھتی ہیں۔ یہ کمالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہر مخلوق کی نوع میں شامل ہوتے ہیں۔ انھیں کمالات نوعی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں حاصل کیا جاتا ہے۔ حاصل شدہ کمالات صرف انسان کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کمالات کی بنیاد پر خیر کا تعین کیا جاتا ہے [۱۷]

کمالات نوعی تمام مخلوق میں مشترک ہوتے ہیں لیکن اس اشتراک میں مخلوق کی فطرت کو دخل ہوتا ہے۔ کچھ کمالات ایسے ہوتے ہیں جو انسان و حیوان میں مشترک ہوتے ہیں اور کچھ جمادات و حیوانات و انسان میں مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً بلندی ہر مخلوق میں مشترک ہے۔ ان اشتراکی کمالات کو خیر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ نوعی ہوتے ہیں۔ اور شئے کے ارادے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ اگر انہیں خیر خیال کیا جائے تو ہر شئے میں بہ اعتبار فطرت خیر موجود ہوگی

۱۷۔ شاہ ولی اللہ۔ حجت اللہ البالغہ۔ مترجم عبد الحق بزاروی۔ لاہور صفحہ ۸۹ تا ۹۰۔

مثلاً بلندی کو اگر ہم خیر تسلیم کریں تو پہاڑ میں سب سے زیادہ خیر ہوگی جبکہ امر صحیح ہے کہ پہاڑ کا خیر سے کوئی تعلق نہیں۔ حاصل شدہ کمالات میں سے کچھ نوعی ہوتے ہیں لیکن ان کا اظہار موقع و محل پر ہوتا ہے۔ مثلاً ہمت و حوصلہ حیوانات و انسان میں مشترک ہے وقت ضرورت اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کا شمار حاصل شدہ کمالات میں اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ یہ پوشیدہ صلاحیت کی صورت میں انس و حیوانات میں موجود ہوتی ہے اور جو اس صلاحیت سے آگاہ ہو جاتا ہے اسے استعمال کرتا ہے۔ اس آگاہی میں اس کی ذات کو دخل ہوتا ہے لہذا یہ آگاہی حصول ہے۔ حاصل شدہ کمال ہونے کے باوجود ہمت و حوصلہ مندی حقیقی سعادت نہیں۔ اس قسم کے کمالات کو شاہ ولی اللہ جزوی سعادت کہتے ہیں حقیقی سعادت وہ کمالات ہیں جن کا حصول صرف انسان ہی کے لئے ممکن ہے۔ دیگر مخلوقات پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا ان کے حصول میں انسان کی عقل معاون ہوتی ہے اور حسن و قبح عمل پر مبنی ہوتے ہیں اس کے مطابق شاہ ولی اللہ عمل کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں ایک دنیاوی عمل اور دوسرا دینی عمل۔ اول الذکر کا تعلق دنیاوی امور سے ہوتا ہے اور مؤخر الذکر کا دینی امور سے دنیاوی امور سے متعلق عمل اس لئے حقیقی نہیں ہوتا کیونکہ ان میں سے بہت سے اعمال کا تعلق بہیمیت سے ہوتا ہے۔ دینی امور سے متعلق عمل حقیقی سعادت اس لئے ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ملکی رجحانات سے ہوتا ہے یہ اعمال عبادت و استغفار ہیں۔ [۱۸]

ان اعمال کو اختیار کرنے کے لئے بہیمیت کا کمزور ہونا ناگزیر ہے انسانی فطرت کے مطالعہ کے تحت شاہ ولی اللہ بہیمیت کے قطعی خاتمہ کی تلقین نہیں کرتے وہ اس کو کمزور کرنے اور قابو میں رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ وہ اشراقی فلسفیوں سے متفق نہیں جو بہیمیت کے قطعی خاتمہ میں یقین رکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا خیال نفسیاتی اعتبار سے زیادہ صحیح

۱۸۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ (مترجم) عبدالحق ہزاروی۔ لاہور ص۹۵

ہے۔انسانی کمزوریاں جن کا بہیمیت سے تعلق ہوتا ہے ختم نہیں ہوسکتیں قابو میں رکھی جاسکتی ہیں۔بہیمیت پر نگہداشت ملکی قوت کے ذریعہ ہی رکھی جاسکتی ہے۔اس کے لئے ملکی قویٰ کی تربیت کی ضرورت ہے ۱۹۔

ملکی قویٰ کے حاوی ہونے کی صورت میں انسان قدسی امور کی طرف مائل ہوگا اور وہ اعمال کریگا جن سے ان امور کی تکمیل میں مدد ملتی ہے اسطرح وہ حقیقی سعادت کا حامل ہوگا۔شاہ ولی اللہ کے خیال میں سعادت کسی عمل کو اتفاقیہ طور پر کرنا نہیں بلکہ اس کا عادی ہونا ہے نیز یہ کہ اس عمل کا تعلق قدسی امور سے ہونا چاہئے بہیمیت کے کمزور ہونے کے بعد وہ ان اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے اور پھر ان کا عادی ہوجاتا ہے۔عادت کے سبب اس کے اندر چار بنیادی نیکیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو طہارت عجز،سماحت اور عدالت ہیں۔۲۰۔

طہارت کا تعلق صفائی سے ہوتا ہے۔صفائی دو سطحوں پر ہوتی ہے۔ایک جسمانی اور دوسری قلبی۔جسمانی صفائی کے لئے سالک غسل کرتا ہے طرح طرح کی خوشبوئیں بھی استعمال کرتا ہے صاف لباس پہنتا ہے اور بار بار وضو کرتا ہے۔قلب کی صفائی کا انحصار روح کی صفائی پر ہوتا ہے روح اس صورت میں پاک ہوتی ہے جبکہ اس کے اندر پوشیدہ طہارت جو ودیعت کی گئی ہے نمایاں ہوجاتی ہے۔بعد ازاں قلب بھی صاف ہوتا ہے۔اس کے علاوہ تزکیۂ روح وقلب ذکر و اذکار سے بھی ہوتا ہے سالک کو اسمارحسنیٰ کی بار بار تلاوت کرنی چاہئے اللہ کا ذکر کرتے رہنا چاہئے۔اور عبادت میں مشغول رہنا چاہئے نیز اصولِ شرع پر عمل کرنا چاہئے ان اعمال کے بغیر طہارتِ نفس وقلب ناممکن ہے مطہر ہونے کے بعد سالک کو ملائکہ کی دید ہوتی ہے،وہ خوش کن خواب دیکھتا ہے اور ان میں اسے نیک روحوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔طہارت کا عدم حدث ہوتا ہے جسمانی اور

۱۹۔ حجۃ اللہ البالغہ مترجم صفحہ ۱صفا

اندرونی حدث، روح و قلب کو پراگندہ کر دیتا ہے ایسے انسان کی روح و قلب تجلیات ربانی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ناپاک شخص شیطانی منظر کا حامل ہوتا ہے وہ برے خواب دیکھتا ہے اور خوف وہراس کے عالم میں رہتا ہے۔ طاہر شخص حدث میں اضطراب محسوس کرتا ہے۔ طہارت اس کی فطرت بن جاتی ہے اور وہ اس کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ ۲۱

عجز بھی بنیادی نیکیوں میں سے ایک ہے اس کا اظہار خوشحالی کے دور میں ہوتا ہے خوشحال شخص دولت و ثروت کے باوجود اگر خود کو عاجز محسوس کرتا ہے تو یہ سعادت ہے اسے خدا کے حضور اسی طرح عجز و انکسار محسوس کرنا چاہیئے جس طرح وہ بادشاہ کے سامنے کرتا ہے۔ عجز و انکساری سے اسے فرشتوں کا قرب حاصل ہوتا ہے ۲۲

شاہ ولی اللہ جب بھی قرب کی بات کرتے ہیں اسے فرشتوں تک محدود رکھتے ہیں اس سے دو نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ خدا کے قرب کو سالک کے لئے ناممکن سمجھتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ خدا کی تنزیہہ میں مکمل یقین رکھتے ہیں اور اس کے باعث خدا کے قرب کو ہر ایک کے لیے ممکن نہیں سمجھتے ہمارے خیال میں یہی نتیجہ درست ہے وہ قرب الہی کے قائل تو ضرور ہیں لیکن اسے معدودے چند کا حصہ سمجھتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ اللہ کا قرب راہ سلوک کی آخری منزل ہے جس پر کم صوفی پہونچتے ہیں اور جو اسے حاصل کر لیتے ہیں وہ عالم سکر میں پہونچ جاتے ہیں۔ اور وہاں خدا اور بندے کے درمیان امتیاز نہیں رہتا۔ صحو کا مقام حاصل کرنے پر یہ فرق پھر سے نمایاں ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ شاہ ولی اللہ وحدت الوجود کو سکر کا مقام سمجھتے ہیں اور وحدت الشہود کو صحو کا

---

۲۱ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ (مترجم) ۱، ص ۲۲۔ ایضاً ص ۲۱

جیسا کہ ذکر کیا گیا اسلام مکمل طور پر تارک الدنیا ہونے سے روکتا ہے لیکن مکمل طور پر دنیا میں محو ہو جانے کو بھی پسند نہیں کرتا لہٰذا زیادہ تر صوفیاء سماحت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں سہروردیوں کے علاوہ صوفیوں کے دیگر سلسلوں نے خود کو سیاست سے الگ رکھا گو کہ انھوں نے دنیاوی زندگی سے احتراز نہیں کیا تاہم دنیاوی معاملات سے دلچسپی بھی نہیں رکھی شاہ ولی اللہ بھی اسی قسم کی سماحت کو نیکی خیال کرتے ہیں۔ ۲۳

سماحت کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ حصول علم میں معاون ثابت ہوتی ہے اس ضمن میں غزالی کی مثال دی جا سکتی ہے جو مدرسہ نظامیہ بغداد میں کچھ دن درس دینے کے بعد حصولِ علم کے لئے کچھ عرصہ کے لئے تارک الدنیا ہو گئے جستجوئے علم سے مطمئن ہونے کے بعد وہ پھر بغداد لوٹے اور اسی مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا یا یں صورت سماحت ان کے لئے حصول علم کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ ۲۴ صوفیاء* کے علاوہ دیگر مذاہب کے سنتوں نے بھی سماحت کو حصول علم کا ذریعہ بنایا ہے مثلاً بدھا کو اسی ذریعہ سے ہی گیان حاصل ہوا۔ ۲۵

عدالت کی سعادت کا تعلق انتظامی امور سے ہے ان امور کو رضائے خداوندی کے مطابق انجام دیا جانا چاہیئے۔ اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے خدا ان امور کا علم بذریعہ ملائکہ نازل کرتا ہے۔ یہ نزول ہر شخص پر نہیں ہوتا صرف انھیں لوگوں پر ہوتا ہے جو انتظامی صلاحیتیں رکھتے ہیں نیز یہ کہ خدا اپنے پیغام کو پیغمبروں کے ذریعہ لوگوں تک پہونچاتا ہے عدالت کے معنی یہ بھی ہیں کہ منتظم احکام الٰہی کے اعتبار سے نظام چلائے یہاں شاہ ولی اللہ افلاطون سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ عدالت کو اعلیٰ ترین سعادت سمجھتا ہے اور صرف فلسفیوں کو ہی اس کا متحمل قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اسی کو شہنشاہیت کے منصب پر مناسب

۲۳۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۵
۲۴ UMARUDDIN, M., THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL-GHAZZALI, ALIGARH 1962 PP 507-60 — ۲۵ KRISHNAN, RADHAKRISHNAN, INDIAN PHILOSOPHY LONDON 1962, PP 529, 600, 605

سمجھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صرف فلسفی کو ہی عدالت کا متحمل نہیں سمجھتے نیز عدالت کو وہ اعلیٰ ترین نیکیوں میں سے ایک خیال کرتے ہیں لاس کو اعلیٰ ترین نہیں سمجھتے ۲۶۔

افلاطون کے تاثر کے یہ معنی نہیں کہ اسلام عدالت کی سعادت سے بحث نہیں کرتا اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے اور اسلامی فلسفہ سے بھی اپنی کتاب احیاء العلوم میں بھی غزالی نے عدالت پر بحث کی ہے اور اسے اعلیٰ ترین نیکیوں میں تسلیم کیا ہے ۲۷۔

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ کچھ اور نیکیوں کا ذکر کرتے ہیں یہ تمام نیکیاں اسلامی نظام اخلاق میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں ان میں سے ایک عقیدۂ توحید ہے اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جب وہ اسلام کا سبق پڑھتا ہے تو سب سے پہلے وہ توحید کا اقرار کرتا ہے اس کی تصدیق کلمۂ طیبہ سے ہو جاتی ہے جس میں اللہ کی وحدانیت اور معبودیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ توحید کے تین مقامات بتاتے ہیں یعنی پہلا مقام وجودی ہے۔ جس کے تحت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ وجود صرف ایک ہے اور وہی کائنات میں جاری وساری ہے دوسرے مقام پر یقین کیا جاتا ہے کہ کائنات کا واحد خالق ہے اور تیسرے مقام پر یقین کیا جاتا ہے کہ خدا اس کائنات کا واحد معتود ہے غزالی نے بھی توحید کے تین مقامات بتائے ہیں جن کا تعین اقرار کی نوعیت سے ہوتا ہے ۲۸۔

دوسری نیکی اللہ کی صفات میں عقیدہ ہے ذات وصفات اسلامی فلسفہ میں متنازعہ

۲۶۔ شاہ ولی اللہ۔ حجت اللہ البالغہ۔ لاہور ص ۱۰۷۔ ۲۷ PLATO "REPUBLIC"

TY BIOOM, A., NEW YORK, 1968 P.P 330D, 354C, 357 B (SEE ALSO ON PARA 482, UMAYUDDIN, M., "THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL GHAZZALI, ALIGARH 1962 - P - 144

۲۸۔ شاہ ولی اللہ حجت اللہ البالغہ۔ لاہور ص ۱۲۱-۱۲۲۔ UMAYUDDIN, M., "THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL GHAZZALI, ALIGARH, 1962 P.P 107-108

فہم مسئلہ رہا ہے بعض مکاتب ذات و صفات کو یکساں مانتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ ذات و صفات دو یکساں ہیں اور نہ ایک دوسرے سے علیحدہ ذات و صفات کی بنیاد پر ایک گروہ نے خدا کو جسم و مشبہ خیال کیا۔ شاہ ولی اللہ ان میں سے کسی مکتبِ خیال کی پیروی نہیں کرتے وہ صفات کو تشبیہات سمجھتے ہیں اور ان کی تفہیم کے لئے شعور و ادراک سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں نیز وہ صفات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلے حصے میں وہ صفات شامل ہیں جن کا ادراک ہو سکتا ہے دوسرے حصے میں وہ صفات ہیں جن پر سوچنے کی شریعت اجازت دیتی ہے اور تیسرے حصے میں وہ صفات ہیں جن پر سوچنے کے لئے شریعت نے منع کیا ہے۔ سمیع، بصیر، علیم پہلے حصے کی صفات ہیں۔ خوشی و فرحت خدا سے منسوب کی جا سکتی ہیں اور دوسرے حصہ کی صفات ہیں۔ غم و اندوہ تیسرے حصہ کی صفات ہیں جن کا خدا پر اطلاق نہیں ہوتا۔ لہذا اس قسم کے خیالات پر شریعت پر پابندی لگاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ عام لوگوں کی استعداد سے واقف ہیں۔ لہذا وہ انہیں ذات و صفات کے مسئلہ پر انہماک اور ادراک سے روکتے ہیں تاہم مکمل و پختہ عقیدہ کی تلقین کرتے ہیں [29]۔

شاہ ولی اللہ تقدیر کو بھی اہم نکتہ سمجھتے ہیں اس پر عقیدہ رکھنا بھی مسلمان کا فرض خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تقدیر ازل سے ہی ودیعت کر دی جاتی ہے۔ اس کے پانچ مقامات ہوتے ہیں۔ پہلا مقام صورت کا ہے جس پر عالم امثال میں تخلیق ہونے والی شے کی شکل خلق کی جاتی ہے۔ دوسرا مقام اعداد کا ہے جس پر شے کے اعداد کا تعین ہوتا ہے۔ تیسرا مقام آدم اور اولادِ آدم کی تخلیق کا ہے اور چوتھا مقام روح ڈالنے کا ہے۔ پانچواں مقام عالم جبروت میں ہونے والے واقعات کو عالم ملکوت میں ودیعت کرتا ہے۔ قضا و قدر کے اس عقیدے کے تحت نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ

۲۹۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ۔ لاہور، ص ۱۲۲ - ۱۲۴

جبر کے قائل ہیں جس کے تحت سب کچھ پہلے ہی سے مقدور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ ارادے کو تقدیر سے الگ خیال کرتے ہیں۔ اور انسان کو اسی کی بنیاد پر اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ جبر و قدر پر ان کے خیالات اشاعرہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ بھی ان کی طرح خدا کو تمام اعمال کا خالق تسلیم کرتے ہیں لیکن عمل کرنا انسان کے ارادے پر مبنی ہے لہٰذا وہ ان اعمال کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔ ارادے میں انسان آزاد ہے لیکن اس کی یہ آزادی مکمل آزادی نہیں گویا کبھی حد تک جبر اور کسی حد تک قدر کے قائل ہیں ۔[۳۰]

عبادت بھی ان کے خیال میں عظیم نیکی ہے ان کا یہ عقیدہ مکمل طور پر اسلامی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مسلم مفکرین بھی عبادت کی اہمیت کے قائل ہیں نیز اس مصلحت کے بھی قائل ہیں جس کے تحت انسان پر بندگی واجب ہے۔ شاہ ولی اللہ عبادت کو شریعت کے تزکیہ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں نیز بہیمیت کو قابو میں رکھنے اور شریعت پر عمل کرنے کے لئے بھی عبادت لازمی ہے۔ بایں صورت شاہ ولی اللہ کی اخلاقیات میں وہ تمام نیکیاں شامل ہیں جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ ان پر عمل کرنا صرف صوفیاء کے لئے ہی نہیں تمام انسان کے لئے بھی ضروری ہے۔ ان نیکیوں کے علاوہ شاہ ولی اللہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، جہاد، غسل اور وضو وغیرہ کی نیکیاں بھی بیان کرتے ہیں اور ان مصلحتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ان میں پوشیدہ ہیں ۔[۳۱]

برائی کے بیان میں شاہ ولی اللہ شرک پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ اس کو سب سے بڑی برائی سمجھتے ہیں اور اس کو دور کرنا لازمی خیال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام سامی مذاہب جن میں اسلام بھی شامل ہے اس برائی پر

---

[۳۰] شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ۱۲۵ تا ۱۳۰۔ [۳۱] ایضاً صفحہ ۱۴۴ - ۱۴۵۔

خصوصی توجہ دیتے ہیں اور سماج سے ایسی برائی کو یکسر ختم کر دینا چاہتے ہیں لیکن اسلام کے علاوہ باقی مذاہب تحریف کے سبب اس برائی کا خاتمہ ذکر سکے عیسائیت میں جس کا شاہ ولی اللہ نے جابجا ذکر کیا ہے آج بھی شرک موجود ہے گو کہ عیسائی توحید کے داعی ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ اس لئے درست نہیں خیال کیا جاسکتا کیونکہ وہ توحید ثلاثہ کے قائل ہیں۔ ان کے مطابق عیسیٰ نہ صرف پیغمبر ہیں بلکہ خدا کے بیٹے ہیں اس طرح انہیں فرزند خیال کر کے انہیں ربوبیت میں شامل کر لیتے ہیں اور یہ شرک ہے نیز انکے خیال کے مطابق روح بھی ربوبیت کا ایک حصہ ہے اسلامی عقیدے کے مطابق یہ شرک ہے لہذا شاہ ولی اللہ عیسائیوں کو مشرک خیال کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو بھی اسی گناہ کا مرتکب سمجھتے ہیں ۳۲

گناہگار مسلمان اور غیر مسلم کا مرتبہ اسلامی فلسفہ میں اختلاف کی بنیاد رہا ہے۔ اشاعرہ کا مکتب اسی سوال کی بنیاد پر معتزلہ سے الگ ہوا۔ ۳۳۔ اس سوال پر شاہ ولی اللہ کا مسلک اشعری ہے وہ گناہ گار مسلمان کو غیر مسلم سے الگ سمجھتے ہیں مسلمان ہونے کے باعث اس کا مرتبہ غیر مسلم سے بلند ہے ان کے خیال میں گناہ گار مسلم اپنے اعمال کی سزا پاکر نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن غیر مسلم کے لئے یہ نجات ممکن نہیں ہے ۳۴

سزا و جزا کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ اشعری مسلک ہی اختیار رکھتے ہیں خدا مختار کل ہے اس کے اختیارات کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا معتزلہ کا یہ خیال کہ خدا کو نیکی کی جزا اور گناہ کی سزا دینا ہی ہے غلط ہے اس میں اس کے اختیارات محدود ہوتے ہیں اشاعرہ کے خیال کے مطابق نیکی کی جزا اور گناہ کی سزا اس نے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن وہ اس

۳۲۔ شاہ ولی اللہ ۳۳ WATT. M. THE FORMATIVE PERIOD OF ISLAMIC THOUGHT. EDINBURGH 1973, P. 209

۳۴۔ شاہ ولی اللہ۔ حجت اللہ البالغہ۔ لاہور ص ۵۲-۵۳۔

کے برخلاف بھی کر سکتا ہے نیز شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ جزا فرحت و انبساط کے مترادف ہے جو نیکی سے حاصل ہوتی ہے اور سزا ذہنی کرب کے مترادف ہے......... اس میں انسان گناہ کے باعث ملوث ہوتا ہے۔ نیز شاہ ولی اللہ سمجھتے ہیں کہ انسان فطری اعتبار سے نیک ہے اس کی ذات میں لطیفہ نورانی مخفی ہے اگر وہ نیکی کرتا ہے تو اپنی فطرت کو مطمئن کرتا ہے، اس لطیفہ کو جلا حاصل ہوتی ہے اور یہی اس کی جزا ہے۔ بدی کرنے کی صورت میں وہ غیرفطری عمل کرتا ہے اور ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس کے لئے سزا ہے یعنی جزا فرحت و انبساط اور سزا کرب و بلا کے مترادف ہے۔ نیز شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ گناہ انسان کے کردار کو خراب کر دیتا ہے۔ اس خرابی سے سماج میں پراگندگی ہوتی ہے جس کا اثر اس پر بھی پڑتا ہے بایں صورت جزا سماج کی خوشحالی اور سزا پراگندگی کے مترادف ہیں۔[۳۵]

شاہ ولی اللہ کی اخلاقیات بنیادی اعتبار سے FORMALISTIC ہے جس کے تحت نتیجہ پر نہیں مقصد یا نیت پر زور دیا جاتا ہے۔ عام طور سے مذاہب میں اخلاقیات کی یہی شکل ہوتی ہے۔ عیسائیت جس کی اخلاقیات میں دیگر نظریات بھی شامل ہو گئے ہیں در اصل اسی قسم کی اخلاقیات کی حامل ہے۔ ہندومت میں بھی یہ نظریۂ اخلاق بالخصوص گیتا میں موجود ہے۔ اسلام بھی اسی نظریۂ اخلاق کی تائید کرتا ہے لیکن اسلامی نظریۂ اخلاق میں صرف عیسائیت کی نرمی ہی نہیں شریعت موسوی کی سختی بھی موجود ہے۔ اسلام مکمل عدل پر یقین رکھتا ہے اور عدل میں نرمی و سختی بہ اعتبار حُجّت شامل ہیں۔ نیز اسلام عیسائیت کی طرح انسان کو پیدائشی اعتبار سے گناہ گار نہیں سمجھتا بلکہ وہ بہ اعتبار فطرت نیک پیدا ہوتا ہے اس کا اثبات اس حدیث سے ہوتا ہے:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔　　خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ط　　کیا میں تمہارا پروردگار نہیں سب نے کہا! ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔

۳۵۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ لاہور ص۲۵ تا ص۳۶

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۔ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۔ ۳۶

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھو وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ۔ خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں ۔ یہی سیدھا دین ہے ۔ لیکن بہت لوگ نہیں جانتے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں و باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا ۔ ۳۷

مختصراً اسلام کی اخلاقیات FORMALISTIC ہونے کے باوجود دوسرے مذاہب سے مختلف ہے ۔ اسلام آخری مذہب ہونے کے باعث تمام نظریہ ہائے اخلاق کو اپنی اخلاقیات میں یکجا کر لیتا ہے ۔ اس میں فرحت و انبساط کو بھی اہمیت حاصل ہے اور عقل و وجدان کو بھی تاہم نیت پر یا مقصد پر خصوصی زور دیا گیا ہے اور اسی لئے اس کی اخلاقیات FORMALISTIC ہے ۔

شاہ ولی اللہ کے اخلاقیات میں وہ تمام اجزا موجود ہیں جو اسلامی اخلاقیات کا خاصہ ہیں ۔ شاہ ولی اللہ اپنے ہی اعمال کو نیکی خیال کرتے ہیں جن کا تعلق انسان کی فطرت سے ہے ۔ یہ عمل اس لئے نیک ہے کیونکہ انسان بہ اعتبار فطرت نیک ہے ۔ صوفی ہونے کے باعث شاہ ولی اللہ جا بجا ملکی و بہیمی رجحانات کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ ان کی اخلاقیات میں ملکیت کو ابھارنے اور بہیمیت کو کمزور کرنے پر زور دیا گیا ہے ۔ عام طور پر اسلامی مفکرین انسان میں دو رجحانات یعنی ملکیت اور بہیمیت پر یقین رکھتے ہیں ۔ غزالیؒ انسان کے اندر چار قوتیں خیال کرتے

---

۳۶ ۔ قرآن روم آیت ۳۰ (۳۷) صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان ۔ سیرت النبی ص ۶۵ ۔

ہیں یعنی شہوہ غضبہ، شیطانیہ اور ملکیہ ۳۵ ان میں سے اول الذکر ۳ قوی کا تعلق بہیمیت اور آخر الذکر ایک کا تعلق ملکیت سے ہے۔ اسی طرح اشراقی فلاسفہ بھی انسان کے اندر ان رجحانات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور بہیمیت کے مکمل خاتمہ پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ بہیمیت کے خاتمہ پر نہیں کمزور کرنے پر زور دیتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی فلسفیوں کے یہاں رجحانات کا موضوع یونانی فلاسفہ کے اثر کے تحت آیا ہے۔ ارسطو کا انسان میں دو طرح کے رجحانات تسلیم کرتا ہے یعنی (۱) حیوانی اور (۲) عقلی رجحانات مسلم فلاسفہ عقلی رجحان پر نہیں ملکی رجحان پر زور دیتے ہیں جو اول الذکر سے قدسیت کے سبب [illegible] ہے۔ لہذا اسلامی فلسفیوں نے قطعی طور پر یونانی تقلید نہیں کی بلکہ مذہبی [illegible] کے مطابق انسان کے اندرون کا نورانی جز تلاش کیا۔ شاہ ولی اللہ اس نورانی جز کو انسان کی فطرت سمجھتے ہیں اور اس کے حاوی ہونے کو ہی صحیح اخلاق سمجھتے ہیں۔ الحاصل شاہ ولی اللہ کی اخلاقیات اسلامی اور متصوفانہ ہے۔

35. UMATUDDIN, M., THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL GHAZZALI, ALIGARH 1962 P. 62

عصری اور دینی تعلیم گاہوں میں باہمی روابط

ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ صاحب ازہری ۔ صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ قدیم و جدید (اقبالؔ)

ہمارا وطن دو صدی قبل سے انگریزی کی سیاسی [illegible] اور بڑھتے ہوئے اقتدار کے باعث مختلف تحریکات اور انقلابات کا گہوارہ بنا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ طاقت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کا طوفان سارے ملک پر چھا چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم (وفات ۱۲۷۹ھ) کی اسیری، بوڑھے باپ کے سامنے جوان بیٹوں کا قتل، بیگمات کے ساتھ بہیمانہ سلوک، مجاہدین آزادی کو پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں، انگریزوں کے ایسے مظالم تھے جن کی مزاحمت کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جو بصیرت کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے کہ کس طرح اس ملک میں دین کی حفاظت کے ساتھ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ [1]

۱۸۵۷ء میں اگرچہ علمائے کرام کی جد وجہد بظاہر ناکام ہو گئی لیکن اس کے اثرات باقی رہے۔ غدر کے بعد ذی شعور مسلمانوں نے اس مسئلہ کو دو طرح سے سوچا، ایک یہ کہ حکومت انگریزوں کی ہے اس لئے دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز زندگی کو بھی

۱۔ ابوالحسنات ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء ص ۲۳۔

اپنایا جائے۔ دوسرا طرز فکر یہ تھا کہ برطانوی سامراج سے مقابلہ کرکے اسے ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ان احساسات کے ساتھ دو ایسی عبقری شخصیتوں کا ظہور ہوا جن کی مخلصانہ جدو جہد کے نتائج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا پر اثر انداز ہوئے۔ ان دونوں شخصیتوں کا مقصد ایک تھا۔ یعنی مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اس لئے اختلاف نظر کے باوجود یہ دونوں شخصیتیں مختلف راہوں سے ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مولانا قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ) ولی اللہی درس گاہ کے دینی حصہ کو دہلی سے دیو بند اور سرسید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) مدرسہ غازی الدین کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ لے آئے۔

۱۸۲۵ء میں انگریزی حکومت نے مدرسہ غازی الدین (بیرون اجمیری دروازہ دہلی) کو علوم شرقیہ کا ایک مرکز قرار دیا تھا۔ اس کا نام مدرسۂ علوم شرقیہ تھا پھر مدرسہ دہلی ہوا پھر عربک کالج پھر دلی کالج ہوا اور اب ذاکر حسین کالج ہے۔ اس کے پہلے صدر مدرس مولوی رشید الدین خان دہلویؒ (وفات ۱۲۴۳ھ) تھے جو شاہ عبدالعزیزؒ (وفات ۱۲۳۹ھ) شاہ رفیع الدینؒ (وفات ۱۲۳۳ھ) اور شاہ عبدالقادرؒ (وفات ۱۲۳۰ھ) کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا موصوف کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگرد مولانا مملوک العلیؒ (وفات ۱۲۶۷ھ) مدرسہ دہلی کے صدر مدرس ہوئے۔ سرسید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) منشی ذکاء اللہؒ (وفات ۱۳۲۸ھ) مولوی ضیاء الدینؒ (وفات ۱۳۳۷ھ) ڈپٹی نذیر احمدؒ (وفات ۱۳۳۰ھ) اسی مدرسہ دہلی کے فیض یافتہ مشہور طالب علم ہیں! سرسید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) نے علی گڑھ میں انگریزی اسکول قائم کیا تو اس کا نام مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ رکھا۔ پھر وہ کالج بنا تو اینگلو محمڈن اورینٹل کالج ہوا اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔

۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں عام طور پر علم کے تین مراکز تھے (دہلی، لکھنؤ، خیرآباد) دہلی میں شاہ ولی اللہؒ (وفات ۱۷۶۲ء) کا خاندان کتاب وسنت کی تعلیم دے رہا تھا۔ لکھنؤ میں

علمائے فرنگی محل حدیث و اصول فقہ کی تدریس میں معروف تھے اور خیرآباد میں منطق و فلسفہ کی خدمات انجام دی جارہی تھیں۔ [1]

۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ یکے بعد دیگرے وجود میں آئے۔ دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کے دین کو سنبھالا اور مدرسۃ العلوم نے عصری اور معاشی علوم کے ذریعہ مسلمانوں کو دنیوی تباہی سے بچایا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور دہلی کالج جو انگریزی درسگاہیں سمجھی جاتی تھیں ان کا دینیات کا شعبہ قریب قریب دارالعلوم دیوبند سے ہی متعلق رہا۔ مسلم یونیورسٹی شعبہ دینیات کے پہلے ناظم دیوبند کے فاضل مولانا عبداللہ انصاریؒ (وفات ۱۳۴۴ھ) تھے۔ ان کے بعد مولانا احمد میاں انصاریؒ دیوبندی وغیرہ کا تقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی شعبہ دینیات کے پہلے صدر اور ڈین مقرر کئے گئے۔ [2]

دینی تعلیم کے لئے دلی سے جو اساتذۂ کرام دیوبند لائے گئے تھے ان میں اکثر ولی اللّٰہی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ) مولانا یعقوب نانوتویؒ (وفات ۱۳۰۲ھ)، مولانا فضل الرحمانؒ (وفات ۱۳۲۵ھ)، مولانا ذوالفقار علیؒ (وفات ۱۳۲۲ھ) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (وفات ۱۳۲۳ھ) کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ [3]

دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ابتدا میں براہ راست اگرچہ کوئی تعلق نہ تھا لیکن تحریک خلافت کے ساتھ تحریک ترک موالات کا زور ہوا۔ اس تحریک کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ وہ اسکول اور کالج جو حکومت کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ ان کا مقاطعہ کیا جائے۔ مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء)، مولانا شوکت علیؒ (وفات ۱۹۳۹ء) اس مقصد کے لئے پورے ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ علی گڑھ کے جو فیصلے

---

[1] رضوی سید محبوب تاریخ دیوبند ۱۹۷۲ء ص ۳۳ م لبشیر الدین واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء ص ۳۰۷- ۲۰۶ گیلانی مناظر احسن، سوانح قاسمی ندوی پریس دہلی ۱۹۵۸ء ص ۱۴۔ [2] رضوی، سید محبوب۔ حاشیہ تاریخ دیوبند ج ۲- ۱۹۷۸ء ص ۶۱۔ ۱۵۹ [3] رضوی، محبوب تاریخ دیوبند ج ۱ جید برقی پریس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۔۔

نوجوانوں نے مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علیؒ (وفات ۱۹۳۹ء) کو دعوت دی کہ وہ علی گڑھ آکر بھی مقاطعہ کی دعوت دیں۔ جب یہ حضرات علی گڑھ آئے تو ذمہ داران علی گڑھ نے جلسہ کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ طلبار کو سخت ندامت ہوئی دوسرے دن طلبار نے پھر جلسہ کیا اور اس جلسہ میں محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) شوکت علیؒ (وفات ۱۹۲۹ء) کی تقاریر نے ہوا کا رخ ہی بدل دیا [1]

مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) اگرچہ علی گڑھ کالج کو آزاد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن جو طلبار ان کی حمایت میں کالج سے علیحدہ ہوئے تھے ان کو ساتھ لے کر مولانا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے الگ ایک درسگاہ قائم کی جس کی بنیاد تو علی گڑھ میں ڈالی گئی۔ لیکن بعد میں یہ دہلی منتقل ہوگئی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جامعہ ملیہ علی گڑھ کے خلاف ردعمل تھا، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی موجودہ صورت حال کا سرسیدؒ کے ان ارادوں اور منصوبوں سے مقابلہ کیا جائے جو شروع میں علی گڑھ سے متعلق تھے تو خیال ہوتا ہے کہ آج کا علی گڑھ سرسیدؒ کے ان سنہرے خواب کی ایک معمولی سی تعبیر ہے۔ سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین علمی مقصد بنانے کے سبب خود علی گڑھ کالج میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ علی گڑھ ہی تمام امراض کا علاج نہیں۔ قومی اصلاح و ترقی کے لئے علی گڑھ کالج میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کوئی علمی فرق نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ جامعہ کی تاسیس میں سب سے بڑا دل مولانا محمد علی (وفات ۱۹۳۱ء) کا تھا جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے بھی تھے ان اسباب کی بنا پر جامعہ ملیہ کو سرسید کی دلی خواہش کی تکمیل کہا جاسکتا ہے نہ کی انکی کوششوں کے خلاف ردعمل۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ (۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ) کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن (وفات ۱۹۲۰ء) نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاحی جلسہ کی صدارت کی دعوت کو شیخ الہند باوجود علالت کے مولانا محمد علی (وفات ۱۹۳۱ء) کے اصرار پر علی گڑھ تشریف لائے اور فرمایا۔

۱۔ معصومہ عبدالغفار، جامعہ کی کہانی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۵ء ص ۲۰۔ ۱۹ شیخ محمد اکرام موج کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۵ء ص ۵۳۰ - ۱۴۵۔

اگر میری صدارت سے انگریزوں کو تکلیف ہو گی تو میں جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔[۱]

اس خطبۂ صدارت کا خلاصہ جسے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (وفات ۱۳۶۹ھ) نے پڑھ کر سنایا تھا مندرجہ ذیل ہے:

"حضرات! میں نے اس بڑھاپے اور علالت کی حالت میں جس کو آپ خود دیکھ رہے ہیں آپ کی دعوت کو اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اٹھو اور امت مرحومہ کو انگریزوں کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔

اے نوجوان طلبا! میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار مدرسوں اور درس گاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اسی طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔ کچھ دنوں بعد بہت سے علماء میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں گے اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں گے لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ میرے اکابر نے کسی وقت بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ ہاں انگریزی تعلیم کے اثرات اور مذہبی لوگوں کا مذاق اڑانے سے ضرور ہوشیار کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم اغیار کے ہاتھوں کے بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر ہو۔"[۲]

اس موقع پر شیخ الہندؒ کے سامنے بعض طلبا نے اپنے اپنے شبہات پیش کئے جس کا

۱۔ حسین احمد مدنی، نقش حیات ج ۲۔ دہلی ۱۹۵۴ء ص ۲۵۰ ۲۔ حسین احمد مدنی، خطبۂ صدارت، مفتی المطابع دہلی ۱۹۲۰ ص ۷ ۳۲۔

آپ نے تسلی بخش جواب دیا جس سے طلبا مطمئن ہوگئے۔ شیخ الہند رح کے اس مقدس سفر نے علی گڑھ دیوبند، جامعہ ملیہ کے آپسی رابطے کے باب ہمیشہ کے لئے کھول دیے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جمعیۃ الانصار اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں رح (وفات ۱۹۳۰ء) کے ذریعہ قدیم وجدید تعلیم کو یکجا کرنے کی ایک کوشش یہ کی گئی تھی کہ علی گڑھ کے طلبار کو دیوبند بھیج کر عربی و دینی تعلیم کی طرف راغب ومتوجہ کیا جائے۔ چند سال اس تجویز پر عمل بھی ہوا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔[1]

ہندوستان کی تمام عصری اور دینی تعلیم گاہیں مسلک اور مشرب کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ اہل السنۃ والجماعۃ حنفی المسلک۔ جو بلا تخصیص دیوبندی، بریلوی کے لفظی اختلاف اور نظریات سے آزاد ہیں۔ ۲۔ اہل الحدیث ۳۔ شیعہ اثنا عشری (۴) اہل السنۃ والجماعۃ۔ احناف بریلوی (۵) اہل السنۃ والجماعت۔ احناف دیوبندی۔ ان مختلف الخیال مشارب کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہے کہ اختلاف مسلک اور مشرب کی وجہ سے ان عصری اور دینی درسگاہوں کے مابین ربط واتحاد کی کمی تھی۔ اختلافِ مسلک کے باوجود نصاب کا تقریباً ایک طرح کا ہونا۔ اساتذہ و طلبا میں مختلف الخیال ہونے کے باوجود کسی قسم کا نزاع نہ ہونا، نظامِ تعلیم، امتحانات، تعطیلات، نشست وبرخاست کے آداب ہر مکتب فکر کے یکساں ہونا باہمی ارتباط اور مشترک اقدار کی بین دلیل ہیں۔ چنانچہ مادرِ وطن کی یہ عصری اور دینی درسگاہیں مسلک ومشرب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے قریب نظر آتی ہیں۔

۱۔ محمد میاں۔ علمائے حق۔ کتب خانہ فخریہ مراد آباد ۱۹۴۶ء ص ضیاء الحسن فاروقی: ۲۔

DARULULOOM DEOBAND AND AHL DEMAW DBF ONPAKISAT ص ۱۹۶۵ بمبئی ۵۷

علوم جدیدہ عربی فارسی علما رفضلاء کی دین تھے لیکن علماء کی ایک جماعت جدید فلسفہ سے شروع شروع دور ہی اور بعد کے علماء میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہیں ان علوم کی ضرورت کا احساس ہوا اور انھوں نے سوچا کہ دینی درسگاہوں کا نصاب حالات و زمانہ کی رعایت اور ضروریات کے مطابق رکھا جائے۔ قدیم وجدید علماء کے درمیان ایک تعلیمی اور مذہبی ربط ہوا۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں جب ندوہ قائم ہوا تو اس خیال کو جن لوگوں نے عملی جامہ پہنایا ان میں مولوی سید محمد علی مونگیریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ) مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) مولوی عبدالحق خیرآبادیؒ (وفات ۱۳۱۸ھ) سرسیدؒ (وفات ۱۸۹۸ء) نواب محسن الملکؒ (وفات ۱۳۲۵ھ) اور نواب وقار الملک (وفات ۱۹۱۷ء) کے اسماء سرفہرست نظر آتے ہیں[1]

سرسیدؒ نے تو ندوۃ العلماء کے ناظم مولوی محمد علیؒ (وفات ۱۳۴۶ھ) کے نام ایک خط میں اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے:-

"ایک عمدہ کام شروع ہوا۔ اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علماء کا اتفاق ہو الا کوشش ضرور ہو"[2]

۱۳۱۱ھ میں کانپور میں ندوہ کے قیام کے سلسلے میں جو ابتدائی مشورے اور جلسے ہوئے ان میں بلاتفریق مسلک ندوۃ العلماء نے اپنی نصابی کمیٹی میں جہاں مولانا محمد علی مونگیریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ)، مولانا محمود حسنؒ (وفات ۱۹۲۰ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (وفات ۱۳۶۲ھ) مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ)، مولانا شبلی نعمانیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) مفتی لطف اللہ علی گڑھی (وفات ۱۳۳۱ھ) کو رکن بنایا وہاں بریلی کے مشہور عالم مولانا احمد رضا خاںؒ (وفات ۱۳۴۰ھ) کو بھی اس کمیٹی کا ممبر نامزد کیا[3]

---

[1] محمد اکرام - موج کوثر لاہور ۱۹۷۵ء ص ۱۸۷ [2] معارف ج ۴ جولائی ۱۹۱۹ء ص ۳ [3] شاہ معین الدین قدسی ای عبدالسلام - ندوۃ العلماء کے پچاسی سال، لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۵۔

دراصل ندوہ کو دو چشموں سے فیض ملا ہے۔ ایک علی گڑھ سے مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) کے ذریعہ جنہوں نے مغربی درس و تدریس اور جدید علوم کے اصولوں کو ندوہ تک پہنچایا۔ دوسرے مصر سے جو یورپ سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کا مرکز ہے۔ ندوہ نے دیگر درسگاہوں کے مقابلہ میں مصر کی جدید معلومات اور زبان و ادب سے زیادہ فیض حاصل کیا۔[1]

سر سیدؒ کے عقائد سے اکثر دینی درسگاہیں بدظن تھیں لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرسید نے دہلی کے علوم اسلامیہ کے مرکز، خاندان ولی اللّٰہی کے فیض یافتوں اور خوشہ چینوں سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ اس بنا پر دین اسلام اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں جو والہانہ محبت تھی اس کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہوگا چنانچہ نواب محسن الملکؒ (وفات ۱۳۲۵ھ) کو لندن سے ایک خط میں یوں مخاطب ہیں:

"ان دنوں میرے دل کو ذرا سوزش ہے۔ ولیم میور نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں لکھی ہے اس نے دل کو جلا دیا ہے۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سیرت پر کتاب لکھوں۔ اگر اس کام کے لئے تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت کے دن ممکن ہے یہ کہہ کر پکارا جاؤں: کہاں ہے وہ بڈھا فقیر؟ جس نے سیرت پاک پر کتاب لکھی۔"

سر سیدؒ (وفات ۱۸۹۸ء) جس تعلیم گاہ کا خواب دیکھ رہے تھے اس کے متعلق انھوں نے خود کہا تھا۔ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا تاج سر پر" لیکن جس صحیح مذہبی اور دینی تربیت کو وہ

---

[1] محمد اکرام۔ موج کوثر۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء ص ۹۶۔ ۱۹۱

ضروری سمجھتے تھے اس کی کامیابی اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکے[1]

مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے خلاف جو رد عمل ہوا اس میں شبلیؒ کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن دنیا یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ مولانا شبلیؒ خود اس تحریک کے ممتاز اور سرگرم رکن ہونے کے باوجود سولہ سال تک سرسیدؒ کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے رہے[2]

ان عصری اور دینی درسگاہوں کے مختصر جائزہ کے بعد بڑی ناانصافی ہوگی اگر روابط کے اعتبار سے خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند کا ذکر نہ کیا جائے جس کے روابط بلا تفریق مسلک ومشرب نہ صرف تمام عصری اور دینی درس گاہوں سے قائم رہے بلکہ اس کے اثرات تمام ممالک اسلامیہ تک پہنچے۔ سینکڑوں سے زاید درس گاہیں جن میں مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر، اسلامی مدرسہ میرٹھ، خورجہ، بلند شہر، دان پور، مراد آباد، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ ڈابھیل اور منظر الاسلام بریلی وغیرہ وغیرہ ایک ہی منہج پر چل رہے ہیں۔ مشرق ومغرب کی قدیم وجدید کشمکش کے باوجود ان دینی اور عصری درس گاہوں پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ (وفات ۱۷۶۲ء) کا بڑا احسان ہے جنہوں نے قدیم وجدید کی کشمکش سے ہٹ کر عقلی اور وقتی مصالح کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا۔

ہندوستان میں اسلام کو تین خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا۔ دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کا اظہار تھا جنہیں دیکھ کر بقول سرسیدؒ مرجانے کو جی چاہتا تھا۔ جیسے ولیم میور (وفات ۱۹۰۵ء) کی کتاب لائف آف محمد صفحہ ۵۳۵ مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء کا نعوذ باللہ یہ انگریزی جملہ ”انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور قرآن ہیں[3]۔

---

[1] محمد اکرام مصدر سابق ص ۲۶۴ [2] محمد اکرام موج کوثر لاہور ۱۹۷۵ء ص ۲۹۴ [3] میور ولیم LIFE OF MUHAMMAD لندن ۱۸۷۷ء ص ۵۳۵۔

تیسرا بڑا خطرہ یہ تھا کہ مسلمان اسلام کے بعض مسائل کو خلافِ عقل سمجھ کر عیسائیت کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ ان تینوں خطرات کا ازالہ مولانا قاسم نانوتوی (وفات ۱۲۹۷ھ) مولانا رحمت اللہ کیرانوی (وفات ۱۳۰۸ھ) مولانا آل حسن موہانی (وفات ۱۲۸۷ھ) مفتی کفایت اللہ وفات ۱۹۵۲ء، مولانا حسین احمد مدنی (وفات ۱۳۷۷ھ) مولانا ثناء اللہ (وفات ۱۹۴۸ء) مولانا الیاس دہلوی (وفات ۱۹۴۴ء) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (وفات ۱۹۷۹ء) مولانا قاری محمد طیب (پیدائش ۱۸۹۷ء) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (پیدائش ۱۳۳۳ھ) مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، پیدائش ۱۳۱۹ھ) مولانا منت اللہ رحمانی، پیدائش ۱۳۳۲ھ) قاضی زین العابدین پیدائش ۱۹۱۰ء مولانا سعید احمد اکبرآبادی (پیدائش ۱۹۰۷ء) اور دیگر علمائے کرام نے اس طرح کیا کہ ان کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں، مناظرے کئے اور پمفلٹ تقسیم کئے۔ یہ انھیں بزرگوں کی سعی کا نتیجہ تھا کہ عیسائی مبلغین اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور دینی درسگاہیں باہمی روابط کے ساتھ آج ایک صدی سے جو کام انجام دے رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "فضلائے دارالعلوم کا جمہور عوام سے جو ربط ہے وہ کسی دگر دینی جماعت کا نہیں۔ سارے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھا ہوا ہے"[1]

ہندوستان کے ان مدارس اسلامیہ کا یہ علمی فیض نہ صرف ہندوستان تک محدود ہے بلکہ اس کے فضلاء کے فیوض و روابط پورے عالم اسلام تک پہنچے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (وفات ۱۳۷۷ھ) مولانا بدر عالم میرٹھی (وفات ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے پیدائش ۱۳۱۵ھ حرم نبوی میں درس حدیث کی خدمات انجام دی ہیں۔

---

[1] ندوی۔ سید ابوالحسن علی تعلیم جدید کا چیلنج لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۲۰۔ رضوی۔ سید محبوب۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۱ دہلی ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۴۱

اسی طرح عرب ممالک سے محمد المامون الارزنجانی، شیخ عبدالتواب، شیخ عبدالمنعم نمر شیخ محمد عبدالوہاب، شیخ جمال مناع اور دیگر عرب ہندوستان آکر عربی زبان کی تعلیم دیتے رہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک سے آئے ہوئے طلباء کی ایک بڑی تعداد ان دینی درسگاہوں میں ہر وقت موجود رہتی ہے جو نہ صرف رابطہ کا ایک بڑا ذریعہ ہیں بلکہ دینی اداروں کی مستقل شہرت کا باعث ہیں۔[1]

۱۳۳۰ھ میں جب سید رشید رضا مصری (وفات ۱۹۳۵ء) ندوۃ العلماء کی دعوت پر ہندوستان آئے تو لکھنؤ سے دیوبند پہنچے۔ ان کی پوری تقریر کا متن اس مختصر مقالہ میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ لیکن چند جملے پیش خدمت ہیں:۔

علی انی رایت فی مدرسۃ دیوبند	اس کے علاوہ یہ ہے کہ میں نے مدرسۂ دیوبند
التی تلقب بازہر الہند نہضۃ	میں جس کو ازہر الہند کا خطاب دیا جاتا ہے
دینیۃ علمیۃ جدیدۃ نرجو ان	ایک جدید علمی تحریک دیکھی جس سے نفع عظیم
یکون لہا نفع عظیم۔	کی توقع ہوتی ہے۔

مدرسہ دیوبند کے منتظمین نے کبھی اس کو ازہر الہند کے نام سے مشہور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی اس خطاب کو اس کے نام کے ساتھ استعمال کیا۔ مگر یہ اس کی مقبولیت وعظمت کی دلیل ہے کہ خود بخود اس کو ایک ایسے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

ما قرت عینی بشئ فی الہند کما قرت	ہندوستان بھر میں میری آنکھ کو ایسی ٹھنڈک
برؤیۃ مدرسۃ دیوبند ولا سررت	کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسہ دیوبند
بشئ ہناک کسروری بہا لام	میں حاصل ہوئی تھی اور نہ اتنی خوشی کہیں

۱۔ رضوی۔ سید محبوب۔ تاریخ دیوبند ج ۱، ۱۹۷۷ء ص ۳۰۸۔

لها من الغيرة والاخلاص في علماء هذه المدرسة۔ وكان كثير من اخواني المسلمين في بلاد الهند المختلفة يذكرون لي هذه المدرسة ويصفه رجال الدنيا منهم علماءها بالجمود والتعصب ويظهرون رغبتهم في اصلاح تعميم نفعها وقد رأيتهم ولله الحمد فوق جميع ما سمعت عنهم من ثناء وانتقاد۔[۱]

حاصل ہوتی جتنی وہاں۔ اور یہ صرف اس غیرت و اخلاص کی وجہ سے تھی جو میں نے اس مدرسے کے علماء میں دیکھی۔ میرے سامنے مختلف شہروں میں بہت سے مسلمان بھائیوں نے اس مدرسہ کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا۔ اور بہت سے دنیا دار لوگوں نے علماء مدرسہ کی نسبت جامد ومتعصب ہونے کا خیال بیان کرکے اپنی رغبت اس کی اصلاح اور تعمیم نفع کی طرف ظاہر کی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے ان کو (علماء دیوبند کو) مدح کرنے والوں کی مدح سے، ان کی نکتہ چینوں کی نکتہ چینی سے بہت اونچا پایا۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی تحریک سے ابتداء میں جو غلط فہمیاں عصری اور دینی درسگاہوں میں پیدا ہوگئی تھیں اب ان میں کسی حد تک تخفیف ہوتی جارہی ہے۔ آج محسوس کیا جارہا ہے کہ کوئی قوم اپنی قومی روایات اور ملی مزاج کو کھوکر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے قدیم وجدید کی کشمکش اور اس کے خطرات سے بالاتر ہوکر ہم کو اس کا علاج تجویز کرنا ہے اور اس کے بلند حوصلوں اور مضبوط ارادوں کے ساتھ سعی پیہم اور انتھک کوششوں کی ضرورت ہے۔

روشن ہے افق پردہ مقدر کا ستارا
مشرق سے ابھرنے کو ہے سورج کا کنارا
اٹھو رفعتِ گردوں سے فرشتے نے پکارا
ہاں چیر دے اے عزم جواں سینۂ خارا
دو کام گیہ دہر جواں باش جواں خیز
اے عزم جواں عزم جواں عزم جواں خیز!

۱۔ محمود رضوان اللہ ترجمہ دکتور دارالعلوم۔ دیوبند واثرہا الاسلامی فی الہند۔ جامعۃ الازہر مصر ۱۹۷۱ء ص ۴
حبیب الرحمان۔ القاسم دیوبند نومبر ۱۲ ۱۹ ادص۔ ۳۔۲

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ شاہجہاں

پروفیسر محمد اسلم، شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ نے شاہجہاں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر لندن یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لی تھی۔ یہ مقالہ اسی زمانے میں طبع ہوگیا تھا اور اب تک برصغیر پاک و ہند کی بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم اے تاریخ کے نصاب میں داخل ہے۔ " ترقی اردو بورڈ" وزارت تعلیم حکومت ہند نے اس کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سے اس مقالے کا اردو میں ترجمہ کروایا اور ۱۹۷۸ء میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے اشتراک سے تاریخ شاہجہاں کے عنوان سے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

گزشتہ دنوں ایک علم دوست بزرگ جناب بی ایل گروور صاحب کی عنایت سے اس تصنیف کا ایک نسخہ راقم الحروف کو ملا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرکے مجھے جو کوفت ہوئی اس کا صحیح اندازہ تو تبصرہ پڑھنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سے واقف نہیں ہوں۔ ان کے بارے میں صرف اتنا سنا ہے کہ وہ اردو زبان کے مایۂ ناز استاد ہیں۔

میرا ہمیشہ ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ کسی تاریخی کتاب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے محض زباندانی ضروری نہیں بلکہ رجال اور اماکن کا علم ہونا بھی ضروری

ہے۔ اور جب تک مترجم تاریخ سے واقف نہ ہو۔ اس وقت تک وہ اس کام کو ہاتھ نہ لگائے۔
تاریخ شاہ جہاں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسکالر نے چند طلبہ سے مختلف ابواب کا ترجمہ کروا کے اپنے نام سے چھپوا دیا ہے اور اس پر نظرثانی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

تاریخ شاہ جہاں کے صلا پر شاہ جہاں پر لذت پرستی کا الزام لگایا گیا ہے، جو اس ولی صفت حکمران کے سیرت اور کردار کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتا مترجم کا کام محض ترجمہ کرنا نہیں ہے۔ اگر سکسینہ صاحب نے شاہ جہاں پر یہ الزام عاید کیا تھا تو فٹ نوٹ میں اس کی تردید ضروری تھی۔ ملا پر عادت باعث لعنت کی بجائے عادت باعث ننگ ہونا چاہیئے تھا۔ اسی صفحہ پر شکستگی کی جگہ شکستگی ہونا چاہیئے۔ اسی صفحہ پر مسز ہیوررج کو مرحومہ لکھا ہوا میری ناقص رائے میں یہاں مرحومہ کی بجائے آنجہانی ہونا چاہیئے تھا۔ مرحوم اور مرحومہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں دک پر قصص الخاقانی کو قصاص الخاقانی اور رصٹ پر طبقات شاہ جہانی کو طبقات شاہجہاں لکھا ہوا ہے صلا پر ایک جگہ فاضل مترجم نے تصنیف کی جمع "تصنیفین" لکھی ہے اگر موصوف تصانیف یا تصنیفات لکھ دیتے تو بہتر ہوتا۔ ہم "تصنیفین" سے مانوس نہیں ہیں۔ ص۱۳ پر کامگار حسینی کی تصنیف مآثر جہانگیری کو دو جگہ معامر جہانگیری لکھا ہوا ہے۔ اسی کتاب کے ص۲۹۵ پر بیس دفعہ معاصر جہانگیری لکھا ہوا ہے۔

ظفر خان احسن کے فرزند اور ملکہ ممتاز محل کے بھانجے محمد طاہر آشنا کو ص۱۶ پر ملّا آشنا لکھا ہوا ہے۔ اس نے ملخص بادشاہ نامہ کے عنوان سے عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ کی تلخیص کی تھی جو عموماً ملخص طاہر آشنا کے نام سے مشہور رہے۔ فاضل مترجم نے ملخص کو ملتخاص لکھا ہے۔ بلخ کے حاکم نذر محمد کو اس کتاب میں پچاس سے زائد مقامات پر نظر محمد لکھا ہوا ہے اور اس کی ابتدا صلا سے ہوتی ہے۔ عمل صالح یا شاہجہاں نامہ کے مصنف محمد صالح کنبوہ سے بچہ بچہ واقف ہے۔ اس کی تعمیر کردہ مسجد اور مقبرہ لاہور میں تا حال موجود ہیں لیکن فاضل

مترجم نے ص۱۷ پر اس کا نام محمد شاہ کمبو لکھا ہے۔ اسی طرح ص۱۸ پر الیشرداس کو اسرداس لکھا ہے۔ خلاصۃ التواریخ کا مصنف سبحان رائے کنتری ٹبالہ (ضلع گورداسپور) کا رہنے والا تھا لیکن مترجم اُسے ص۱۹ پر پٹیالہ کا باشندہ لکھتے ہیں۔ اسی صفحہ پر انھوں نے خلاصۃ کو خلاصات بنا دیا ہے ص۲۱ پر موصوف لکھتے ہیں "دشافعیہ میں ملک عنبر کے متعلق جو حالات ملتے ہیں اس میں قزیونی نے بھی اضافہ کیا ہے۔" یہ قزیونی غالباً قزوینی ہے لیکن شافعیہ کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کس نام کا مخفف ہے۔ اسی صفحہ پر بساتین السلاطین کو بساطین السلاطین لکھا ہے اور ص۲۲ پر ہنوز کی جگہ ہنر چھپ گیا ہے۔ ص۲۲ پر شاہ خرشان کا ذکر آیا ہے۔ خرشان سے شاید خراسان مراد ہو۔ اسی صفحہ پر اصفی کی جگہ آصفی ہونا چاہیئے تھا۔ ص۲۳ پر رونی تلمی شاملو کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تلمی کی جگہ تلّی ہونا چاہیئے۔ ص۲۸ پر مراسلہ کو مراسلا اور ص۲۹ پر چندر بھان برہمن کی تصنیف چہار چمن کو چار چمن لکھا ہے۔ گجرات کی مشہور بندرگاہ کھمبائت کو ہر جگہ کابے لکھا ہوا ہے یہ نام انگریزی میں تو درست ہے لیکن اردو میں مستعمل نہیں ہے۔

قندھار سے ہرات جاتے ہوئے ایک مقام فرہ آتا ہے جہاں مہدی جونپوری مدفون ہے۔ ص۳۵ پر فرہ کا املا فرح کیا گیا ہے۔ ص۳۶ پر فاضل مترجم لکھتے ہیں "جن واقعات کو جان کمپ بل نے چشم دید بنایا ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے مضحک ہو گئے ہیں۔" مضحک کا یہ استعمال راقم الحروف نے پہلی بار دیکھا ہے۔ ص۳۸ پر معمولات کو معملات لکھا ہے دھرمت کے مقام پر اورنگ زیب اور مراد نے داراشکوہ کی فرستادہ فوج کو شکست دی تھی۔ اس مقام کو ص۳۷ اور ۳۹ پر دھرمات لکھا ہے اسی طرح نزدیک کی بجائے نزدیک اور لاہور کی لاھو چھپ گیا ہے۔ خیر، یہ تو کتابت کی غلطی ہے لیکن ص۳۹ پر فاضل مترجم لکھتے ہیں" کام چلانے بھر کی واقفیت تھی۔" اس مہمل فقرہ کو تو کتابت کی غلطی نہیں کہا جاسکتا۔ شہزادہ سلیم ۱۵۶۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ ص۴۲ پر فاضل مترجم نے اس کی ولادت سے تیرہ سال قبل

۱۵۵۷ء میں، جب اکبر خود ابھی نابالغ تھا، سلیم کی شادی جگت گسائیں کے ساتھ کروادی ہے۔

ص۱۴ پر یاقوت الحموی کی شہرہ آفاق تصنیف معجم البلدان کو، جس سے تاریخ اسلام کے طلبہ کے علاوہ عام لوگ بھی واقف ہیں، فاضل مترجم نے مجموعہ البلدان لکھا ہے۔ اسی صفحہ پر حکم گیلانی کو حکیم گیانی لکھا ہے۔ اتنا شکر ہے کہ اسے گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ نہیں ملا دیا۔ ص۱۴ پر راجہ راؤ سنگھ کی نسبت بھر تیہا لکھی ہے، جو محل نظر ہے۔ اسی صفحہ پر گجرات اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر واقع مشہور شہر دھار کو لاہور کے نواح میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی صفحہ پر مہر میرازک کا ذکر آیا ہے۔ یہ بھی مہمل ہے۔ ص۱۶ پر قمرغہ کو قمرغہ لکھا ہے۔ ص۱۷ پر فاضل مترجم لکھتے ہیں۔ "حسب دستور شہزادہ نے قیمتی تحفے نذر کئے جنہیں جہانگیر نے خوشی بہ خوشی قبول کئے۔" یہاں جنہیں کی جگہ جو ہونا چاہیئے تھا۔ ص۲۰ پر اورنگ زیب کی جائے ولادت دوحد کو دوحات لکھا ہے۔ ص۴۵ پر عبدالکریم ماموری کا ذکر آیا ہے۔ ماموری غالباً معمار کے لئے آیا ہے کیونکہ عبدالکریم پیشہ کے اعتبار سے معمار تھا۔ ص۴۵ پر سفر کی جگہ سفر چھپ گیا ہے۔ یہ املا کی غلطی ہے لیکن بات درست ہے کیونکہ سفر عموماً سقر ہوتا ہے۔ ص۵۰ اور ص۵۸ پر دونا تمام فقرے درج ہیں۔ ص۵۹ پر کانگڑہ کو کنگڑہ لکھا ہوا ہے۔ ص۶۰ پر مشاورتی کو مشورتی کونسل لکھا ہے۔ ص۶۳ پر سوا سال کی جگہ سولہ سال ہونا چاہیئے تھا۔ حصار فیروزہ کا علاقہ عموماً ولی عہد کے تصرف میں ہوتا تھا، ص۶۳ پر فیروزہ کی فیروز پور لکھا ہے۔

فاضل مترجم ص۶۴ پر لکھتے ہیں۔ "اس کی شفایابی کی دعائیں بھی مانگی۔" یہاں مانگیں ہونا چاہیئے۔ ص۶۵ پر محمد صالح کنبوہ کو محمد صالح کمبوح لکھا ہوا ہے۔ کاش فاضل مترجم اس کی تصنیف عمل صالح کے سرورق پر ہی اس کا نام دیکھ لیتے۔ ص۶۶ پر کاتب نے زنبیل بیگ کو رنبل بیگ بنا دیا ہے۔ اسی صفحہ پر زین العابدین کے نام کے ساتھ بخشی الحدیث لکھا ہوا ہے۔ مغلوں کے ہاں ایسا کوئی عہدہ نہ تھا۔ البتہ احدیوں کا افسر

اعلیٰ بخشی الآحاد کہلاتا تھا جسے فاضل مترجم نے بخشی الحدیث بنا دیا ہے۔ ص۷۶ پر بخارا شیخ زادے کی جگہ بخاری شیخ زادے ہونا چاہیے۔ ص۸۶ اور ۸۷ پر افغان کی جگہ افغانی ہونا چاہیے تھا۔

راقم الحروف تجویز کی جمع تجاویز سے تو واقف ہے لیکن تجاویزات سے مانوس نہیں ہے۔ فاضل مترجم نے ص۶۹ اور ص۹۷ پر تجاویزات لکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ اردو زبان کے کس قاعدہ کی رُو سے جائز ہے۔ ص۷۱ پر ریاست جے پور کے مشہور شہر آمیز کو امیر اور ص۷۷ پر دھکیل کو ڈھکیل لکھا ہوا ہے۔ اسے ہم کتابت کی غلطی کہہ سکتے ہیں بھنبر کشمیر کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ اب تو وہاں ڈگری کالج بھی کھل گیا ہے۔ فاضل مترجم نے بھنبر کو ص۹۷ پر دو بار بھمبار اور ص۱۱۵ پر بھمبار لکھا ہے۔ اسی لئے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ترجمہ کرنے کے لئے محض زبان جاننا ضروری نہیں، اماکن اور رجال کا علم بھی لازمی ہے۔

ص۸۰ پر بالینغز کو دوبار بالسفر اور ططھورث کو تمیورث لکھا ہوا ہے۔ ص۸۲ پر گولکنڈہ کو راجپوتانہ کا ایک شہر بتایا ہے۔ اسی صفحہ پر راجہ بھرت کو بھارت، ص۹۰ پر خان زماں کو خانِ زبان اور ص۹۲ پر شورش کو سوزش اور اسی صفحہ پر پائیں گھاٹ کو پاپن گھاٹ لکھا ہوا ہے۔ یہ سب تو کتابت کی غلطیاں نہیں ہیں۔ کالنجر وسط ہند کا مشہور قلعہ ہے اسے ص۹۵ پر کالنجار لکھا ہے۔ فاضل مصنف اردو کے مشہور استاد ہیں۔ انھوں نے ص۹۵، ص۱۱۱ اور ص۱۲۸ "ناعاقبت اندیشی" لکھا ہے۔ میں نے اردو صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ صحیح لفظ عاقبت نااندیشی ہے ہم عاقبت کی نفی نہیں کرتے بلکہ عاقبت میں اندیشہ کی نفی کرتے ہیں۔ ص۹۹ پر ایک شخص کو جگ راج اور ص۱۰۰ پر اسے ہی جے راج لکھا ہے، ص۱۰۱ پر ایک ہی شخص کا نام تین طرح لکھا ہوا ہے۔ جبجھار سنگھ، جج ہر سنگھ اور جج ہار سنگھ۔ اتعد کا فاضل استاد یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس کے نام کی صحیح املا کیا ہے۔" اگر وہ بادشاہنامہ

دیکھ لیتے تو اس مخمصے میں سے خود بھی نکل جاتے اور قارئین کو بھی بدمزگی سے بچا لیتے۔

ہماچل پردیش کی مشہور وادی چمبہ کو ص۱۰۶ پر چمپا لکھا ہوا ہے۔ ص۱۰۷ پر پٹھانکوٹ کو پٹھان لکھا ہے۔ اسی صفحہ پر سلطان گکھڑ کو گکھوڑ لکھا۔ ص۱۱۴ پر مغلیہ خاتون کی جگہ مغل خاتون لکھتا زیادہ مناسب اور افصح ہے۔ ص۱۱۶ پر جنگلی جہاز کی جگہ جنگی جہاز ہونا چاہیئے تھا۔ بکسر مغربی بہار میں ایک مشہور جگہ ہے جہاں انگریزوں نے شاہ عالم ثانی، میر قاسم اور شجاع الدولہ کی مشترکہ افواج کو ۱۷۶۴ء میں شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی تھی۔ ص۱۲۱ پر بکسر کو بیکسر لکھا ہوا ہے۔ ص۱۲۴ پر ایک ہی مقام کو کھاتا کبری اور کھاتا کیری لکھا ہے (مؤخر الذکر نام صحیح ہے۔) اترپردیش کے شمال میں کماؤں اور گڑھوال مشہور علاقے ہیں۔ ص۱۲۶ پر کماؤں کو کمانوں لکھا ہے۔ اسی صفحہ پر نوشہرہ کو نوشیرہ اور ص۱۲۱ پر اعزا کو اعزار لکھا ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فاضل مترجم نے ص۹۴ پر پائین گھاٹ کو پاین گھاٹ لکھا ہے ص۱۴۰ اور ص۱۴۱ پر انھوں نے اسے پایانی گھاٹ تحریر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ناموں کی یکسانیت بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔ ص۱۴۲ پر موصوف لکھتے ہیں:۔ "دولت آباد پہنچ کر شاہجہاں نے آخری بار اپنے دار وگیر کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔" اس سے بہتر ترجمہ تو میٹرک پاس کلرک کر سکتا ہے۔ پھر پی۔ ایچ۔ ڈی سے ترجمہ کروانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ کیا اب ہندوستان میں پی ایچ ڈی کا معیار اس سطح تک آگیا ہے؟ اسی صفحہ پر ایک ہی شہر کو کندھار اور کان وہار لکھا ہے۔ ص۱۴۹ پر اسے ہی کاندھار لکھا ہے۔ فاضل مترجم نے یہ فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان میں سے ایک کی املا اختیار کریں اسی طرح دکن کے مشہور شہر بیدر کو ص۱۴۶ اور ۱۴۹ پر بدار اور ص۱۴۸ پر بیدار لکھا ہے ایک ڈاکٹر آف فلاسفی کو اپنے ملک کے جغرافیہ سے اتنی ناواقفیت بھی نہیں ہونی چاہیئے ص۱۴۹ پر رزق اللہ کو رزّاق اللہ لکھا ہے ص۱۵۰ پر کسی خیریت خان کا ذکر آیا ہے اور ص۱۵۱ پر سیدی مرجان

کو سیدی مرجان اور اسی صفحہ پر نظام شاہی خاندان کو نظامی شاہی اور صفحہ ۱ پر مذبذب کو مدبذب لکھا ہوا ہے۔ یہ سب کاتب کی غلطیاں تو نہیں ہو سکیں۔ اسی صفحہ پر گولکنڈہ اور گولکنڈا دونوں طرح لکھا ہوا ہے۔ اور بھی کئی جگہ یہی دیکھنے میں آیا ہے۔

جنوبی ہند میں گوداوری کے کنارے ناندیڑ سکھوں کا ایک مشہور مذہبی مقام ہے جسے وہ احتراماً حضور صاحب کہتے ہیں۔ فاضل مترجم نے اسے ناندار لکھا ہے اسی صفحہ پر ولی عبد دارا لکھا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے تو چکرا گیا۔ لیکن جب سیاق و سباق دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں ولی عہد دارا ہونا چاہیئے تھا۔ صفحہ ۱۶ پر گمنامی کی جگہ گمنانی چھپ گیا ہے۔ صفحہ ۱۱ پر فاضل مترجم نظر محمد (دراصل نذر محمد) والیٔ بلخ اور مغلوں کی لڑائی کے ضمن میں رقمطراز ہیں کہ اس کی فوج سمندری قزاقوں اور سرائے کے سپاہیوں کا اجتماع تھا۔ وسطِ ایشیا میں ڈاکو تو عام تھے لیکن "سمندری قزاقوں" کی موجودگی بڑی معنی خیز ہے۔ صفحہ ۱۷ پر فاضل مترجم لکھتے ہیں "نظر محمد کی فوج خالی ہوگی"۔ یہ فقرہ بھی مہمل ہے۔ صفحہ ۱۳ پر دریاروں کی جگہ دریالوں چھپ گیا ہے اور صفحہ ۱۷ پر سارا املاک کی بجائے ساری املاک ہونا چاہئے تھا اسی صفحہ پر ایک ہی شہر کو خوجند اور خجند دونوں طرح لکھا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ فاضل مترجم اس کی ایک املاء اپنا لیتے

اس کتاب میں ماوراء النہر کو بیسیوں جگہ ماورالنہر لکھا ہوا ہے۔ قلیچ خان کو صفحہ ۱۷۵ پر قیلچ خان لکھا ہوا ہے۔ صفحہ ۱۷ اور صفحہ ۲۰۶ پر اسے ہی تولیچ خان لکھا ہے۔ صفحہ ۱۷ پر گکھروں کی جگہ گکھڑوں ہونا چاہیئے تھا۔ صفحہ ۱۸۴ پر شکایتیں کا املاء شکائیتں کیا ہے صفحہ ۱۹۰ پر تختہ بیگ کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تختہ بیگ ہونا چاہیئے صفحہ ۱۹۱ پر ایک ہی قلعہ کا نام توشانج اور خوشانج آیا ہے یہاں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے تھی۔ صفحہ ۱۹۳ پر ایک شخص کا نام سیاپوش قلار انقی لکھا ہے۔ اس کا نام سیاوش قلر آقاسی تھا۔ صفحہ ۱۹۴ پر ایک زمیندار کا نام ایک ہی سطر میں ملک متندود اور ملک متدود آیا ہے۔

دلیہ اول الذکر نام درست ہے، ہلمند افغانستان کا ایک مشہور دریا ہے، فاضل مترجم نے ص۱۹۵ پر اسے حال مند لکھا ہے۔ اسی طرح ص۱۹۹ پر لبت کو بست لکھا ہے۔ ص۲۰۱ پر تلات غلزئی کو تلات غلزا لکھا گیا ہے۔ ص۲۰۲ پر خطیل کی جگہ فصیل ہونا چاہیے۔ فاضل مترجم نے ص۲۰۶ پر دریائے نربدا کو ملتان کے نواح میں بہتے ہوئے دکھایا ہے اور اسی صفحہ پر یہ مہمل فقرہ بھی درج ہے، پہاڑی کے قریب کے پیچھے ایک تالاب پر۔ پتہ نہیں فاضل مترجم یہاں کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ص۲۱۰ پر مشہور سیاح ٹورنیر کو ٹیورنیز اور ص۲۱۱ پر ٹوویز لکھا ہوا ہے شاہ جہاں کے محلات کی انچارج ستی النساء خانم کو ص۲۱۱ پر ستائی خانم اور ص۲۶۵ اور ص۲۶۶ پر ستائی النساء خانم لکھا ہوا ہے ص۲۱۵ پر ہریانہ کے مشہور تاریخی شہر تھانیسر کو جس سے بچہ بچہ واقف ہے۔ تھانیسور لکھا ہوا ہے۔ شاید ترقی اردو بورڈ اسے ہی اردو کی ترقی سمجھ رہا ہے شاہ جہانی عہد کے مشہور شیخ طریقت حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کو ص۲۱۸ پر خاوند محمود لکھا ہوا ہے ص۲۲۴ پر تاریخ کی ایک مشہور کتاب شمس فتح کانگڑہ کا نام شاہ فتح کانگڑہ درج ہے ص۲۳۱ پر فاضل مترجم نے ایک لفظ کا بڑا مضحکہ خیز ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے RED SANDSTONE کا ترجمہ "سنگ سرخ کی ریت" کیا ہے اس سے مترجم کے مبلغ علم کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مستوفی یا مستوفی الممالک کا عہدہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے ادوار میں بڑا اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ ناصر الدین محمود کے عہد میں جب شمس الدین دبیر اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا تو تاج الدین سنگریزہ نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔ ع

صدرا[1] کنوں بکام دل دوستاں شدی　　مستوفی ممالک ہندوستان شدی!

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے ص۲۳۸ پر مستوفی کو مصطوفی لکھا ہے ص۲۴۲ پر طوغ میق کو بلوچ مین لکھ کر اسے بلوچی النسل بنا دیا ہے۔

گجرات اور کاٹھیاواڑ کے ساحل پر پرتگیزوں کے دو مقبوضات دمن اور دیو تھے انہیں ص۲۴۵ پر ڈمن اور ڈیو لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ص۲۶۳ پر گوالیار کی جگہ گوالیا چھپ

---

[1] بعض نسخوں میں صدرا کی جگہ شمسا بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

گیا ہے۔ صفحہ ۲۶۳ پر وسط ہند کے مشہور قلعہ رنتھنبور کو رانتبھور لکھا ہے۔ اسی صفحہ پر وضع حمل کی صورت بگاڑ کر اسے وضع محل بنا دیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی ایک بیوی کا نام دلرس بانو بیگم تھا جس کا مزار اورنگ آباد میں "مقبرہ رابعۂ دورانی" کے نام سے مشہور ہے فاضل مترجم نے دلرس بانو کو دل آرا بنا دیا ہے، حالانکہ ڈاکٹر سکینہ نے دلرس بانو ہی لکھا ہے صفحہ ۲۷۵ پر فاضل مترجم لکھتے ہیں، "چاروں بھائیوں میں کون فتح وظفر کا منتخب ہوگا" یہ فقرہ بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ اردو کی ترقی کا زمانہ ہے۔ شاید میں ہی اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔

صفحہ ۲۹۲، صفحہ ۳۰۰، صفحہ ۳۰۴ اور صفحہ ۳۰۵ پر مآثر الامرا کو معاصر الامرا اور صفحہ ۳۰۱ پر حدیقۃ السلاطین کو حداُلقۃ السلاطین لکھا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۳۰۲ پر مرآۃ الاحمدی کی جگہ مرآتِ احمدی ہونا چاہیے۔ صفحہ ۳۰۴ پر تاریخ کی مشہور کتاب مخزن افغانی کو مخزن افاغنہ لکھا ہے۔ صفحہ ۳۰۲ پر برہان مآثر کو برہان معاصر لکھا ہے۔ صفحہ ۳۲۷ پر طبقاتِ شاہجہانی کو طبقاتِ شاہجہاں اور صفحہ ۳۳۳ پر مشوقی کو مصطفوی لکھا ہے۔ اسی طرح مشہور شاعر سعید لئے گیلانی کو سیدا ے گیلانی بنا دیا ہے۔

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں چند ماہ پیشتر ایک تبصرہ نگار نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ ادبیات کی طرف سے چھپنے والی ایک کتاب "تاریخ ادبیات پاک و ہند" میں بیشمار اغلاط کی نشاندہی کرنے کے بعد تحریر فرمایا تھا کہ اس کتاب کی طباعت پاکستان کے علمی حلقوں کے لئے باعثِ بدنامی ہے۔ راقم الحروف کی بھی یہی رائے ہے کہ تاریخ شاہجہاں کی طباعت ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب اور ان سے بھی بڑھ کر ترقیٔ اردو بورڈ کے لئے باعث بدنامی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقیٔ اردو بورڈ اردو کے تنزل کیلئے کوشاں ہے۔ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے سربراہ شری بی ایل گروور صاحب سے بھی میری استدعا ہے کہ وہ اس طرح کی ناقص اور گمراہ کن کتابوں کی طباعت کے لئے اردو بورڈ کی مالی اعانت نہ کریں، ہمارے طلبہ کا مذاق پہلے ہی بہت خراب ہو چکا ہے تاریخ شاہجہاں اور اس جیسی کتابیں پڑھ کر ان کا مذاق مزید خراب ہو جائے گا۔ ساتھ ہی تمام محققین کرام سے بھی درخواست ہے کہ وہ کسی اسکالر کے نام سے پہلے ڈاکٹر یا بعد میں پی ایچ ڈی لکھا دیکھ کر مرعوب نہ ہو جایا کریں۔

مشرقی علوم کا ایک قدیم کتب خانہ بمبئی میں

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ڈائرکٹر، انجمن اسلام
اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی (ہند)

میرے استاد محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی سابق ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی عروس البلاد بمبئی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے تھے کہ بمبئی اپنی گوناگوں دلچسپیاں اپنی بے شمار کششوں، اپنی لاتعداد خوبیوں اور اپنی ان گنت دلعزیزیوں کی وجہ سے نہ صرف ایک ارض رنگ و بو، ایک دنیائے حسن وجمال، ایک معمورۂ آرزو و تمنا بلکہ یہ وہ جنت ارضی ہے جہاں حسن اپنی تمام دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور یہ وہ فردوس خاکی ہے جہاں رعنائی اپنے تمام عشووں اور غمزوں کے ساتھ برسر اقتدار ہے۔ جوپاٹی، کنارہ، اپالو بندر، ملبار ہل، جوہو بیچ جیسے خوشگوار اور پرفضا مقامات کے ساتھ مختلف قوموں کی شہرۂ آفاق عبادت گاہیں اور تعلیمی ادارے، مختلف لسانی اقلیتوں کے بڑے بڑے کتبخانے اور دارالمطالعے، مختلف مذہبی فرقوں کے قابل قدر ادبی، ثقافتی اور سماجی انجمنیں اور بزمیں بھی ہیں۔ یہ وہ خوبیاں اور صفات ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہر بمبئی تجارتی مرکز ہونے کے باوجود مختلف مذہبوں، قوموں، تہذیبوں اور زبانوں کا ایک بڑا سنگم ہی نہیں بلکہ اشتراک عمل اور یک جہتی کا بہترین مظہر ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں کوکنی مسلمان طبقہ بمبئی میں ہر اعتبار سے پیش پیش تھا یہ وہ مسلم طبقہ تھا جنھوں نے فراوانئ دولت اور بحری تجارت کے ذریعے علم و ادب کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور باہر سے آئے ہوئے علماء، ادباء، شعراء وغیرہ کی حتی المقدور نہ صرف اعانت کی بلکہ ترتیب و تدوین اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں بھی

بڑا حصہ لیا اور اس طرح عربی وفارسی میں دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی عوامی بلکہ مثالی زبان اردو کی نشرواشاعت اور ترویج وترقی کی خاطر ہر ممکن کوشش کی اس ضمن میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک اردو کانفرنس میں اہل بمبئی کی اردو دوستی اور ادب نوازی کے سلسلہ میں مولوی نذیر احمد کے ایک شعر کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ یوں فرماتے ہیں ؎

خوش بمبئی تجھ پہ اردو کا سایا   تجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا۔

آج کی اس ادبی نشست میں بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانہ مدرسہ محمدیہ کا ایک ہلکا سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ یوں تو بمبئی میں کثرت سے کتبخانے موجود ہیں لیکن مشرقی علوم کے کتب خانوں میں ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی یونیورسٹی، کاما اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ، کریمی لائبریری اور کتب خانہ مدرسہ محمدیہ قابل ذکر ہی نہیں بلکہ لائق تعریف وتحسین ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی یونیورسٹی اور کاما اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کی لائبریریوں میں انگریزی، جرمن، فرانسیسی، سنسکرت، اوستا پہلوی، اور ہندوستان کی دیگر ریاستی زبانوں کی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی مطبوعہ کتب اور قلمی نسخے اور مخطوطے بڑی تعداد میں ملتے ہیں لیکن کریمی لائبریری اور کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جو آج کل جامع مسجد لائبریری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نادر اور نایاب مطبوعات اور مخطوطات کے بڑے علمی خزانے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں لائبریریاں مشرقی کتب کی بالعموم اور اسلامی علوم کی بالخصوص قابل ذکر علمی مخزن شمار کئے جاتے ہیں۔

کریمی لائبریری کا قیام ۱۸۹۸ء میں عمل میں آیا اور قاضی عبدالکریم صاحب نے لائبریری کی مطبوعہ فہرست کی "ابتدائیہ" میں اس لائبریری کی ضرورت کے تعلق سے اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ بمبئی میں اہل علم کثرت سے موجود ہیں بمقابلہ ان کے اسلامی کتب خانے بہت کم نظر آتے ہیں۔ کوئی ایسا وسیع ہال اور کافی کتابوں کی لائبریری نظر نہیں آتی تھی کہ جہاں فرصت کے وقت

ہمارے علم دوست دینی بھائی جمع ہوکر اپنے اپنے مذاق کے موافق کتابوں کے مطالعے سے دل ودماغ کو تروتازہ فرماتے اور دلخواہ رسالوں کی سیر سے اپنی معلومات بڑھاتے اس لئے مدتوں سے میرا خیال تھا کہ کسی وسیع جگہ پر ایک ایسی اسلامی لائبریری کھول جائے کہ ہمارے دینی بھائیوں کو مطالعہ کتب کا استفادہ حاصل ہوا کرے اس لئے میں نے عالی جناب آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی، صدر انجمن اسلام بمبئی کو درخواست لکھ کر بھیج دی کہ اگر انجمن اسلام ہائی اسکول کا ہال عنایت کیا جائے تو ہیں اس میں ایک کتب خانہ قائم کردوں۔ صاحب موصوف نے نہایت خوشی کے ساتھ میری رائے سے اتفاق کیا اور میری درخواست کو منظوری کا شرف بخشا اس میں سالہا سال کی تجسس اور تلاش سے کتابوں کا سرمایہ جمع کرکے اسی ہال میں ایک کتب خانہ بنام کریمی لائبریری انجمن اسلام بمبئی اپنے دلبند جگر پیوند میاں غلام محمد عرف دادامیاں کی یادگار میں جاری کیا۔"

کریمی لائبریری کے قائم ہونے کے بعد اہل بمبئی بالخصوص کوکنی مسلم طبقہ نے جامع مسجد سے ملحق مدرسۂ محمدیہ کے لئے ایک لائبریری کا منصوبہ تیار کیا اور ۱۹۰۳ء میں یعنی کریمی لائبریری کے قیام کے پانچ سال بعد کتب خانۂ مدرسۂ محمدیہ قائم ہوا۔ اس کتب خانہ کی تربیت وتزئین کے سلسلہ میں جامع مسجد بمبئی کے اس وقت کے قابل ناظر مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولوی صاحب ایک علمی شخصیت کے باوجود ایک اچھے اہل قلم تھے۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کتب خانہ کی فہرست جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے ۔۱۳۴۱ ہجری میں منظر عام پر آئی۔ اس مطبوعہ فہرست میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی زیر نگرانی حامد اللہ ندوی صاحب نے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کی۔ اس کتب خانے میں عربی اور فارسی کی بیشتر کتابیں ہیں اور اردو کی کتب نسبتاً کم ہیں۔ اکثر وبیشتر ایسی کتابیں موجود ہیں جن کا تعلق درس نظامیہ سے ہے اور جو عموماً عربی درسگاہوں کے نصابوں میں داخل ہوتی ہیں۔ اس کتبخانے کا ایک حصہ مطبوعہ اور دوسرا غیر مطبوعہ

مطبوعہ کتابوں میں کوئی ایک ہزار عربی، پانچ سو فارسی اور دو سو اردو ہیں لیکن غیر مطبوعہ کتابوں میں تقریباً ایک ہزار عربی، پانچ سو فارسی اور ایک سو اردو ہیں۔ اس طرح کتابوں کی تعداد تین ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

درس نظامیہ کے علاوہ اس کتب خانے میں قرآن، احادیث، فقہ، ادبیات اور دیگر علوم وفنون پر قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ قرآن کے نادر نسخوں میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ، احادیث میں ائمۂ اربعہ کے مسانید، فقہ میں خصوصاً امام ابن تیمیہ کے ملفوظات، اور ادبیات میں بہت سے شعراء اور ادبا کے دواوین اور تالیفات ملتی ہیں۔ عربی ادب اور اسلامی علوم کا سرمایہ کریمی لائبریری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہ کتب خانہ مشاورین بالعموم اور جناب جلال الدین نور اور جناب عبدالقادر جہانگیر کا بالخصوص سراپا سپاس گزار ہے کہ انھوں نے اپنی فراخدلی اور وسعت نظری کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ بہت ساری کتابیں اس کتب خانہ کو عنایت فرمائیں۔ اور قلمی نسخے اور مخطوطے چھان بین کے بعد اس کے قیمتی ذخیرے میں جمع کیں۔ دراصل اس کتب خانے کی اہمیت، عظمت اور مقبولیت کی بڑی وجہ مطبوعہ کتب نہیں ہیں بلکہ عربی، فارسی اور اردو کے نایاب اور نادر قلمی نسخے ہیں۔

اس ضمن میں مولانا محترم خواجہ حسن نظامی صاحب کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتب خانے کی اکثر نادر و نایاب مطبوعات و مخطوطات کو ملاحظہ فرمایا ہے اور اپنے روزنامچۂ سفر میں برسبیل تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ روزنامچہ خواجہ صاحب نے ۱۹۰۷ء میں بمبئی کے قیام کے دوران تیار کیا اور معتقدین کے اصرار پر ۱۹۱۲ء میں دہلی سے شائع کیا۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ "پنجشنبہ ۲۹ راگست ۱۹۰۷ء کو مولوی محمد یوسف کنکنکے کا آدمی بلانے آیا۔ گئے بہت اخلاق سے پیش آئے اور عجیب و غریب قلمی

کتابیں اور قرآن شریف دکھائے یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا قرآن شریف دیکھا اور ایک قرآن شریف خاص حضرت بہاءالدین نقشبند کے پڑھنے کا جس پیمان کی یادگار ثبت ہے۔ اس بعد یہی قرآن شریف بابر بادشاہ کے پاس آیا۔ اس کی تحریر بھی درج ہے۔ مولانا صاحب موصوف بڑے ذی علم اور نیک شوقین علم دوست مسلمان ہیں (ص۴۰)۔" اور سہ شنبہ ۱۰ ار ستمبر ۱۹۰۷ء کو دوسری بار کتب خانہ میں تشریف فرما ہوئے لکھتے ہیں کہ "کتب خانے میں کتابیں دیکھیں۔ اول ایک مکتوب حضرت خواجہ بزرگ کا خواجہ قطب صاحب کے نام دیکھا۔ پھر نشاط العشق عبداللہ بن حسن بن علی اکمل الجیلانی کا جو حضرت غوث الاعظم کے کلمات کی شرح میں ہے۔ دیکھا۔ یہ ذات باری سے مکالمہ ہے جو شاید عالم کشف میں حضرت غوث کو پیش آیا۔ حضرت غوث ذاتِ باری کو مخاطب کر کے کچھ سوال فرماتے ہیں۔ وہاں سے جواب ملتا ہے۔ یہ جواب انسان کی بلند شان ظاہر کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔ ایک رسالۂ ناطقیہ دیکھا جس میں تصوف اور اخلاق کو باتیں نطق میں بیان کیا ہے۔ دوران مطالعہ میں مولوی یوسف صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے ذریعے سے عجیب دفریب کتابیں دیکھنے میں آئیں۔ مثلاً عبدالواحد بلگرامی کی شرح کافیہ جو بالکل تصوف میں لکھی گئی ہے اور ایک کتاب جس کے ہر صفحے پر چار کتابیں مثلاً اگر یونہی مسلسل پڑھیں تو ایک کتاب اور پہلے حروف نیچے تک ملاتے جائیں تو دوسری کتاب، اور درمیانی حروف ملائیں تو تیسری کتاب اور آخری ملائیں تو چوتھی۔ اس طرح علیحدہ علیحدہ علوم میں چاروں کتابیں مرتب ہوجاتی ہیں عجیب کتاب ہے (ص ۴۸۔ ۴۹)۔"

حضرت خواجہ حسن نظامی کے ان کلمات سے زیر بحث کتب خانہ کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی قدر وقیمت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے ہندوستان اور بیرون ہند سے آنے والے علم وادب اس کتب خانے سے خاطر خواہ

استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج اس کتب خانہ کی حیثیت وہ نہیں رہی جو تین چوتھائی صدی پہلے اس کے قیام کے وقت تھی اول ۱۹۳۰ء میں بارش کی زیادتی کی وجہ سے سڑکوں کا پانی مسجد کے اندر تک چلا آیا کیونکہ مسجد نشیبی علاقہ میں واقع ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نایاب کتب اور نادر مخطوطات بہہ گئیں اور دوم منتظمین صاحبان کی لاعلمی بلکہ لاپرواہی کی وجہ سے کتب خانے کا بیشتر سرمایہ دیمک کی نذر ہوگیا۔ تاہم یہ تہی دامن نہیں ہے۔ اب بھی اس کی خاطرخواہ پرداخت اور نگہداشت کی گئی تو یہ قیمتی علمی سرمایہ اور ادبی ذخیرہ تشنگان علم اور طالبانِ ادب کو برابر سیراب کرتا رہے گا۔

مارچ ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ : بیس روپے

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہمِ قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبیِ عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحیِ الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ مرلیہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

بُرہان

جلد ۸۶، بابت جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ مطابق مارچ ۱۹۸۱ء، شمارہ ۳

نظرات

سخت افسوس ہے گزشتہ ماہ فروری کی ۲۵ تاریخ کو مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی بھی ۷۷ برس کی عمر میں اپنے وطن رامپور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون، مرحوم کی شہرت کا آغاز اول اول غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے ہوا، انھوں نے غالب کے دیوان اور خطوط پر جو تحقیقی مقالات لکھے، انھوں نے اردو زبان و ادب کے حلقہ میں دھوم مچا دی، وہ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں اور ان کے ادب کے نامور مبصر و محقق تھے،

وہ رامپور میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ رامپور پٹھانوں کی مشہور بستی ہے جو افغانستان کے مختلف قبیلوں سے منسوب ہیں، مرحوم کا خاندانی تعلق حاجی خیل قبیلہ سے تھا جو یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ ہے، ابتدائی تعلیم مطلع العلوم نامی ایک مقامی مدرسہ میں پائی۔ اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی سے عالم کا امتحان پاس کیا پھر اورنٹیل کالج، لاہور میں داخلہ لے کر اولاً مولوی فاضل کا اور اس کے بعد منشی فاضل کا امتحان پرائیوٹ طور پر دیا اور دونوں امتحانوں میں درجہ اول میں کامیاب ہوئے، رامپور واپس آ کر مدرسۂ عالیہ کی اونچی کلاس میں داخل ہوئے اور اس سے سند فراغ لی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چند دنوں ندوۃ العلماء کے سفیر رہے۔ اس سے بیزار ہو کر مستعفی ہوتے تو تجارت کرنے لگے، ناتجربہ کاری کے باعث اس میں گھاٹا ہوا تو دامن جھاڑ کر اس سے بھی الگ ہو گئے۔ آخر ۱۹۳۲ء میں رامپور کا مشہور زمانہ کتب خانہ جو تقسیم کے بعد رضا اسٹیٹ لائبریری کہلاتا ہے اس سے بحیثیت ناظم کے وابستہ ہوئے۔

کتب خانہ کے ساتھ ان کی یہ وابستگی زندگی کے آخری سانس یعنی کم وبیش نصف صدی تک باقی رہی۔ اس مدت میں انھوں نے کتب خانہ کی کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملازمت سے سبکدوشی کے عام قانون سے مستثنیٰ کر کے گورنمنٹ نے آرڈر دے دیا تھا کہ وہ تا حین حیات اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے، حقیقت یہ ہے کہ عرشی صاحب کو کتب خانہ کے ساتھ محبت نہیں عشق تھا، انھوں نے اپنی زندگی کی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں کتب خانہ کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھیں جس کی وجہ سے آج کتب خانہ مشرق ومغرب کے ارباب علم وتحقیق کے لیے کعبۂ آمال وامانی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندوستان کے لیے سرمایۂ افتخار بنا ہوا ہے، دوسری طرف کتب خانہ نے عرشی صاحب کو ایسا چمکایا اور جگمگایا کہ ان کا شمار عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ محققین ومبصرین میں ہونے لگا، ۱۹۶۵ء میں مرحوم کے اعزاز میں ایک ضخیم کتاب نذر عرشی کے نام سے شائع ہوئی تھی، جس کا اجراء صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کیا تھا، اس کتاب میں مرحوم کے خلف الرشید اکبر علی خاں صاحب نے نگارشاتِ عرشی کی جو طویل فہرست نقل کی ہے اگرچہ وہ جامع نہیں ہے تاہم اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا مرحوم نے عربی، فارسی اور اردو کے کیسے اور کتنے نادر مخطوطات کو اڈٹ کیا اور کتنے اہم موضوعات پر نہایت پُرمغز مقالات لکھ کر دادِ تحقیق دی۔ اس فہرست سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مولانا کی نگارشات کا ایک بڑا اور نہایت اہم حصہ وہ ہے جو اب تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا نے تحقیق وتنقید کا جو بلند معیار قائم کیا ہے وہ اس میدان کے نوجوان رہ نوردوں کے لیے ایک مینارۂ روشنی کا حکم رکھتا ہے۔"

مرحوم جس مرتبہ اور پایہ کے عالم وفاضل اور محقق تھے۔ بحیثیت ایک انسان کے بھی اعلیٰ مکارم

اخلاق وفضائل کے حامل تھے، نہایت خندہ جبین، شگفتہ رو، متواضع اور منکسر المزاج ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور محبت، ان کی فطرت بے لوث و بے غرض، طمع اور ریاء سے نفور۔ اخلاص و وفا کے پیکر! ہمہ شرافت اور مجسمہ وضعداری و مروت، قیام کلکتہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ راقم الحروف سخت بیمار ہوگیا۔ جب کچھ صحت ہوئی تو ڈاکٹروں نے کسی پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے ایک ماہ کی رخصت لی اور نینی تال چلا آیا۔ اور ایک ہوٹل میں مقیم ہوگیا۔ دلی سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور بھائی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی عیادت کے لیے نینی تال آئے۔ مولانا عرشی ماسکو (روس) گئے ہوئے تھے، جس دن وہ اس طویل سفر سے رامپور واپس آئے اور انھیں میری علالت کا حال معلوم ہوا اسی روز شام کو روانہ ہوکر نینی تال پہنچ گئے اور تین چار دن ہوٹل میں میرے ساتھ مقیم رہے۔ مولانا کے اس کرم بے غایت کی لذت آج تک دل کی امانت ہے، ایک میں نہیں سب دوستوں کے ساتھ ان کا معاملہ یہی تھا۔

دس بارہ برس سے دل کے بیمار تھے، دو مرتبہ شدید دورہ ہو چکا تھا۔ اس لیے رفتار و گفتار اور روزمرہ کے معمولات میں بڑے محتاط ہو گئے تھے، سفر بالکل ترک کر دیا تھا لیکن اس عالم میں بھی کتب خانہ کا کام پابندی سے کرتے رہے۔ چنانچہ کتب خانہ کے مخطوطات کی تشریحی فہرست جو اب تک متعدد جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اس کا ایک بڑا حصہ اسی زمانہ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ مولانا عرشی کا حادثۂ وفات علم و ادب کی دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی ایک عرصہ تک نہ ہو سکے گی، عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے صف اول کے مسلمان تھے۔ نماز روزہ کے پابند اور شعائر اسلام کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وبرّد مضجعہٗ

خلافت ارض کیلئے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت

قرآن حکیم کی نظر میں

۱۔ خلافت ارض اور علم اسماء

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

دنیا کا سب سے پہلا علم جو انسان کو دیا گیا — قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ ایزدی سے انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ "علم اسماء" (علم اشیائے عالم) تھا۔ انسان کو اس علم سے سرفراز کیے جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان مظاہر فطرت اور ان کے خواص سے بخوبی آگاہ ہو کر اُن سے فائدہ اٹھائے اور "خلافت ارض" کے تقاضوں کو پورا کرے نیز دنیا سے ظلم و عدوان کا استیصال کر کے عدل و انصاف قائم کرے۔

علم اشیائے عالم (مظاہر کائنات کا علم) اور "خلافت ارض" بظاہر دو الگ چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور ان میں باہم کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ....

.... مگر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں بہت گہرا ربط و تعلق ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں "خلافت" اور "تعلیم اسماء" کا بیان ساتھ ساتھ آیا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ لا فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ○ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ لا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لا وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ○

ترجمہ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو انھوں نے کہا کہ کیا تو ایسی ہستی کو بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی برپا کرے، حالانکہ ہم برابر تیری تسبیح وتقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اس نے آدم کو تمام اسماء (موجوداتِ عالم) کا علم دے دیا، پھر اُن تمام موجودات کو فرشتوں کے سامنے (مجسّم شکل میں) پیش کر کے کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (کہ ہمارے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟) تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام تو بتا دو، فرشتوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے ہم کو (ان چیزوں کا) کوئی علم نہیں سوائے اس کے جتنا کہ تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ یقیناً تو ہی ہمہ دان اور دانش مند ہے۔ (تب) ارشاد ہوا، اے آدم! اِن کو اُن چیزوں کے نام بتا دو، تو آدم نے ان کو تمام چیزوں کے نام (اسماء وخواص وغیرہ) بتا دیے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی زمین اور آسمانوں کی تمام پوشیدگیوں سے واقف ہوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم (اپنے دلوں میں) چھپاتے ہو۔ (البقرہ: ۳۰ - ۳۳)

ان آیات کریمہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" (اور اُس نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا، یا تمام نام بتا دیے) سے کون سا علم مراد ہے اور اس کا

اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے؟ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس علم کا خلافت ارض سے کیا تعلق ہے اور موجودہ دور میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ ان ہی دو بنیادی مسائل کی تنقیح اس وقت مطلوب ہے۔ باقی مسائل ضمناً آگئے ہیں۔

علم اسماء کیا ہے "اَلْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (تمام ناموں) سے مراد مفسرین کی تصریحات کے مطابق تمام موجودات عالم اور تمام مظاہر کائنات کے نام اور ان کے آثار و خواص کا علم ہے۔ یہ ایک بہت وسیع علم ہے جس کو ہم مختصر طور پر بطور ایک اصطلاح "علم اسماء" (مظاہر کائنات کا علم) کہہ سکتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اَسْمَآء: اسم کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کے "نام" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز جانی پہچانی جائے۔[1]

کسی چیز کا اسم اُس کی علامت ہوتی ہے۔ اسم الشئ علامته۔[2]

اسم کے اصل معنیٰ ہیں جس سے کسی شے کی ذات معلوم کی جاسکے۔ الاسم ما یعرف به ذات الشئ۔[3]

اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک کہ اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو۔ یہ تو لفظی معنی ہوئے۔ آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلومات اشیاء سے لی ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمّیات اور ذوات وخواص اشیاء کو شامل کیا ہے۔ اور اشیاء کے اسماء سے مراد اُن کے آثار و خواص کا علم لیا ہے۔ گویا سارے علوم تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کر دیے گئے ہیں۔[4]

۱؎ تفسیر ماجدی، ۱/۷، طبع ثانی، لکھنؤ۔

۲؎ القاموس المحیط

۳؎ مفردات راغب

۴؎ تفسیر ماجدی

مفسرین کے دلائل | یہ گویا تمام تفاسیر کا حاصل اور خلاصۂ مطالب ہے۔ مگر اس بیان کو مزید مدلل کرنے کی غرض سے اس سلسلے میں چند مستند تفسیروں سے کچھ مزید تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین آلوسی بغدادیؒ نے اپنی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ اس سے علوی وسفلی اور جوہری وعرضی ہر اعتبار سے تمام موجوداتِ عالم مراد ہیں۔

وقیل المراد بها أسماء ما کان وما یکون الی یوم القیٰمة، وعُزی الی ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنهما۔ وقیل اللغات، وقیل أسماء الملٰئکة، وقیل أسماء النجوم، وقال الحکیم الترمذی: أسماؤہ تعالیٰ، وقیل وقیل وقیل۔ والحق عندی ما علیه أهل اللّٰہ تعالیٰ۔ وهو الذی یقتضیه منصب الخلافة الذی علمت، وهو أنها أسماء الأشیاء علویة أوسفلیة جوهریة أو عرضیة۔ ویقال لها أسماء اللّٰہ تعالی عندهم باعتبار دلالتها علیه، وظهورہ فیها غیر متقید بها، ولهذا قالوا ان أسماء اللّٰہ تعالی غیر متناهیة۔

ترجمہ: اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کے نام ہیں جو واقع ہو چکی ہیں اور جو قیامت تک واقع ہونے والی ہیں۔ اور اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف کی گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زبانیں ہیں، ایک قول ہے کہ مراد فرشتوں کے نام ہیں، ایک قول ہے کہ مراد ستاروں کے نام ہیں۔ اور حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ اس سے مراد اسمائے الٰہی ہیں۔ اسی طرح کے اور اقوال بھی مروی ہیں۔ اور میرے نزدیک حق بات وہی ہے جس پر اہل اللہ قائم ہیں۔ اور وہ وہی چیز ہے جو منصب خلافت کی مقتضی ہے، اور وہ ہے: تمام چیزوں کے نام، خواہ وہ علوی ہوں یا سفلی، جوہری ہوں یا عرضی۔ اور انہی چیزوں کو دیگر اقوال کے مطابق اسماء اللہ بھی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں اُس (کے وجود وصفات) پر دلالت کر رہی ہیں،

اور یہ اسماء و صفات ان میں ظاہر ہو رہے ہیں، مگر انہی میں مقید نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اسمائے الٰہی بے پایاں ہیں[1]

تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رض کا ایک قول مروی ہے:

قال هي هذه الأسماء التي يتعارف بها الناس: انسان ودواب و سماء وأرض وسهل وبحر وخيل وحمار وأشباه ذلك من الأمم وغيرها:
یعنی فرمایا کہ یہ وہ نام ہیں جن سے لوگ متعارف ہیں، جیسے انسان، چوپائے، آسمان، زمین، میدان سمندر، گھوڑا، گدھا اور انہی جیسے دیگر انواع و اقسام[2]

وقال مجاهد: اسم كل دابة وكل طير وكل شيء. یعنی مجاھد نے کہا کہ اس سے مراد ہر چوپایہ، ہر پرندہ اور ہر چیز ہے[3]

والصحيح أنه علمه أسماء الأشياء كلها ذواتها وصفاتها وأفعالها كما قال ابن عباس حتى الفسوة والفسية: اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم ؑ کو تمام چیزوں کے نام، ان کے ذوات، ان کی صفات اور اُن کے افعال کا علم دے دیا تھا، جیسا کہ ابن عباس رض نے فرمایا ہے، یہاں تک کہ گوز اور چھسکی تک کا علم[4]

اس کے بعد علامہ ابن کثیر رح نے اس قول کی مزید تائید کے طور پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے (جو ایک طویل حدیث ہے اور اس کا وہ ٹکڑا ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے جس پر مدار استدلال ہے) اس حدیث کے مطابق لوگ قیامت کے

---

[1] تفسیر روح المعانی، ۱/۲۲۴
[2] تفسیر ابن کثیر، ۱/۷۳
[3] حوالۂ مذکور
[4] حوالہ مذکور

دن کی ہولناکیوں سے پریشان ہو کر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور اُن سے اس طرح مخاطب ہوں گے:

..... انت ابو الناس، خلقک اللہ بیدہ، واسجد لک ملائکتہ، وعلمک أسماء کل شیئ فاشفع لنا عند ربک ...... آپ تمام لوگوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ کو تمام فرشتوں سے سجدہ کرایا، اور آپ کو تمام چیزوں کے نام بتا دیے۔ پس آپ اپنے رب کے پاس ہماری سفارش کیجیے[1]

اس حدیث کی تائید میں ابن کثیر نے مسلم، نسائی اور ابن ماجہ کی روایت بھی پیش کی ہے پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

فدل ھذا علی أنہ علمہ أسماء جمیع المخلوقات: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء سکھا دیے تھے[2]

علامہ ابن کثیر رح نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ بہت مدلل ہے اور حدیث شریف کی تصریح کے بعد تو اس میں مزید کلام کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی بنا پر اکثر مفسرین نے آیت کریمہ کا یہی مفہوم مراد لیا ہے اور اس کے متعدد پہلوؤں پر بحث کی ہے۔

علامہ زمخشری اس آیت کی تحقیق میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر مضاف الیہ کو حذف کر کے مضاف کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے:

(وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا) أی أسماء المسمّیات، فحذف المضاف الیہ لکونہ معلوماً مدلولاً علیہ بذکر الأسماء لأن الاسم لابد لہ من مسمّی: ناموں سے مراد چیزوں کے نام ہیں۔ تو یہاں پر مضاف الیہ (مسمّیات) کو اسماء کے ذکر کی

---

[1] بخاری کتاب التفسیر
[2] تفسیر ابن کثیر ۱/۷۳

وجہ سے معلوم و مدلول ہونے کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسم کے لیے اس کا مسمی ہونا ضروری ہے[1]

پھر فرماتے ہیں:

فان قلت فما معنی تعلیمہ أسماء المسمیات؟ قلت: أراہ الاجناس التی خلقھا، وعلمہ أن ھذا اسمہ فرس، وھذا اسمہ بعیر، وھذا اسمہ کذا وھذا اسمہ کذا۔ وعلّمہ أحوالھا وما یتعلق بھا من المنافع الدینیۃ والدنیویۃ: اگر تم کہو کہ آدمؑ کو چیزوں کے نام سکھانے کے کیا معنی ہیں؟ تو میں کہوں گا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کردہ تمام اجناس آدمؑ کو دکھا دیں اور انھیں بتایا کہ یہ گھوڑا ہے، یہ اونٹ ہے اور یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں۔ اور پھر اس نے ان تمام چیزوں کے حالات، ان کے متعلقات اور دینی و دنیوی تمام منافع بھی بتا دیے[2]

علامہ جصاص رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس لفظ (الاسماء) کے عموم میں اس کے تمام معانی داخل سمجھے جائیں گے (اصول فقہ کی رُو سے):

یدل علی أنہ علم الأسماء کلھا لآدم۔ أعنی الاجناس بمعانیھا العموم اللفظ فی ذکر الأسماء: یہ بیان اس حقیقت پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو تمام اسماء سکھا دیے تھے۔ یعنی اس لفظ کے عموم کی بنا پر اپنے تمام معانی و مفہومات سمیت جنسیں (موجودات عالم کی) مراد ہیں[3]

پھر اس کے بعد بطور دلیل تحریر فرماتے ہیں:

وانہ علمہ ایاھا بمعانیھا اذلا فضیلۃ فی معرفۃ الأسماء دون المعانی، وھی دلالۃ علی شرف العلم وفضیلتہ: اور اس نے یہ تمام اسماء اپنے معانی

---

[1] تفسیر کشاف، ۱/۲۷۲، مطبوعہ ایران۔

[2] ایضاً۔

[3] احکام القرآن، ۱/۳۱۔

ومفہومات کے ساتھ سکھائے ہیں۔ کیونکہ بغیر معانی کے محض اسمار کی پہچان فضیلت کی کوئی بات نہیں ہے اور یہ چیز علم کے شرف اور اس کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے۔[1]

امام رازیؒ اس لفظ (الاسماء) کے اشتقاق اور اس کے لغوی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

من الناس من قال قوله وعلم أدم الأسماء كلها أي علمه صفات الأشياء ونعوتها وخواصها۔ والدليل عليه ان الاسم اشتقاقه امامن السمة أو من السمو۔ فان كان من السمة كان الاسم هو العلامة۔ وصفات الأشياء ونعوتها خواصها دالة على ماهياتها۔ فصح أن يكون المراد من الاسماء الصفات۔ وان كان من السمو فكذلك۔ لأن دليل الشئ كالمرتفع على ذلك الشئ۔ فان العلم بالدليل حاصل قبل العلم بالمدلول۔ فكان الدليل اسمى في الحقيقة۔ فثبت أنه لا امتناع في اللغة أن يكون المراد من الاسم الصفة:

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ارشاد باری " وعلم آدم الاسمآء کلھا " سے مراد چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور ان کے خواص ہیں۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اسم یا تو "سمۃ" سے مشتق ہوگا یا "سُمو" سے، اگر اس کو سمۃ سے مشتق قرار دیا جائے تو وہ "علامت" کے معنی میں ہوگا۔ چونکہ چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور اُن کے خواص اُن کی ماہیات پر دلالت کرتے ہیں اس لیے اشیاء سے مراد اُن کی صفتیں لینا درست ہوگا۔ اور اگر اس کو "سمو" سے مشتق قرار دیا جائے تب بھی اس سے یہی مراد ہوگا۔ کیونکہ کسی چیز کی دلیل اس چیز سے بلند ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دلیل کا علم مدلول سے پہلے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا دلیل حقیقتاً زیادہ بلند ہوئی اس طرح

---

[1] احکام القرآن، ۱/۳۱

ثابت ہوا کہ لغت کی رُو سے اسم سے مراد (اس کی) صفت لینا ممنوع نہیں ہے[۵۱]

علامہ رشید رضاؒ نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اس کا فلسفہ اس طرح سمجھایا ہے:

(وَعلم آدم الاسمآء کلها) أی أودع فی نفسه علم جمیع الأشیاء من غیر تحدید ولا تعیین، فالمراد بالأسماء المسمّیات عبّر عن المدلول و بالدلیل، لشدة الصلة بین المعنی واللفظ الموضوع له، وسرعة الانتقال من أحدهما الی الآخر، والعلم الحقیقی انما هو ادراك المعلومات أنفسها والألفاظ الدالة علیها تختلف باختلاف اللغات التی تجری بالمواضعة والاصطلاح فهی تتغیر و تختلف والمعنی لا تغییر فیه ولا اختلاف۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی ذات میں تمام چیزوں کا علم بے حد و بلا تعین ودیعت کر دیا، لہٰذا اسماء سے مراد مسمّیات ہیں۔ مدلول کو دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک تو لفظ موضوع لہ اور معنی کے درمیان قوی تعلق پایا جاتا ہے اور دوسرے ایک کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن فوراً دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ علم حقیقی دراصل بجائے خود معلومات کا ادراک کرنا ہے۔ اور وہ الفاظ جو ان معلومات پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں وہ موقع و محل اور اصطلاح کے اعتبار سے مختلف زبانوں میں مختلف و متغیر ہوتے ہیں، مگر نفس معنی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔[۵۲]

حاصل یہ کہ "اسماء" سے مراد ان کے مسمیات (اس عالم آب و گل کی تمام ہستیاں) اور ان کے تمام آثار و خواص، اپنے تمام معانی و مفہومات کے ساتھ ہیں۔ بعض مفسرین نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر تمام علوم و فنون کو بھی اس لفظ کے عموم میں داخل کر دیا ہے۔ مثلاً:

---

۵۱ تفسیر کبیر ۱/۲۵۸۔

۵۲ تفسیر المنار ۱/۲۶۲۔

قاضی بیضاوی تحریر فرماتے ہیں:

أ لهمه معرفة ذوات الأشياء وخواصها و اسمائها وأصول العلم وقوانين الصناعات وكيفية آلاتها: آدمؑ کو اس نے چیزوں کی ہستیاں، اُن کے خواص، ان کے نام، علم کے اصول، صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات کی کیفیت (غرض سب کچھ) الہام کر دیا[1]

شیخ طنطاوی جوہری نے لکھا ہے:

وألهمه المعرفة والاختراع وسائر الصناعات: اور اس نے (اشیاء کی) معرفت، ایجاد واختراع اور تمام صنعتیں الہام کر دیں[2]

پھر موصوف دوسری جگہ پر اس کی حکمت اور اس کا فلسفہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

سخرت له السموٰت والأرضون والبر والبحر والروض والقفر والجبل والسهل، فعلم الأسماء والصفات وخواص المخلوقات ليعرفها وتنفعه، ولذلك يقول (وعلم آدم الاسماء كلها) وحريّ بمن سخرت له الأفلاك وقامت بنظامها الأملاك ومن سجدت له العوالم سجود تسخير وقامت له تعظيما بالتدبير أن يتحلى بالعرفان ليفهمها وينطق باللغات وينظمها دعت حاجته الى العوالم نعرفها له مبدعه:

آدم علیہ السلام کے لیے ارض وسما، بر وبحر، چٹیل میدان ومرغزار، بیابان وکہسار سب مسخر کر دیے گئے۔ پس اس نے مخلوقات کے تمام اسماء اور خواص وصفات کا علم (آدمؑ کو) دے دیا، تاکہ وہ اُن اشیاء کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

---

[1] تفسیر بیضاوی۔

[2] تفسیر الجواہر ۱/۵۲۔

(اور اُس نے آدمؑ کو تمام اسماء کا علم دے دیا) اور اس کے لیے ــــ جس کی خاطر تمام افلاک واجرام مسخر کر دیے ہوں، تمام خطوں کو اپنے نظاموں کے ساتھ آراستہ کر دیا ہو، اور تمام عوالم اس کو تسخیری سجدہ کر کے اس کی تعظیم وتکریم پر کمربستہ ہو چکے ہوں ــــ بہتر و مناسب تھا کہ وہ ان سب کا عرفان حاصل کرلے تاکہ وہ اُن کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زبان میں اُن کا نطق کرے اور انھیں منظم کرے۔ اسی وجہ سے اس کو ان عوالم کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ لہٰذا خلاق عالم نے ان تمام چیزوں کا تعارف آدم سے بخوبی کرادیا۔[۹]

چند حیرت انگیز حقائق

یوں تو سورۂ بقرہ کی ان آیات میں ہمارے لیے بہت سے اسباق وبصائر ودیعت کر دیے گئے ہیں مگر اس موقع پر "خلافت ارض" کے تعلق سے صرف چند حقائق ومعارف کے بیان واستنباط پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ **مہمان سرائے ارض کی آراستگی** "الاسماء کلھا": اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق آدمؑ سے پہلے تمام اشیائے عالم اور کل انواع حیات کی تخلیق مکمل ہو گئی تھی۔ بالفاظ دیگر خلافت ارض کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کرۂ ارض ہر قسم کے سامان حیات اور متاع زندگی سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا تھا تاکہ مہمان سرائے عالم میں کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہو اور اس میں کوئی نقص یا عیب نہ رہ جائے، بلکہ وہ ہر حیثیت سے انسانی فطرت اور اس کی ضروریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہے۔ آیتِ کریمہ

۹؎ تفسیر الجواہر، جلد ۱، صفحہ ۵۳۔

" وَاٰتَاکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ " (اور اس نے وہ سب کچھ تم کو دے دیا جو تم نے یعنی تمہاری فطرت نے مانگا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

۲۔ علم اسماء اور علوم سائنس | انسان کو جو سب سے پہلا علم دیا گیا وہ علم اشیاء ہے۔ یعنی تمام موجودات عالم اور ان کی خصوصیات و امتیازات کا علم۔ اس کو ہم مختصر طور پر "علم اسماء" یا " علم مظاہر کائنات" کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس جن چیزوں سے بحث کرتی ہے وہ یہی موجوداتِ عالم ہیں، اور جو باتیں بیان کرتی ہے وہ یہی "اشیاء کے آثار و خواص" ہیں۔ طبیعیات (Physics) کیمیا (Chemistry)، حیاتیات (Biology)، ارضیات (Geology) اور فلکیات (Astronomy) وغیرہ تمام سائنسی علوم کا دائرہ مادی چیزوں (مسمّیات) اور اُن کے خصوصیات و امتیازات یا " آثار و خواص" (اسماء) ہی کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا " آدَمَ الْاَسْمَآءَ " کو علی وجہ البصیرت سمجھنا سائنسی علوم کے وقوف پر موقوف ہے۔ سائنس نام ہے دنیا میں پائی جانے والی مادی چیزوں اور اُن کی ساخت و پرداخت کے مطالعہ کا۔

۳۔ علم اسماء اور خلافت ارض | " تعلیم اسماء" کا تعلق " خلافت ارض" سے ہے۔ ان دونوں کا بیان زیر بحث آیات میں ساتھ ساتھ آیا ہے اور ان دونوں کا آپس میں بہت گہرا ربط و تعلق ہے، جیسا کہ علامہ طنطاوی جوہری کے اوپر نقل کردہ اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے، ظاہر ہے کہ انسان جب تک اشیائے عالم کی حقیقت، ان کی ساخت و پرداخت ان کے اعمال و وظائف اور ان کے طبعی و نوعی خصوصیات سے بخوبی واقف نہ ہو جائے ان سے مستفید نہیں ہو سکتا اور انھیں مسخر کر کے ان میں ودیعت شدہ قوتوں کو کام میں نہیں لا سکتا۔ جب وہ موجودات عالم سے مستفید نہیں ہوگا اور ان کی قوتوں کو زیر نہیں کرے گا تو اس کا خلیفہ ہونا ایک بے معنی بات ہوئی اور خلافت کے دیگر تمام مقاصد فوت ہو جائیں گے (تفصیل آگے آ رہی ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں

"پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدمؑ کے تفوّق کا ذکر کرکے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لیے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے، اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں ہے"[1]

شیخ طنطاوی جوہری تحریر فرماتے ہیں:

"فمن لم یقدر علی معرفۃ مراتب الأشیاء لا یستحق أن یکون خلیفۃ علیہا: جو ہستی اشیائے عالم کے مراتب سے ناواقف ہو وہ ان اشیاء پر خلیفہ ہونے کی مستحق نہیں ہو سکتی"[2]

۴۔ علم تکوین کی فضیلت و اہمیت | حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کا علم سکھانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، جو بنص قرآنی "معلم اول" ہے (وعلم آدم الأسماء کلہا)۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبے کے مطابق اولاد آدم میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اشیائے عالم اور ان کے خواص کا علم حاصل کریں۔ اس لحاظ سے اولاد آدم مظاہر کائنات کا علم بتدریج حاصل کرکے گویا "تعلیم الٰہی" کی تصدیق کر رہے ہیں۔

علامہ سید رشید رضا تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام باتیں بتا دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اللہ نے آدم کو یہ تمام باتیں خواہ ایک ہی وقت میں بتا دی ہوں یا متعدد مرتبہ بتائی ہوں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ علمی قوت ہر آدمی میں عام ہے۔ اس لیے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم کی اولاد "اشیائے کائنات" کو پہلے ہی دن جان لیں۔ انسانوں میں اس قوت کے اثبات کے لیے

---

[1] تفسیر معارف القرآن ۱/۱۷۸۔

[2] تفسیر الجواہر ۱/۵۲۔

اتنی ہی بات کافی ہے کہ ان کو بحث و استدلال کے ذریعہ اشیاء کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے"[له]

اس بیان کے مطابق آدمؑ اور اولادِ آدم کے علم میں بیّن فرق یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کا علم "لدنّی" تھا۔ یعنی وہ علم جو کسی کو بارگاہ الٰہی کی جانب سے بغیر کسب و مشقت عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اولاد آدم کا علم کسبی ہے۔ یعنی وہ علم جو محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ مگر اس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم میں روزِ ازل ہی میں رکھ دی تھی، تاکہ اولاد آدم اشیائے کائنات کی تسخیر کر کے خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

ان تصریحات سے علم کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ علم تکوین یا علم مظاہر کی اہمیت بھی۔ اس علمی برتری ہی کی بدولت انسان مسجودِ ملائکہ بنایا گیا۔

نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کا علم حاصل کرنا غیر اسلامی، یا ناجائز، یا غیر ضروری، یا بیکار و بے فائدہ نہیں بلکہ وہ عین "تعلیم الٰہی" اور منشائے خلافت کے مطابق ہے۔ اور اس سے اعراض و چشم پوشی، دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے نقصان عظیم کا باعث ہوگی، جیسا کہ تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کے فوراً بعد اس کو کائنات اور مظاہر کائنات کے علوم سے بہرہ ور کیا گیا۔

۵۔ علم اسماء اور علوم و فنون | تفسیر بیضاوی اور تفسیر الجواہر کی تصریحات کے مطابق (وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا) کی وسعت اور اس کے اقتضاء میں تمام علوم و فنون بھی داخل ہیں، جن کو موجودہ زبان میں سائنس اور ٹکنالوجی کہا جا سکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کیا ہے؟ مادّہ (Matter) اور اس کی قوتوں

له تفسیر المنار ۱/۲۶۳۔

(Energies) کی جانکاری اور اس سے استفادہ۔ مثلاً مختلف مصنوعات، کیمیائی مرکبات، انواع و اقسام کے سامان تمدن کی تیاری اور برق و بھاپ کو قابو میں کر کے مختلف میدانوں میں بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانا۔ چنانچہ آج دنیا میں جتنی بھی صنعتیں (Industries) کام کر رہی ہیں اور ان سے جو معاشی و تمدنی فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہ سب انہی علوم کی ترقی کی بدولت ہیں۔

"علم اسماء" یا دوسرے لفظوں میں سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کیے بغیر موجودہ دور میں خلافت ارض کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ (مزید تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

۶۔ **شرک اور مظاہر پرستی کا سدّباب** مادّہ پرست اور خدا بیزار لوگ کہتے ہیں کہ مذہب و اخلاق ماحول کی پیداوار ہیں۔ ابتداءً انسان نے جب جنم لیا تو اپنے چاروں طرف ایک عجیب و غریب ماحول اور خوفناک مظاہر دیکھ کر ڈر گیا ہوگا اور انھیں رام کرنے اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے انھیں پوجنا شروع کر دیا ہوگا۔ اس طرح بزعم خود مذہب کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ خدا کا تصور پیدا ہوا۔

بعض صحیح العقیدہ مسلمان بھی ان خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے) کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے"[۵]

مگر آدمؑ کو "علم اسماء" دیا جانا اس بات کی تردید ہے کہ دنیا کا پہلا انسان جہل و دہشت

---

[۵] مذہب اور سائنس، ص ۳۹، از مولوی عبدالحق، مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء۔

کے تاریک اور ہیبتناک ماحول میں نہیں بلکہ علم و معرفت کے اجالے اور تیز روشنی میں نمودار ہوا، اس کے ایک ہاتھ میں "علم اسماء" کی مارچ تھمادی گئی تو دوسرے ہاتھ میں "تسخیر اشیاء" کی رائفل دے دی گئی تاکہ وہ ان دونوں کی مدد سے خلافت کے میدان کو سر کرے۔

غرض آدم کو ابتدا ہی میں تمام اشیاء کا علم دے دینے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ ان مظاہر سے کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ کرے۔ گویا کہ ہر چیز کا تعارف شروع ہی میں کراکے شرک اور مظاہر پرستی کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا، اور اعلان یہ کیا گیا تھا کہ یہ مظاہر انسان کے لیے دیوی دیوتا نہیں بلکہ سب اس کے خادم اور حاشیہ بردار ہیں۔ اور انسان کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ بجائے خالق کے ان مخلوقات کے آگے سر نیاز خم کرے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○ اور ہم نے آدم کی اولاد کو یقیناً عزت بخشی اور انھیں بر و بحر میں سواریاں عطا کیں، (خورد و نوش کی) عمدہ چیزوں سے انھیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انھیں کلی فضیلت بخشی (بنی اسرائیل ۷۰)

۷۔ نظریۂ ارتقاء کی تردید | مذکورہ بالا بحث سے یہ حقیقت بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کی تربیت بالکل خصوصی حیثیت سے اور ایک خاص ماحول میں عمل میں آئی ہے۔ اور یہ تمام باتیں نظریۂ ارتقاء کی بھی تردید کر رہی ہیں۔

نظریۂ ارتقاء پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن یہاں پر جو بنیادی حقیقت ثابت ہو رہی ہے صرف اس کا اظہار مقصود ہے۔ ارتقاء کی رو سے ——— چاہے وہ صحیح ہو یا غلط[1] ——— ایک نوع کو دوسری نوع تک بتدریج پہنچنے میں لاکھوں سال لگ

---

[1] ابھی حال ہی میں لندن سے ایک کتاب "قاموس نامعلومات" یا "لاعلمیوں کی لغت" (بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

جاتے ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے انسان جب لاکھوں سال میں بندر سے اپنے موجودہ روپ میں ظاہر ہوا تو کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے ظہور کے ساتھ ہی نطق و گویائی سے بھی متصف ہو جاتا اور تمام موجودات عالم اور ان کے خواص و تاثیرات سے بیک وقت واقفیت حاصل کر لیتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کو ہزاروں سال محنت کرنی پڑتی۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ انسان سب سے پہلے اشاروں کنایوں کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کرتا رہا ہوگا۔ نطق و گویائی اور لکھنا پڑھنا وغیرہ بہت بعد کی چیزیں ہوں گی، جو ترقی یافتہ دور کی نشانی ہیں۔

مگر ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی نطق و گویائی سے متصف کر کے قلم کے ذریعہ آپ کو علم عطا کرنا (اور تمام موجودات عالم کا علم دے دینا) اس بات کی کھلی تردید ہے کہ دنیا کا پہلا انسان اتفاقی طور پر یا "ارتقاء" کے نتیجے میں نہیں بلکہ تخلیق خصوصی کے طور پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ "خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" (اس نے

(بقیہ ص ۳) (The Encyclopedia of Ignorance) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں سائنس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ساٹھ مستند ماہرین نے بنظر غائر اپنے اپنے علم و فن کا جائزہ لے کر یہ دکھایا ہے کہ انسانی معلومات کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور طبیعی و حیاتیاتی علوم کے بہت سے ایسے اسرار ہیں جن کو انسان اب تک نہیں جان سکا۔ اس وقیع اور قابل قدر کتاب میں نظریۂ ارتقاء کی تردید میں بھی چند مضامین بڑے اچھے ہیں۔ اور ایک مضمون کا عنوان ہی "نظریۂ ارتقاء کے مغالطات" (Fallacies of Evolutionary Theory) ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان نام نہاد ارتقائی قوانین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا اور ان کو حقائق کا نام دینا سفسطہ اور مغالطہ سے زیادہ حیثیت نہیں۔

انسان کو پیدا کر کے بولنا سکھایا) میں اسی صداقت عظمیٰ کا اظہار موجود ہے کہ تخلیق انسان اور اس کی قوتِ بیانی کی تعلیم کے درمیان کسی قسم کا فصل یا انقطاع موجود نہیں ہے۔ یہ فائدہ یہاں پر اس لیے حاصل ہو رہا ہے کہ ان دونوں فقروں کے درمیان حرف عطف موجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں بیک وقت اور بلا انقطاع عمل میں آئی ہیں۔ سائنٹیفک نقطۂ نظر سے انسان کی تخلیق جس قدر حیرت انگیز ہے اس کی قوتِ گویائی اور اظہار بیان کی صلاحیت بھی اُسی قدر تحیّر خیز ہے۔ یہ دونوں چیزیں صفاتِ خداوندی کی مظہر ہیں۔ اس لیے انسان ان کی مکمل حقیقت کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

نیز انسان کو خلیفہ (ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی) قرار دیا جانا بھی نظریۂ ارتقاء کی تردید ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز آپ سے آپ ظہور میں آجائے اس پر شرعی و اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی ذمّہ داری عائد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس صورت میں اس کو کسی خالق و صانع اور مربی و منتظم کی قدرت اور منصوبہ بندی کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۸ — قوتِ گویائی اور تعلیم بالقلم | چونکہ اوپر کی بحث میں تخلیق انسان اور تعلیم بیان کا ذکر ضمناً بالکل مجمل طور پر آیا ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کچھ مزید روشنی ڈالی جائے اور قرآن حکیم کے دیگر مقامات کی روشنی میں اس اجمال کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ تاکہ تخلیق آدم کے بعد "تعلیم اسماء" تک جو درمیانی مدارج ہیں وہ بھی واضح ہو جائیں اور قرآن حکیم کے مختلف بیانات میں ترتیب و تطبیق بھی ہو جائے۔

چنانچہ دیگر مواقع پر مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد نہ صرف اس کو بولنا سکھایا بلکہ قلم کے ذریعہ اس کی تعلیم دی اور اس کو وہ سب کچھ بتا دیا جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۙ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ پڑھ اپنے

رب کے نام سے، جس نے تجھے پیدا کیا۔ (وہ ذات برتر) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ! تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جس کو وہ (پہلے سے) نہیں جانتا تھا۔ (علق ۱۔ ۵)

اور ایک دوسرے مقام پر اس اجمال کی تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کو بولنا سکھایا اور نطق وگویائی اور اظہار بیان کی تعلیم دی۔ پھر اس کے بعد مظاہر کائنات کی پہچان کرائی گئی۔ سب سے پہلے نطق وگویائی اور اظہار بیان عطا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مظاہر کائنات کے علم ومعرفت کو اپنی زبان میں ادا کرنے کے قابل بن جائے، جس کے بغیر علوم کی ترقی اور حجت واستدلال کا بازار گرم نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ سارے علوم اور تمام اسرار دلوں ہی میں دفن ہو جاتے اور ان کے باہر نکلنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۙ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝

رحمان وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا پھر اس کو گویائی سکھائی۔ (پھر اس کے بعد انسان کو یہ علم دیا کہ) آفتاب وماہتاب ایک حساب سے چلتے ہیں۔ اور (تمام) ستارے اور (تمام) درخت (تکوینی اعتبار سے) سجدہ ریز ہیں۔ اور آسمان کو اس نے اونچا کیا اور (اس میں) میزان رکھ دی (اور عرش سے فرش تک تمام موجودات کو یہ حکم دیا کہ کوئی اپنی) میزان (خدا کے مقرر کردہ ضابطہ) سے تجاوز نہ کرے (سورۂ رحمٰن۔ ۱ – ۸)

ان آیات میں بنیادی طور پر چار باتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ خدائے رحمان وہ ہے جس نے نوع انسانی کو قرآن کی تعلیم دی۔ اس قرآن کے ذریعہ وہ تمام اسرار کھولے جا رہے ہیں جن کو انسان اس سے پہلے نہیں جانتا تھا یا انھیں

فراموش کر چکا تھا۔

۲۔ انسان کو پیدا کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کو نطق وگویائی اور اظہار بیان کی قوت وصلاحیت عطا کی گئی۔ چنانچہ دنیا کا پہلا انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اشاروں کنایوں کی زبان کا محتاج نہیں تھا بلکہ صاف صاف قوتِ گویائی کی صفت سے متصف تھا۔

۳۔ اظہار بیان کے دو ہی طریقے ہیں جن کے ذریعہ دلیل واستدلال قائم کیا جاسکتا ہے یا جذبات واحساسات کا اظہار کیا جاسکتا ہے: (۱) نطق وگویائی (۲) کتابت۔ یہ دونوں طریقے انسان کو ابتدا ہی میں سکھا دیے گئے تاکہ وہ مظاہر کائنات سے جاہل نہ رہے بلکہ ان سے بخوبی تعارف حاصل کر کے ان کے اندر ودیعت شدہ فوائد سے بھی مستفید ہو اور دوسری طرف آنے والی نسلوں کو کائنات میں ان کی اصل پوزیشن سے بھی آگاہ کرتا رہے۔

۴۔ اسی بنا پر انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ مظاہر کائنات کا علم تھا۔ جیسا کہ ان آیات کریمہ "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کے فوراً بعد فرمایا "اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ الخ" یعنی اظہار بیان کی قوت سے متصف ہوتے ہی فوراً تمام مظاہر کائنات کا علم دے دیا۔ یہ آیات کریمہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا" کے اجمال کی بھی بخوبی تشریح وتفسیر کر رہی ہیں۔

اس لحاظ سے حضرت آدمؑ کو "علم اسماء" دیے جانے کی ترتیب یوں ہوئی:

(۱) سب سے پہلے انھیں بولنا سکھایا (۲) پھر قلم کے ذریعہ انھیں تعلیم دی (۳) پھر اشیائے کائنات کا علم سکھایا۔

سورۂ رحمان میں غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس علم کے عطا کیے جانے کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کی توضیح وتفصیل نیز شرک اور دیگر فکری گمراہیوں کی تردید ہے۔ یہ مقصد مظاہر کائنات کے صحیح اور مفصل علم کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی وجہ سے انسان کو سب سے پہلے مظاہر کائنات کا علم دیا گیا تاکہ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے اپنے خالق و معبود کو فراموش نہ کر بیٹھے۔

برسبیل تذکرہ سورۂ رحمان میں انسان کے آغاز و انجام کی تفصیلات اور ربوبیت کی کرشمہ سازیوں کا بیان انسان کی عبرت و بصیرت کے لیے ایک عجیب و غریب اور اعجازی انداز میں مرقوم ہے اور اس میں ترغیب و ترہیب کے دونوں فطری طریقوں سے کام لیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کا ایک صحیح اور بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی کسی مجمل آیت یا کسی مبہم مقام کی تشریح اُسی کی دیگر مفصل آیات و مقامات سے کی جائے۔ اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔ اس اصول کے مطابق نہ صرف مبہم آیت کریمہ کی بخوبی توضیح ہوتی ہے بلکہ متعلقہ تمام آیات بھی باہم مربوط اور معنی خیز بن جاتی ہیں۔ جس کے باعث قرآن کے ابہامات واضح اور اس کے اسرار و معارف کھلتے چلے جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ پورا واقعہ عالم غیب کا ہے اور اس وقت کا جب کہ ابھی انسانِ اوّل کا ہماری دنیا میں ہبوط نہیں ہوا تھا اور نہ سلسلۂ رسالت ہی جاری ہوا تھا۔ لہٰذا اس کی تحقیق عالم شہود میں کیوں کر ہو سکتی ہے! مگر اس واقعہ سے مقصود انسان کی فضیلت اور اس کے شرف کا اظہار ہے۔ (باقی آئندہ)

فلسفۂ حدودِ اسلامی پر ایک نظر

جناب شاہد علی صاحب عباسی۔ ایم۔اے (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ عثمانیہ۔

حدود[1] اسلامی کے نفاذ سے متعلق متعدد نقاط نظر سامنے آئے ہیں جن میں رحم ودیعت کردہ قدرت عام ہے گو اس کے بھی درجات ہیں، ان میں سے بعض اہم درج ذیل ہیں :

(ا) مادیت کی وبا سے متاثر افراد کا احتجاج
(ب) مفکرین کا انسانی بنیادوں پر احتجاج
(ج) مفکرین کا عقلی بنیادوں پر احتجاج
(د) مادیت سے متاثرہ تعلیم یافتہ ضعیف الایمان مسلمان کی نفی حدود یا تدریجی نفی حدود
(ہ) مادیت سے کم متاثرہ، کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ضعیف الایمان مسلمان کا تقلیدی اثباتِ حدود یا سکوت۔

---

[1] الحد لغۃ ھو المنع ومنہ الحداد للبواب وفی الشریعۃ ھو العقوبۃ المقدرۃ حقاً للہ تعالیٰ (الہدایہ مع الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ لابی الحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی ملقب بہ برہان الدین۔ کتب خانہ رشیدیہ۔ دہلی۔ غ۔م۔ ج ۲ ص ۴۸۶ ــ آگے رمز ہدایہ)

(و) مادیت سے کم متاثرہ، کم تعلیم یافتہ یا تعلیم یافتہ اوسط الایمان مسلمان کا دفاعی یا سادہ اثباتِ حدود

(ز) مادیت سے برگشتہ، زمانے کے تقاضوں سے بخوبی واقف، تعلیم یافتہ قوی الایمان کا دیگر مطالبوں کے ساتھ اثباتِ حدود

ان میں صحت پر آخر الذکر یعنی مادیت سے برگشتہ، زمانے کے تقاضوں سے بخوبی واقف، تعلیم یافتہ، قوی الایمان مسلمان ہیں جن کی نظر دیگر علل کے ساتھ علتِ عظمیٰ یعنی امرِ الٰہی پر بھی ہے، جہاں تک اول الذکر یعنی مادّیت سے متاثرہ افراد کا احتجاج ہے اگر وہ قانون الٰہی کی حقیقت پر کما حقہٗ غور کیے بغیر احتجاج کر رہے ہیں تو قانون الٰہی کے بے بنیاد انکار کے ساتھ قانون انسانی کا حوالہ بے معنی ہے، اور اگر قانون الٰہی پر کما حقہٗ غور کیا ہے تو ہمارے نزدیک ان کا احتجاج ایک اذیت ناک مذاق ہے۔ رہا ثانی الذکر یعنی مفکرین کا انسانی بنیادوں پر احتجاج تو ہم اس کا استقبال کرتے اور ان کو مزید دعوت فکر دیتے ہیں کیونکہ انسانی بنیاد کی بات کرنے والے ماقبل جرم، دوران جرم اور مابعد جرم مجرم اور معاشرہ کی داخلی اور خارجی کیفیات سے استغنا نہیں کر سکتے، انہی کے ذیل میں ہم رابع الذکر اور سادس الذکر حضرات سے بھی بطور خاص غور و فکر کرنے کی درخواست کرتے ہیں کیونکہ اگر ایک طرف ایک متبع اسلام کا دفاعی اثبات حدود معذرتانہ احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف نفی حدود یا تدریجی نفی حدود کی طرف رجحان یا بالفاظ دیگر اصرار متأسف و متحیر کرتا ہے۔ ثالث الذکر حضرات سے ہم صرف اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ محض آپ ہی کی عقل معیار کیوں ہے؟ عقل یا تو مادّہ یا نفس کی تابع ہوگی یا اللہ کی تابع۔ اور ایک مسلمان اللہ کی تابع عقل کو عقل حقیقی اور مادہ یا نفس کی تابع عقل کو عقل مجازی سمجھتا ہے۔

سزا (عقاب، قصاص، تادیب ——— Punishment)

کے متعلق اثباتی و انکاری کئی نظریات[1] سامنے آئے ہیں:

اثباتی (۱) آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت (Lex Talionis

(۲) دوسرے لوگوں کو عبرت ہوتی ہے اور وہ ارتکاب جرم سے رکتے ہیں۔

(۳) توازن اجتماعی کی تجدید یا از سر نو قیام۔

(۴) مجرم کی اصلاح۔

انکاری (۵) فرد کو تنہا کرسکتی ہے۔

(۶) اپنا رویہ بدلنے کے بجائے وہ زیادہ محتاط ہوسکتا اور گرفتاری سے بچنے کی زیادہ کوشش کرسکتا ہے۔

(۷) فرد میں عادتاً نئے اور غیر پسندیدہ رجحانات مثلاً خوف یا خود اعتمادی کی کمی پیدا کردیتی ہے۔

(۸) اپنے ساتھیوں ہیں بلکہ عوام میں بھی نسبتاً بلند حیثیت و منصب حاصل کرلیتا ہے۔

(۹) اصلاح کی کوشش تعمیری ہونی چاہیے جب کہ سزائے جسمانی اس کے خلاف ہے، حقیقتاً قوت کا استعمال مجرم کو اپنا رویہ رضاکارانہ بدلنے سے روک دیتا ہے۔

اثباتی نظریات میں رابع الذکر یعنی مجرم کی اصلاح بذریعہ سزا کوئی کلیہ نہیں، یہ انہی کے حق میں معتبر ہے جن پر عموماً غلبۂ خیر ہو، جو نفس کے عارضی دباؤ کو برداشت نہ کر پائے ہوں اور دانستہ یا نادانستہ جرم کے مرتکب ہوگئے ہوں۔ انکاری نظریات کی بنیاد مجرم اور معاشرہ کی مفروضہ بے تعلقی اور باہمی نفرت و تناؤ پر قائم ہے لیکن اسلام فرد کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

---

[1] "Sociology of Deviant Behaviour" by B. Marshall Clinard. Pub. Holt, Rinehart and Winston, Inc., Third Edition, 1968. PP. 200-201

معاشرہ کو تاکید ہے کہ تائب سے نہ تحقیرانہ برتاؤ کرے نہ اس کو تاب عنہ جرم پر عار دلائے بلکہ ایک بازیافتہ بھائی کی طرح اس کو سینہ سے لگالے، تاریخ اسلام اس کے متعدد عملی ثبوت رکھتی ہے جو بتاتے ہیں کہ یہ بات نہ محال ہے نہ مستبعد۔ آخرالذکر نظریہ مغرب میں بکثرت شائع ہے اور مغرب ہی کے ایک فاضل کے بیان[۵۱] کے مطابق قانون کی مخالفت کسی نہ کسی تشکل میں روزافزوں نظر آتی ہے اور اس کے اشارے موجود ہیں کہ یہ مطلع کردہ جرائم سے بدرجہا زیادہ پھیل گئی ہے۔

اب آئیے اختلافِ فکر و آراء کی طرف:

ہر شخص کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے جس کے پیچھے ذہنی سطح کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور پیشہ واری وطبقاتی اختلاف بھی، اختلافِ حالات وطبائع بھی ہو سکتا ہے اور اختلافِ تجربات بھی، چنانچہ جرم کی سزا ہی کے متعلق اگر ایک سوالنامہ مرتب کرکے مجرمین، متاثرین، غیر متاثرین، پولیس، عدالت، ماہرین قانون، ماہرین نفسیات، ماہرین سماجیات ماہرین جرمیات وغیرہم سے جوابات مانگے جائیں تو یہ چیز واضح ہو جائے گی۔ اب ایک عامی اس الجھن میں پڑ سکتا ہے کہ ناپختہ و پختہ ذہنوں کے کثیر التعداد متضاد و متغیر مطالبات کس متحدہ دلیل کے تحت قبول کرے! اور اس کی یہ الجھن بجا ہے۔

سرمایہ دار و اشتراکی ممالک کے رجحانات

سرمایہ دار ممالک کو فرد کی تقدیس میں غلو ہے تو اشتراکی ممالک کو ریاست و اجتماع کے احترام کا جنون، گروہ اوّل قوت محرکہ (DYNAMIC ENERGY) کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے تو گروہ ثانی اقتصادی و معاشی بدحالی کو۔

سرمایہ دار ممالک میں جرائم سے متعلق قوانین نے متعدد کروٹیں بدلی ہیں، رجحان یہ ہے کہ آدمی کو ہر کام کی اجازت ہونی چاہیے جب تک کہ وہ جبر و تشدد اور دھوکا دہی سے خالی ہو،

---

[۵۱] ایضاً۔ pp. 215-217

بالخصوص اخلاقی نظریات چونکہ فرد واجتماع سے متعلق ہیں قانون کی حدود سے خارج ہیں، قانون کا دائرۂ عمل جتنا سکڑتا جارہا ہے ممنوعہ افعال کی شرح بڑھتی جارہی ہے اور قوت کا ہمہ جہت انحطاط رفتہ رفتہ قوی ہوتا جارہا ہے۔ انسان کے جذبۂ آزادی کو بھڑکا کر حدود متعین کرنے یا قیود لگانے کی کوشش نفس انسانی کی حقیقت سے ٹکراؤ اور مجرم کے افعال کی ذمہ داری صرف بگڑے ہوئے ماحول، نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض پر ڈال کر اسے برائے خود قابل ہمدردی تصور کرنا فرد کی تقدیس واحترام میں غلو ہی کا ایک پہلو ہے۔

اشتراکی ممالک میں بھی رجحان اخلاقی اقدار کے بے معنی ہونے کی طرف ہے،[1] تجب کہ فرد کے افعال واقوال سیاست واجتماع کی ہیئت ترکیبی اور ریاست کی کارکردگی پر خفیف درجہ میں بھی اثر انداز نہیں ہوتے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی۔ جرم کی بنیاد محض اقتصادی بدحالی تصور کرنے والے یہ لوگ اپنے ملک میں جرم کی موجودگی کی وجوہات پر غور نہیں کرتے۔

جرم کی جو قیمت معاشرہ کو پیسے کی شکل میں اور مجرمین کو ذاتی ناآسودگی کی شکل میں ادا کرنی پڑ رہی ہے غیر معمولی ہے گو اندازہ صرف اول الذکر ہی کا لگایا جاسکتا ہے یعنی بلحاظ قدر، برطانیہ میں سالانہ دو ہزار ملین پاؤنڈ (2000,000,000 £) کا اندازہ لگایا گیا ہے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس کا کم وبیش دس گنا۔[2]

---

[1] مارکس اور اس کے پیرو انگلز (ENGIL E.S) کو یقین تھا کہ پرولتاریوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اختلاف وتصادم کی کوئی گنجائش نہ ہوگی اس لیے سیاسی جبر کی نہ ضرورت ہوگی اور نہ امکان ہی باقی رہے گا نتیجتاً ریاست عضو معطل کی طرح خود بخود فنا ہو جائے گی لیکن کیا U.S.S.R. میں یہی ہوا؟

[2] "Crime and Personality" by H.J. EYSENCK. Pub. Routledge and Kegan Paul LTD. London and Henley, 3rd ed., 1977, p.14.

مغربی تحقیق نفسیات پر ایک نظر

مغربی محققین نفسیات کی خدمات سے انکار نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبۂ لاشعور کے پیچھے فرائڈ (المتوفی ۱۹۳۹ء) کا جبلت جنس کو، ایڈلر (المتوفی ۱۹۳۷ء) کا حب تفوق کو اور یونگ (المتوفی ۱۹۶۱ء) کا آرکی ٹائپ (Archetype) کو غیر معمولی قوت کے ساتھ کارفرما سمجھنا ان کے اپنے ذہنی فکر کے خاص ڈھانچہ اور تجرباتی تحقیق کے محدود و مخصوص میدان کا مرکب ہے۔ دراصل لاشعور میں متعدد منفی و مثبت جذبات ابلتے رہتے ہیں اور غلبہ و مغلوبیت کی جو شکلیں اندر ہی اندر بدلتی رہتی ہیں ان میں جبلت جنس اور حبّ تفوق نفسِ غیر مہذب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ محققین اگر صفۃ الصفوۃ، تذکرۃ الاولیاء، احیاء علوم الدین، رسالۂ قشیریہ، عوارف المعارف، کشف المحجوب، طبقات الکبریٰ، روض الریاحین وغیرہ کتب تصوف میں بکھرے ہوئے احوال واقوال صوفیہ کی تحلیل وتجزیہ کرتے تو نفس امّارہ (I.D) سے چل کر نفس لوّامہ (Super-Ego) ہی پر نہیں ٹھہر جاتے بلکہ نفوس ملہمہ و مطمئنہ وراضیہ ومرضیہ سے گذرتے ہوئے نفس کاملہ تک پہنچ جاتے۔ صوفیہ کے نظریات منتہائے حسن وجمال وکمال عبودیت ان کی محدود وتشنہ کاوش کو نئی وسعتیں اور نئی گہرائیاں دیتے لیکن...!

مغربی تہذیب کے تاریک گوشہ کو وسیع کرنے میں چونکہ ان محققین نفسیات کا (غالباً نادانستہ) ہاتھ رہا ہے ہم تحلیل نفسی میں سرزد ہوئی دو لغزشوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ مشتعل وغیر مشتعل نفس کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ جذبات و احساسات اشتعال سے پہلے معمولی قوت ارادی ہی سے قابو میں رکھے جا سکتے ہیں، اشتعال یا برانگیختگی کے بعد ان میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ پراگندگی کی شکل میں سامنے آتا ہے، اگر خواہش پوری ہو گئی تو اگرچہ ابتدائی درجہ میں سکون مل گیا لیکن اکثر نفس کو تقاضہ اور تسکین کا چسکہ لگ جاتا ہے، رفتہ رفتہ وقفہ کم سے کم ہونے لگتا ہے اور چونکہ ہر تقاضہ کی فوری تسکین دشوار ہے، ذہنی تناؤ شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ انسان دیوانگی کے

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں نتائج و عواقب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اب ان سوالات کے جوابات کون دے کہ بے لگام نفس کی حد کیسے متعین ہوگی؟ کون متعین کرے گا؟ اور آیا یہ حد اس کے لیے قابل قبول بھی ہوگی۔؟

(۲) خواہشات پر پابندی کو جنسی و دماغی الجھنوں کا ماخذ اور دماغی نشوونما میں حائل تصور کرنے میں سخت غلو کیا، نتیجتاً نہ صرف خود اعتمادی و قوت ارادی ہی متاثر ہوئے بلکہ کسبی مدارج نفوس بھی رسائی سے دور ہو گئے۔

اسلامی نظریۂ حدود (جسے ہم آگے پیش کرنے کی کوشش کریں گے) کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے مذکورالصدر تفصیل سے کافی مدد ملے گی، انشاء اللہ تعالیٰ!

خارجی و داخلی دباؤ | سوال یہ ہے کہ مجرم جرائم کی طرف متوجہ کیوں ہوا؟ آیا کسی خارجی دباؤ معاشی، سماجی، شخصی، اجتماعی وغیرہ) کے ردعمل کے طور پر یا داخلی انتشار و تقاضہ سے مجبور ہو کر؟

خارجی دباؤ پر غور کیجیے، معاشرہ نے جہاں کہیں قرآنی تعلیمات بالخصوص رعایت حقوق، عدل و انصاف، اتحاد و اتفاق اور اخوت باہمی پر عمل، معاملات میں سچائی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ سے عملاً اختلاف و انحراف کیا، فرد و اجتماع دونوں پر زد پڑی اور ردعمل جرم کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ اسلام کا احسان ہے کہ اس بگاڑ کو جو معاشرہ نے اپنی نادانی سے پیدا کر دیا تھا مزید پھیلنے سے روکنے یا سدھارنے کا طریقہ بتا دیا، فساد پر بند لگانا ظلم و بربریت نہیں بلکہ عین انسانیت ہے۔

داخلی انتشار و تقاضہ پر غور کیجیے: ذہن میں کوئی خیال آیا یا جذبات منتشر ہوئے۔ شعور ادھر متوجہ ہوا، ارادہ بنا، اعصاب کو حرکت ہوئی اور اگر کوئی رکاوٹ سامنے نہ ہوئی تو فعل عمل میں آیا، پھر فعل کا نتیجہ دو صورتوں میں برآمد ہوا: داخلی[۱] اور خارجی[۲]۔ داخلی یوں کہ اگر ردعمل قوی تھا تو شعور پھر متوجہ ہوا ورنہ تحت الشعور کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا۔

شعور کی توجہ کے ساتھ ساتھ طبیعت میں یا تو انشراح پیدا ہوا یا قبض و وحشت، انشراح کے ساتھ شعور کا رخ تعمیری سمت ہوا اور قبض و وحشت کے ساتھ تخریبی سمت۔ تعمیری ہونے کی صورت میں شعور نے ارتقار کی جانب قدم بڑھائے اور تخریبی ہونے کی صورت میں شعور ایک ہی جگہ الجھ کر رہ گیا اور احساس گناہ پیدا ہوا، اگر احساس گناہ میں ندامت پنہاں تھی تو قبض و وحشت کی چبھن کا سلسلہ چلا اور اس نے اس اذیت سے بچنے کی راہیں تلاش کرنی شروع کیں، اب اس کی دو صورتیں ہیں یا تو شعور دوسری طرف متوجہ رہے (مگر وقفہ وقفہ سے قبض و وحشت کی چبھن جاری رہے گی) یا کوئی راستہ سکون و انشراح کا نکل آئے —— توبہ یا سزا

اگر احساسِ گناہ میں بجائے ندامت کے خوف و ڈر رہا تو قبض و وحشت پیدا تو ہوئی لیکن ان کا تعلق اب خارجی اشیاء سے زیادہ قوی ہوگیا۔ (ذہنی ارتقاء میں خوف ایک خطرناک اور مؤثر رکاوٹ ہے اور اس کی موجودگی بعض صورتوں میں منفی اثرات کی وجہ بھی بن جاتی ہے) اب یا تو اس میں ضد اور ڈھٹائی پیدا ہوگی یا ایک ایسی اذیت کا سامنا ہوگا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ ضد اور ڈھٹائی اگر ہو تو شعوری اور ارادی طور پر وہ بار بار فعل کی طرف توجہ دے گا، آہستہ آہستہ خوف و ڈر ختم ہوگا، احساس گناہ ختم ہوگا اور احساسِ لذت کی پیدائش عمل میں آئے گی اور فعل میں پختگی پیدا ہوگی۔ کوئی غیر معمولی واقعہ یا جذبہ ہی اس صورت میں مؤثر ہوگا کیونکہ بعض وقت سزا تک ناکام ثابت ہوگی۔ رفتہ رفتہ کم ہونے والی اذیت اگر سزا مل جائے تو بڑی حد تک ختم ہو جائے گی ورنہ جب تک کوئی خارجی شئے فعل کو متصور کراتی رہے گی، اذیت جاری رہے گی۔

فعل کا نتیجہ اگر خارجی اور منفی ہوا تو متعدی ہوگا یا نہیں، اگر متعدی ہوا تو سزا ضروری ہوگی تاکہ منفی متعدی خارجی نہ شروع ہو، اگر متعدی نہ ہوا تو صلح و معافی کافی ہوئی یا سزا ضروری ہوئی۔ کیونکہ بعض وقت خارجی منفی غیر متعدی خارجی منفی متعدی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اسلامی احکام کے مقاصد | اصول فقہ کے ماہرین نے شریعت اسلامی کے مقاصد و مصالح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے[1]:

(۱) مقاصد ضروریہ یا ضروریات

(۲) مقاصد حاجیہ یا جلب مصالح

(۳) مقاصد کمالیہ یا تحسینیات

یہ مقاصد قرآن ہی سے ماخوذ ہیں، ان کے علاوہ قرآن میں تین مشکلات کے حل کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے:

(۱) کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ضعف

(۲) مسلمانوں پر کفار کا تسلط مع قتل و جراح و انواع ایذاء

(۳) اختلاف قلوب جو سبب اعظم ہے امت مسلمہ کے زوال کا

فی الحال موضوع بحث چونکہ مقاصد و مصالح سے متعلق ہے ہم انہی پر قدرے روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) مقاصدِ ضروریہ | وہ اعمال و تصرفات ہیں جن پر مندرجہ ذیل چھ امور کی حفاظت و صیانت موقوف ہے:

(ا) دین (ب) نفس (ج) عقل (د) نسل و نسب (ہ) مال (و) احترام نفس

یہ سب امور ایک منظم، پرامن اور صالح حیات کے لیے ناگزیر و لابدی ہیں ان میں سے کسی ایک کا فقدان بھی انفرادی و اجتماعی ہر دو شعبۂ حیات میں فساد کا موجب بنتا ہے چنانچہ حفظِ دین کے لیے عبادات مشروع ہوئیں اور ارتداد جرم ٹھہرا، حفظِ نفس کے لیے قصاص، دیات وغیرہ مقرر ہوئے، حفظ نسب و نسل کے لیے عدت لازمی قرار پائی اور زنا حرام، حفظِ عقل

---

[1] دیکھئے عامۃ کتب اصول فقہ۔

کے لیے شرب خمر و مسکرات ممنوع ہوئے، حفظ مال کے لیے غصب و سرقہ اور قمار و ربوا سے روکا گیا اور حفظِ احترام نفس کے لیے غیبت و عیب جوئی حرام ہوئے اور حد قذف واجب۔

چونکہ مقاصد ضروریہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ جرائم کا سدباب نہ ہو، عقوبات کا باب کھولا گیا اور حدود، قصاص و دیات اور تعزیر کی سزائیں مقرر ہوئیں کہ مقاصد ضروریہ کی تحصیل کے راستہ کی یہ رکاوٹیں دور ہوں۔

(۲) مقاصد حاجیہ | وہ اعمال و تصرفات ہیں جن کے بغیر مقاصد ضروریہ کی حفاظت ممکن تو ہے لیکن جن کی حاجت ان مقاصد ضروریہ کے حصول میں سہولت اور ضیق و تنگی اور نقصان و حرج کے دفعیہ کے لیے پیش آتی ہے، چنانچہ مصالح متبادلہ مباح ہوئے کہ ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائے جیسے کہ بیوع و اجارات، مساقات و مضاربت وغیرہا۔

(۳) مقاصد کمالیہ | وہ امور ہیں جن کے ترک کر دینے سے نظام زندگی میں کوئی فتور تو واقع نہیں ہوتا مگر مکارم اخلاق اور محاسنِ عادات کی کارفرمائیاں ان سے وابستہ ہیں مثلاً ترغیب عفو، معاشرتی و معاشی امور میں اعتدال، آداب گفتگو و طعام وغیرہ، قرآن و سنت ان کی تعلیمات سے مملو ہیں۔

یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ کسی شے کے اچھے ہونے کا فیصلہ محض فوائد کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا ورنہ ایک زانی دعویٰ کرے گا کہ اس کو شہوت کے بارے نجات ملی اور اضطراب کو تسکین، اس لیے زنا اچھی چیز ہے، سارق بھی سرقہ کے مالی فوائد گنائے گا، شرابی بھی سرور و مستی کی کیفیت سامنے لائے گا، قاذف بھی تسکین نفس اور لذت یابی کو فائدہ شمار کرے گا۔ قاطع طریق بھی کہے گا کہ ادنیٰ سی شجاعت سے مال کثیر ہاتھ لگا اور مہاتی زندگی کا لطف آیا سو الگ، رہا مقتول سو وہ بھی تو زندگی کی کشاکش اور شب و روز کے رنج و الم سے آزاد ہوا، وقس علی ہذا۔ غرض یہ کہ اگر فوائد ہی کو بنیاد قرار دے کر مضرات سے قطع نظر

کی جائے تو پھر کوئی جرم جرم نہیں، کوئی گناہ گناہ نہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ شارع نے جس چیز سے روکا وہ اس بنا پر کہ اس میں مفسدہ ضرر غالب ہے ورنہ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ نفع و ضرر اضافی امور ہیں۔

حدود و قصاص کے متخالف مسائل کا خلاصہ برائے تمیز درج کرتے ہیں:[1]

(۱) قاضی قصاص میں اپنے علم پر فیصلہ کر سکتا ہے جب کہ حدود میں نہیں کر سکتا۔

(۲) حدود میں وراثت جاری نہیں، قصاص میں ہے۔

(۳) قصاص کے برخلاف حدود میں عفو و درگزر صحیح نہیں اگرچہ حد قذف ہی ہو۔

(۴) تمادی ایام قتل کی شہادت کے مانع نہیں اور حدود میں سوائے حد قذف کے مانع ہے۔

(۵) گونگے کے اشارے اور تحریر سے برخلاف حدود کے قتل ثابت ہوتا ہے۔

(۶) سفارش حدود میں جائز نہیں اور قصاص میں جائز ہے۔

(۷) حدود سوائے حد قذف کے دعوی پر موقوف نہیں اور قصاص میں دعوی لابدی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ شریعتِ اسلامی میں عقوبات کا باب عموماً اور حدود کا باب خصوصاً ایک طرح سرجیکل وارڈ (Surgical ward) کی حیثیت رکھتا ہے جس سے کوئی انسانی آبادی مستغنی نہیں ہو سکتی۔

چند اشکالات | بعض حلقوں کی جانب سے چند اشکال سامنے آئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام منہاجِ نبوت پر بہت قلیل مدت تک قائم رہا۔!

(۲) صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے برائے خود جرائم سرزد ہوئے یعنی خیر القرون

---

[1] "الاشباہ والنظائر" (رمز "الاشباہ") للعلامہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم الحنفی، مصری مع شرحہ غمز عیون البصائر للعلامہ سید احمد الحموی، مطبعۃ العامرۃ، مصر ۱۲۹۰ھ، ج ۱۔

بھی جرائم سے مستثنیٰ نہیں!

(۳) قاضی اگر سلطانِ جائر نے مقرر کیا تو اس کے فیصلے قبول کرنا آیا صحیح بھی ہے؟

(۴) نفاذِ حدود معاشرہ کی اصلاحِ کامل سے پہلے ظلم ہے۔

(۵) سزائے[۱] رجم وقطعِ اعضاء وہ انتہائی صورتیں ہیں جو قرونِ اولیٰ میں حالات کے تحت جاری کی گئی تھیں، آج ان پر عمل پیرائی درست نہیں۔

آخر الذکر مسئلہ پر علمی رنگ میں بھی کلام کیا گیا ہے، اس موضوع پر ہماری کوشش ایک علیحدہ مقالہ کی شکل میں سامنے آئے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ دیگر اشکالات بھی تفصیل طلب ہیں لیکن فی الحال ہم سرسری جائزہ ہی لینے پر اکتفاء کرتے ہیں: (باقی آئندہ)

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: "واعلم انہ کان من شریعۃ من قبلنا القصاص فی القتل، والرجم فی الزنا، والقطع فی السرقۃ، فھذہ الثلاث کانت متوارثۃ فی اکثر الامم السماویۃ واطبق علیھا جماھیر الانبیاء والامم۔" (حجۃ اللہ البالغۃ" نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب کراچی۔ غیر مؤرخہ۔ (غ۔ م۔ رمز ہوگا) ج ۲ ص ۴۵۰۔)

وشوا بھارتی یونیورسٹی کے

فارسی، عربی اور اردو مخطوطات

مولانا عبدالوہاب بدر بستوی، سنٹرل لائبریری وشوا بھارتی یونیورسٹی (مغربی بنگال)

(۱)

تعارف شعبۂ اسلامیات | قلمی نسخہ جات سے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کا مختصر تعارف ناظرین کی معلومات کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہاں لائبریری میں فارسی، عربی اور اردو کتب کا ذخیرہ شعبۂ اسلامی قائم ہونے کی وجہ ہی سے شروع ہوا ہے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۶۸ء تک کی الگ الگ مطبوعہ سالانہ رپورٹ اور ماہانہ رسالہ (Visva Bharati news) میں تلاش کے بعد شعبۂ اسلامیات سے متعلق جس قدر مواد مل سکا انہی سے خاص خاص اطلاعات مختصراً ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی ایما سے ۱۹۲۷ء کی ابتدا میں چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے شعبۂ اسلامی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹر جی اور ممبروں میں سے ایک تو خود رابندر ناتھ ٹیگور کے لڑکے رتندر ناتھ ٹیگور بھی تھے[۱] منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نظام حیدر آباد نے جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک لاکھ روپے کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا تھا[۲] جس کے تحت کورٹ کی میٹنگ نے "نظام پروفیسر" کا ایک منصب

جاری کیا لیکن اس منصب پر کسی لائق اسکالر کو مقرر کرنے سے قبل روس کے انڈولوجسٹ پروفیسر ایل۔ بگرانوف[۴] کو عارضی طور پر فروری ۱۹۲۸ء میں عربی و فارسی کا لیکچرر مقرر کر دیا تھا اور پھر "نظام پروفیسر شپ" کے لیے باقاعدہ اعلان نامہ جاری کیا گیا۔ اس اعلان کے بموجب ہند اور بیرون ہند سے متعدد امیدواروں کی درخواستیں آئیں لیکن مذکورہ منصب کی سعادت ڈاکٹر جولیس[۴] جرمانوس (سابق پروفیسر اسلامیات، اور نٹیل انسٹی ٹیوٹ آف دی رائل ہنگرین یونیورسٹی، بوڈاپیسٹ) کے حصے میں آئی[۵]

چنانچہ پروفیسر موصوف نے اپریل ۱۹۲۹ء میں اپنے منصب کا چارج لیا[۶]۔ پھر چند ہی دنوں کے بعد مسٹر ایل بگرانوف کو بھی مستقل طور پر فارسی کی معلمی کے لیے پروانۂ تقرری دے دیا گیا[۷]

مسٹر ایل بگرانوف جون ۱۹۳۰ء[۸] اور پروفیسر جولیس جرمانوس مارچ ۱۹۳۲ء[۹] تک شعبہ کی خدمات کر کے اپنے اپنے وطن چلے گئے۔ انہی دونوں کے زمانے میں امرتسر کے مولانا ضیاء الدین[۱۰] صاحب ایم۔ اے بسلسلۂ تحقیق مطالعہ شعبۂ اسلامی میں موجود تھے جنھیں[۱۱] کالج کے ذمہ داروں نے اپریل ۱۹۳۲ء میں شعبہ کی معلمی کے لیے تقرری دے دی[۱۲]۔ یہ موصوف کچھ دنوں کی رخصت لے کر اپنے وطن امرتسر گئے جہاں بعارضۂ میعادی بخار جولائی ۱۹۳۶ء میں وفات ہو گئی[۱۳]

۱۹۳۵ء میں پروفیسر اجمل خاں مرحوم ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تشریف لائے[۱۴] اور تقریباً تین سال میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے مارچ ۱۹۳۸ء میں یہاں سے چلے گئے پھر اسی سال (۱۹۳۸ء) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری منتخب ہو گئے تھے[۱۵]

مولانا ضیاء الدین صاحب کی وفات کے بعد چند ماہ ڈیپارٹمنٹ میں کوئی بھی اسٹاف نہ تھا۔ پھر جنوری ۱۹۳۹ء میں کالج کی اعلیٰ کمیٹی نے بنگال ہی کے ایک صاحب علم مولانا آدم الدین ایم۔ اے کو شعبہ کی ذمہ داری تفویض کی اور اسی سال (۱۹۳۹ء میں) مزید تین اسکالروں کو ریسرچ کے لیے انتخاب کیا گیا، جن میں سے ایک مولانا ابوظفر صاحب ندوی مرحوم جو صرف ۳ ماہ (جنوری

تا اپریل) تھے اور دوسرے ظہیر احمد صابری صاحب جن کی مدت قیام دس ماہ (جولائی ۱۹۳۹ء
تا اپریل ۱۹۴۰ء) تھی اور تیسرے مسٹر بکرم جیت حسرت جنہوں نے دو برس تک قیام کر کے اپنی
ریسرچ مکمل کی[۱۶] اور پھر بعد میں یہیں موصوف کو فارسی کا لکچرر بنا دیا گیا۔

ظہیر احمد صابری کے چلے جانے کے بعد ان کی جگہ پر لاہور کے فضل محمود اثیری ایم۔ اے
بی۔ ٹی کو ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے لیا گیا۔[۱۷] انھوں نے بھی اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا اور پھر
یہیں معلمی کے منصب پر سرفراز کیے گئے۔ اثیری صاحب کی معلمی کے لیے تقرری مولانا آدم الدین
کی سبکدوشی کے بعد ہوئی تھی۔ اثیری صاحب کے زمانے میں بنگال ہی کے ایک اسکالر مسٹر
نِرود بھوشن رائے (Nirod Bhushan Roy)[۱۸] کا کسی نہ کسی طرح شعبہ اسلامیات
سے کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب اثیری صاحب ۱۹۵۲ء میں شعبہ سے الگ ہو کر اپنے
وطن چلے گئے تو مسٹر نرود بھوشن رائے ہی کو ڈیپارٹمنٹ کا مختار کل بنا دیا گیا۔[۱۹] یہ جولائی ۱۹۶۱ء
تک منصب ریڈر اور صدارتِ شعبہ پر جمے رہے۔ ان کے بعد اگست ۱۹۶۱ء میں بنگلہ زبان
کے ایک ادیب سید مجتبیٰ علی سے شعبہ کی صدارتی جگہ پُر کی گئی۔[۲۰] لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں حضرات
کے زمانے میں کسی دوسرے اسٹاف یا ریسرچ اسکالر کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہ نکل سکی
اور اس سے بھی زیادہ تلخ حقیقت یہ سامنے آئی کہ عربی، اردو اور فارسی کی تعلیمی رفتار کلی
طور پر بند ہو گئی۔ صرف نِرود بھوشن رائے کی ایک تحقیقی تصنیف ضرور منظرِ عام پر آ سکی۔

۱۹۶۶ء کی ابتدا میں ڈاکٹر عبدالحق انصاری (علیگ) شعبۂ فلسفہ میں بحیثیت
لکچرر تشریف لائے اور اسی سال شعبۂ اسلامی کے لیے "ریڈر منصب" کا اشتہار اخبار
میں شائع ہوا۔ شعبہ اسلامی کی خوش قسمتی تھی کہ مذکورہ منصب کے لیے موصوف کا انتخاب
ہو گیا۔[۲۲] ڈاکٹر انصاری صاحب شعبہ کا چارج لینے کے بعد ہی سے اس کی ترقی کے لیے
جدوجہد کرنے لگے چنانچہ ایک سال کے اندر ہی اندر ایک ریسرچ اسکالر ڈاکٹر حافظ محمد طاہر
علی صاحب کلکتوی کو تحقیقی کام کرنے کے لیے شعبہ اسلامی میں موقعہ فراہم ہو گیا۔ حافظ موصوف نے

شیخ محب اللہ الہ آبادی کی ایک کتاب "مناظر اخص الخواص" کی تصحیح و ترتیب پر ڈاکٹر انصاری[۲۳] صاحب کی نگرانی میں اپنی تحقیق مکمل کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انصاری صاحب کی مسلسل کوششوں کے طفیل عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ گو تعلیم کا معیار سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما ہی کے نہج پر ہے لیکن موصوف کی پیہم جد و جہد ہے کہ یہ تینوں زبانیں ریگولر کورس کی حیثیت اختیار کر لیں۔ بہر حال کوششیں بار آور ہو رہی ہیں چنانچہ فارسی کے لیے یہ کامیابی ہو چکی ہے اور ڈاکٹر حافظ[۲۴] محمد طاہر علی صاحب کو فارسی کا لکچرر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظم کے ساتھ ساتھ "نظام اسکالرشپ"، کی حیثیت سے ایک ریسرچ اسکالر (شریف ارشد مونگیری ایم۔ اے) (علیگ) بھی شعبۂ اسلامی میں تحقیقی مطالعہ میں مصروف ہیں۔

پچھلے صفحات میں شعبۂ اسلامیات سے متعلق جتنے بھی مستقل اسٹاف کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۲ء تک کے درمیانی دور میں بھی چند اہل علم کو عارضی طور پر شعبہ میں چند ماہ کے لیے وقتاً فوقتاً بحیثیت اسٹاف لیا جاتا رہا ہے لیکن ان چند ماہی اسٹاف کا ذکر کوئی اہمیت نہیں رکھتا البتہ دو عظیم شخصیتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک مسٹر شہید سہروردی جو اگست دسمبر ۱۹۳۲ء میں[۲۵] تھے۔ اور دوسرے ایران کے پروفیسر آغا پور داؤد غالباً تین ماہ تک ۱۹۳۳ء میں[۲۶] تھے۔ یہاں پر وفیسر داؤد کے ضمن میں یہ ایک اہم خبر قابل ذکر ہے کہ شاہ ایران "دشوا بھارتی" میں ایرانی تہذیب و ثقافت کا شعبہ کھولنا چاہتے تھے اور اس شعبہ کے لیے پروفیسر داؤد کا انتخاب کیا تھا لیکن پروفیسر موصوف اپنی چند معذوریوں کے تحت مذکورہ شعبہ سنبھالنے پر آمادہ نہ ہو سکے جس کی بنا پر یہ شعبہ یہاں عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔[۲۷]

ان معروضات کے بعد ایک نظر ان رقومات پر بھی ڈالتے چلیے جو نظام حیدر آباد نے مختلف اوقات میں شعبۂ اسلامیات اور تعمیر کوارٹر کے سلسلے میں عنایت فرمائی تھیں:

جولائی ۱۹۲۷ء ایک لاکھ روپے برائے اجراء شعبۂ اسلامیات [29]
انیس ہزار ۱۹۰۰۰ ,, بغرض تعمیر کوارٹر (برائے اسٹاف شعبۂ اسلامیات) [30]
اپریل ۱۹۵۲ء پندرہ ہزار ۱۵۰۰۰ ,, برائے اردو اور اسلامک اسٹڈیز [31]
جنوری ۱۹۵۳ء سات ہزار پانچسو ۷۵۰۰ ,, ایضاً [32]
پانچ ہزار ۵۰۰۰ ,, برائے کوارٹر مذکورہ بالا [33]

ان رقومات کے علاوہ پرلیڈنٹ فنڈ میں بھی نظام حیدرآباد اور دیگر مسلم اہل دل کے عطیات کی فہرست یہاں کی سالانہ رپورٹوں میں موجود ہے۔

ابتداء شعبۂ اسلامی سے آج تک کی یہ ایک مختصر تاریخ ہے معلّمین و محققین کے علمی کاموں کی تفصیل قصداً قلم انداز کی گئی ہے کیونکہ اس کی حیثیت ایک الگ مضمون کی ہے اور بہ پیشِ نظر عنوان سے کچھ غیر متعلق ہے۔ ویسے میرے پاس یہاں کے اسلامیات کے اسٹاف سے متعلق کافی مواد موجود ہے۔

لائبریری | وشوا بھارتی یونیورسٹی جب کالج کی شکل میں تھی اس زمانے میں اردو، فارسی اور عربی کتب شعبۂ اسلامیات ہی میں رہتی تھیں پھر یونیورسٹی کی مستقل "سنٹرل لائبریری" کے نام سے ایک الگ بلڈنگ میں منتقل ہو گئیں۔ [34]

عربی کی مطبوعہ کتب سب سے پہلے شاہ مصر کی جانب سے ۱۹۲۷ء میں بطور تحفہ دستیاب ہوئیں پھر ۱۹۲۹ء سے حیدرآباد دکن اور انجمن احمدیہ لاہور سے بھی ہدیۃً عربی، فارسی اور اردو کتب کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے علاوہ مذکورہ سالوں میں تینوں زبانوں کی کتابیں خریدی بھی گئیں۔

قلمی نسخہ جات کی فراہمی غالباً ۱۹۳۵ء میں مولانا ضیاء الدین صاحب امرتسری کے ذریعے ہوئی اور بعد میں دیگر محققین شعبۂ اسلامیات کی کوششوں سے ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اس کے بعد تو کہنا چاہیے کہ شعبہ پر کیفیتِ انجماد طاری رہی جس کے نتیجے میں مطبوعات و مخطوطات کا سلسلہ قطعی طور پر بند رہا۔ پھر ۱۹۶۶ء سے شعبہ متحرک ہوا تو کتب کی خریداری کا سلسلہ بھی

شروع ہوگیا، تحفۃً بھی کتابیں آنے لگیں اور چند قلمی نسخے بھی مہیا کیے گئے۔

یہاں کے ذخیرۂ مخطوطات میں فارسی نسخے زیادہ ہیں اس لیے اولاً انہی کے تعارف پہلے ہدیۂ ناظرین کیے جارہے ہیں۔ ان نسخوں کے سلسلے میں یہاں لائبریری میں دوسرے اداروں کی جو مختلف کٹلگ کتابیں موجود ہیں ان کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ کچھ نسخے ایسے ہیں جو ہندوستان کے دوسرے اداروں میں نہیں ہیں اس لیے ان کو "نایاب" تصور کرلیا گیا۔ اور کچھ ایسے ہیں جو کم جگہوں میں پائے جاتے ہیں تو انھیں "کمیاب" کے زمرے میں رکھا گیا اور کچھ وہ ہیں جو ہندوستان کے ہر ادارے میں تقریباً پائے جاتے ہیں اس لیے وہ "پایاب" خیال کیے گئے۔ اب اس تقسیم کے بعد "نایاب نسخوں سے تعارف کی ابتدا کی جارہی ہے۔ اس مختصر تعارف سے ممکن ہے ناظرین تشنگی محسوس کریں اور مزید معلومات کے متمنی ہوں۔ اس لیے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ طوالتِ مضمون کا خوف حائل ہے۔ پوری تفصیل کے لیے بصورت کتاب ہی اس کے اوراق متحمل ہو سکتے ہیں، رسالہ کے صفحات میں یہ سکت نہیں۔ اس اختصار سے تو صرف اسی قدر مقصد پیشِ نظر ہے کہ نسخے اور اس کے موضوعات سے متعلق اہلِ ذوق و تحقیق تک اطلاع پہنچ جائے اور بس۔ کمیاب اور پایاب نسخوں کے تعارفی سلسلے میں البتہ مزید تفصیل عرض کی جائے گی۔ نایاب نسخوں کے مصنفین کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لیے کوئی مواد کہیں سے بھی میسر نہیں آیا۔ جس کا افسوس ہے۔

کمیِ علم اور اپنے محدود مطالعے کا عذر پیش کرتے ہوئے سنجیدہ محققین بزرگوں اور احباب سے ملتجی ہوں کہ خامیوں سے مجھے آگاہی بخشیں گے۔

نایاب فارسی مخطوطات

مفید الطالبین | مرتب و کاتب محمد ناطق رضوی۔ سن کتابت مذکور نہیں۔ کتابت نیم خط شکستہ صفحات ۳۲۔

سلطان الولایت سید شاہ فضل احمد کابلی سرہندی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک بزرگ تھے جن کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے فرمودات کو مرتب موصوف نے قلم بند کیا ہے۔ مرتب موصوف ص۲ پر موضوعِ فرمودات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مختصر در بیان لطائف سنیہ و بعضی از خصائص و کمالات ایں سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ و طریقۂ متعالیہ مجددیہ از برائے متوسلان ایں خاندان عالیشان و منسلکان ایں مسلک قوی البرہان جمع نمودہ شد" الخ

نسخہ کے آخر میں مزید سولہ صفحات منسلک ہیں جن میں دعائی حزب البحر و دیگر قسم کی دعاؤں اور ان کے فوائد کا بیان ہے۔ لیکن اس حصے کی کتابت مختلف ہے۔

خلاصۃ الاسلام | مصنفہ، عبدالرحمٰن۔ کاتب اور تاریخِ کتابت مذکور نہیں۔ کتابت خط شکستہ صفحات ۱۴۹۔

یہ نسخہ عقائد اور مسائل فقہ پر مشتمل ہے جو عقائد نسفی، ترغیب الصلوٰۃ، کنز الدقائق اور فقہ کی دیگر کتب کی بنیاد پر تصنیف کیا گیا ہے۔ مضامین کی ترتیب ابواب اور فصول کے تحت ہے لیکن ان کی ترتیب و کتابت میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایمان، وضو اور نجاست کا بیان تو ابواب کے تحت ہے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے لیے ابواب کی قید نہیں جبکہ ان اہم ارکان اسلام کے مسائل کافی تشریح کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ مزید نقص یہ ہے کہ ابتدائی صفحات میں تو کہیں کہیں عنوانات سرخ روشنائی اور جلی حروف سے نمایاں کیے گئے لیکن بعد کے صفحات میں پھر کوئی قید نہیں رکھی گئی۔ غالباً یہ نقائص کاتب کی لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔

شمس العقائد | مصنفہ، محمد اسحٰق بن صدرالدین الحسینی القُبائی۔ کاتب اور تاریخِ کتابت کا کہیں ذکر نہیں۔ طرزِ کتابت نستعلیق اور جابجا خط شکستہ۔ صفحات ۱۱۰

یہ نسخہ فن کلام پر ہے جو مقدمہ، پانچ ابواب اور خاتمہ پر مشتمل تھا۔ نیز ابواب کے تحت فصلیں بھی تھیں لیکن پیش نظر نسخہ صرف باب چہارم تک ہے اور بقیہ ناقص۔ مقدمہ اور ابواب

کی ترتیب حسب ذیل ہے :۔

مقدمہ ——— محتوی بر دو بحث است : بحث اول در مناظرہ ونظر مناظر در مسائل دینیہ۔ بحث دوم در حقائق اشیاء۔

باب اول ——— یہ عنوان نمایاں طور پر مذکور نہیں۔ فصول بھی متعدد رہی ہونگی جن میں سے چند ہی نمایاں ہیں۔ اس باب کے تحت خدا کی قدرت وعلم اور اس کی دیگر صفات پر مفصل بحث موجود ہے۔

باب دوم ——— در ذکر نبی ودلی وآنچہ بدان تعلق دارد۔ باب سوم در احوالِ قبر و قیامت۔ باب چہارم در ایمان۔

ہفت دلبر (مثنوی) | مصنفہ، نامی ۳۵۔ سال کتابت ۱۱۰۷ھ بنگلہ۔ کتابت نیم نستعلیق۔ کاتب نصف اول مانک چند۔ اور نصف آخر کے کاتب دوسرے کوئی صاحب ہیں جن کے بارے میں مانک چند لکھتے ہیں :

"نصف یکی از آشنایانِ فقیر کہ نامش نوشتن باعث رنجیدن اوشان است لہذا موقوف نمود"

یہ مثنوی شاعر نے نظامی گنجوی کی "ہفت پیکر" کے مقابلے میں ترتیب دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہفت پیکر نظامی نامی گفت بر نام شاہ بہرامی
بیں کہ متن ہفت دلبر رعنا چہ نکو کردہ ام زخود انشاء
شکر للہ کہ ایں صحیفہ خوب آمدہ طرفہ دلکش ومحبوب
سربسر قصہ ہائے او رنگین ہر یکی آں زدیگری غیر ین"

پوری مثنوی "سات مجالس اور خاتمہ" پر مشتمل تھی لیکن پیش نظر نسخہ میں صرف "مجلس روز ششم" کے آخری ۵۷ اشعار، "مجلس روز ہفتم" کے ۴۵ اشعار اور "خاتمہ" کے اہم اشعار ہیں، باقی ناقص۔ شاعر نے یہ مثنوی شاہ ۳۶ ابوالمعالی کی طرف منسوب کی ہے۔ ملاحظہ ہو ذیل کا شعر:

"کرد اتمام آں بنام شہی   کو رست بر آسمان قدر ہی"

مذکورہ بالا اشعار مثنوی کے آخری عنوان "داستان در ختم ایں اوراق تمکین رقم بنام شاہ ابو المعالی" سے پیش کیے گئے ہیں۔

دیوان آثم | صاحب دیوان شاعر آثم (شاعر کا نام مذکور نہیں) تاریخ کتابت اور اسم کاتب کا نسخہ میں کہیں ذکر نہیں پایا گیا۔ صفحات ۳۲۴۔

کتابت بطرز شکستہ۔ نسخہ بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ صفحات پر جگہ جگہ کیڑوں نے اپنے دانتوں کی آزمائش کی ہے جن کی وجہ سے کہیں کہیں کے الفاظ لقمۂ کرمان بن چکے ہیں۔ یہ غزلیات کا دیوان ہے جو حروفِ تہجی کے طرز پر مرتب ہے۔ آخر کے پچیس[۲۵] صفحات رباعیات کے ہیں۔

بحرین (در صنعت عروض و قوافی) | مصنفہ افتخار الدین علی خاں شہرت ابن محمد یار بیگ خاں۔ کاتب سربلند خاں، متوطن موسیٰ نگر ضلع کانپور۔ تاریخ کتابت ۲۱ رجمادی الاول ۱۲۴۶ھ

صفحات ۱۴۰

موضوعِ نسخہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ نسخہ تین بڑے عنوانات اور ان کے تحت متعدد منقسم عنوانات پر حاوی ہے۔ نمونۃً صرف تینوں بڑے عنوانات حسب ذیل ہیں:

"بحر اول   دربیان عروض و آں محیط است بر شش جدول

بحر دوم   دربیان قافیہ منشعب بذہ نہر۔

خاتمہ   در غواصی بطلب درر غرر فوائد دیگر"

کاتب نے اس نسخہ "بحرین" کے ساتھ سید انشاء کی "دریائے لطافت" کا انتخاب فن عروض سے متعلق دس صفحات اور عبد الواسع ہانسوی کی "دستور شگرف" شامل کر کے ایک کتاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہاں صرف نایاب نسخوں کا تذکرہ مقصود ہے اس لیے "انتخاب دریای لطافت" اور "دستور شگرف" کا تعارف بعد میں کمیاب نسخوں کے ساتھ کیا جائے گا۔

انشاء مختصر العبارت | مصنفہ محمد شریف۔ کاتب سید امیر الدین۔ تاریخ کتابت مذکور نہیں۔
صفحات ۲۴۔

یہ نسخہ فن انشاء پر ہے جس میں کل بارہ[۱۲] خطوط ہیں جو خاندانی افراد، رشتہ داران، استادوں اور شاگردوں کے مابین لکھے گئے ہیں خطوط کے عنوانات کی ابتداء "نامہ" یا "عرضداشت" سے کی گئی ہے۔

خطوط | ابتدا، درمیان اور آخر ناقص ہے جس کی وجہ سے نسخہ کا مخصوص نام، اسم مصنف وکاتب اور تاریخ کتابت کا ذکر نہیں مل سکا۔ کتابت خط شکستہ۔ صفحات موجودہ ۳۶
کل اکیس[۲۱] خطوط ہیں اور عہد عالمگیری کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ شیواجی کے استیصال دارا شکوہ اور اس کے لڑکے کی گرفتاری و دیگر مہمات دکن اور آبہائے ستلج و بیاس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہر خط کی ابتداء عموماً لفظ "رساند" سے ہوتی ہے۔ غرضیکہ دور عالمگیری کی اکثر مہمات جنگی پر یہ خطوط نہایت اہم دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رقعات | مرتب اور تاریخ کتابت مذکور نہیں۔ کاتب منشی غریب اللہ۔ کتابت بخط شکستہ
صفحات ۳۶۔

ان رقعات کا مجموعہ بغیر دیباچہ کے ہے اس لیے رقعات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتی البتہ ان میں جن افراد کا ذکر ملتا ہے انہی سے عہد اور مقاصد رقعات کے سلسلے کا کچھ علم ہو سکتا ہے۔ ان میں باغیانہ سرگرمیوں، تحفہ اشیاء کی وصولیابی کی شکرگزاری اور کسی بچے کی ولادت پر مبارکبادی وغیرہ کا بیان پایا جاتا ہے۔ چند خاص خاص نام جن کو رقعات میں خطاب کیا گیاہے وہ یہ ہیں :

"برخوردار محمد مراد۔ دیوان صاحب۔ لالہ پرتاب نرائن۔ خان صاحب۔ رحمت علی بیگ۔ مرزا صاحب۔ پیر مرشد حقیقی۔ برادر عزیز حاجی عبدالعزیز۔ آقا محمد زماں۔ کفایت اللہ بیگ۔ میر محمد زمان۔ کشن چند۔ محمد کامل۔ بابا جان کلب علی خاں وغیرہ۔"

خطوط و جوابات[1] | ٹائٹل، اسم مرتب و کاتب اور تاریخ کتابت کا ذکر نہیں مل سکا کیوں کہ نسخہ ابتدا، درمیان اور آخر سے ناقص ہے۔ کتابت نیم نستعلیق۔ موجودہ صفحات ۴۶۔

جتنے بھی خطوط ہیں ان میں کسی بھی مخاطب کا ذکر نہیں ملتا۔ اکثر و بیشتر خطوط تہنیت کے ہیں۔ چند مخصوص عنوانات ملاحظہ ہوں:

"در جواب بطبقۂ اعلیٰ از منجمین نویسند۔ بطبقۂ اوسط از منجمین نویسند۔ در جواب بطبقہ اوسط از منجمین نویسند۔ در تہنیت تسخیر ملکی۔ در تہنیت امارت و حکومت۔ در تہنیت صدارت و وزارت۔ در تہنیت قضاۃ۔ در تہنیت قدوم سلاطین" وغیرہ۔

کچھ عنوانات صرف "نوع دیگر" کے ساتھ معنون ہیں لیکن ان کے تحت مضامین خطوط نہیں بلکہ القاب و خطابات ہی تک محدود ہیں۔

آئین و ضوابط | اول، آخر اور درمیانی صفحات کہیں کہیں ناقص ہیں جن کی بنا پر تصنیف کے مخصوص نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ اسم مصنف ہی کا کہیں اشارہ پایا جاتا ہے۔ آخر ناقص ہونے کی وجہ سے کاتب اور تاریخ کتابت کا نشان بھی مفقود ہے۔ کتابت نیم خط شکستہ۔ صفحات ۴۴۔

یہ نسخہ آئین حکومت در عہد نوابان بنگال پر مشتمل ہے۔ مزید برآں چونکہ اس پورے عہد میں کچھ عرصہ تک صوبہ بہار و اڑیسہ بھی نوابان بنگال کے ماتحت تھا اس لیے ضمناً کچھ ضوابط صوبہ بہار اور اڑیسہ سے متعلق بھی بیان کیے گئے ہیں۔

احکام کونسل درباب عدالت | کتابت خط شکستہ۔ صفحات ۱۵۔ آخر ناقص اور ابتدا میں بھی کوئی تمہید یا دیباچہ نہیں کہ جس کے توسط سے تصنیف، مصنف، کاتب اور تاریخ کتابت کا معمہ حل ہو سکے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوراق کسی کا حصہ ہیں۔ اصل عبارت جہاں سے شروع ہوتی ہے اسی صفحے کے اوپری حصے پر مذکورہ نام درج ہے۔

اس نسخہ میں کل ۳۷ احکام ہیں جن میں مختلف تنازعات اور عدالتوں کا ذکر ہے اور یہ وضاحت

کی گئی ہے کہ کونسا تنازعہ کس عدالت میں پیش کیا جانا چاہیے اور ان متنازعہ امور کے فیصلہ کرنے کے مجاز کس کس قسم کے حاکم ہو سکیں گے۔ وجہ تنازعات میں مالگذاری، وراثت، کسی مال پر ناجائز قبضہ، زنا، چوری، ڈکیتی اور فوجداری کا بیان مذکور ہے۔

صفحات پر متعدد جگہوں میں عدالتِ کلکتہ اور گورنر کا ذکر بھی موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کا ہندوستان میں غالباً جب تسلّط ہو چکا تھا اسی عہد میں نسخہ کی ترتیب ہوئی ہے۔

فنِ صرف | نسخہ مکمل ہے لیکن نام تصنیف و مصنف مذکور نہیں۔ کاتب ولایت علی محکمہ بولپور ضلع بیربھوم (مغربی بنگال) کتابت خوشخط۔ تاریخ کتابت درج نہیں صفحات ۸۰۔

اس کا دیباچہ صرف ایک شعر میں ہے جس کا پہلا مصرعہ حمدیہ اور دوسرا نعتیہ ہے قواعد عربی کا یہ نسخہ نظم و نثر کے لباس میں ملبوس ہے۔ شروع کے آٹھ اور آخر کے پانچ صفحات مسلسل بصورت نظم ہیں نیز درمیانی صفحات پر موقعہ بموقعہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے شروع کرنے سے قبل جلی خطوں میں "قال ابن الناظم" مذکور ہے۔ نسخہ میں پورے صرفی قواعد تو نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی ہیں وہ کافی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

نامعلوم الاسم | اول و آخر ناقص جس کی وجہ سے مصنف، کاتب اور تاریخ کتابت سے نظر آشنانہ ہو سکی۔ کتابت خوشخط۔ صفحات ۵۶

یہ نسخہ مختلف مسائل اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بصورت نظم مرتب ہے۔ چند حسب ذیل عنوانات سے موضوع نسخہ کا پتہ لگ سکتا ہے:

(۱) القطعۃ الاخری فی اسامی الشہور الفارسیہ (۲)

(۲) 〃 〃 〃 السنین 〃

(۳) 〃 〃 〃 〃 الترکیہ

(۴) 〃 〃 فی بیت القمر

(۵) القطعۃ الاخری فی اسامی السبعۃ السیارۃ بالعربیہ

(۶) فی اسامی النجوم السبعۃ الفارسیہ

(۷) القطعۃ فی حساب جمل

(۸) القطعۃ الاخری فی مسن الابل

بیشتر عنوانات صرف "القطعۃ الاخری" ہی کے ساتھ معنون ہیں اور اُن کے تحت مختلف بیانات ہیں۔ نسخہ کے آغاز اور آخر میں کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جن سے عربی فارسی لغت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ابتدا کا یہ ایک شعر ؎

مِنْ دعَنْ از الیٰ وحتّٰی تا اَیْنَ کو کَیْفَ چون اَم د اَوْ یا

ع ع ف ع ع ف ع ف ع ف ع ف

اسی طرح متعدد اشعار ہیں جن کے نیچے حروف ع اور ف سے عربی اور فارسی الفاظ کی نشاندہی مقصود ہے۔

طب | مصنف، تصنیف اور کاتب کے ناموں کا سراغ نہیں مل سکا۔ سال کتابت ۱۲۶۱ھ [۳۹]، بنگلہ صفحات ۱۹۲۔

اس قلمی کتاب کی خستگی اور کرم خوردگی کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی ورق کو ہاتھ لگانا چاہیں تو نہایت ہی درد انگیز فریاد نکلتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نسخہ فصل وار ۹۷ فصول پر مرتب ہے۔ ابتداء اور آخر میں اصل نسخہ کے علاوہ کچھ بے ترتیب بیانات کے صفحات بھی ہیں جن میں دعائیں، تعویذات، نقوش، فالنامہ غوث الثقلین، مناجات، اسم خواجہ حسن بصری، بوستان سعدی اور دیگر شعراء کے منتخب اشعار نیز دواؤں کے نسخہ جات مذکور ہیں اور ان میں سے دس صفحات بنگلہ زبان میں ہیں جو مختلف امراض و دواؤں کے نسخہ جات پر مشتمل ہیں۔

اصل نسخہ میں تین صفحات کا دیباچہ ہے اس کے بعد فصول کی مع عنوان فہرست ہے پھر اصل موضوع کا آغاز ہوتا ہے جس میں امراض اور ان کے نسخہ جات کی تفصیل ہے۔ امراض اور

ادویہ کے زیادہ تر نام ہندی اور جابجا بنگلہ زبان کے ہیں۔ کتاب کے ایک صفحہ کے حاشیہ پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بعض بعض نسخہ ہای ادویہ کتاب "طب قاسمی" سے لیے گئے ہیں۔

آیورویدک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اگر وہ کچھ فارسی زبان سے آشنا ہوں تو ان کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

نامعلوم الاسم تصنیف | مصنف، کاتب اور تاریخ کتابت درج نہیں۔ کتابت نیم نستعلیق۔ صفحات ۲۱۶۔

ابتدا، اور آخر ناقص لیکن جتنا بھی حصہ موجود ہے قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ اس کے مضامین آلِ محمد کی تعریف اور حمایت پر مشتمل ہیں نیز حضرت معاویہؓ اور یزید کے وہ کارنامے بھی مذکور ہیں جو آل محمد کے ساتھ پیش آئے۔ غرضیکہ یہ نسخہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔ گو کچھ واقعات ایسے مذکور ہیں جن کی صحت میں شک معلوم ہوتا ہے۔

بمتعلق علم نجوم | تصنیف، مصنف، کاتب اور تاریخ کتابت مذکور نہیں۔ اول و آخر ناقص کتابت خوشخط۔ صفحات ۱۴۰

اس نسخہ میں مختلف عنوانات کے تحت علم نجوم سے متعلق کافی تفصیلات ہیں۔ نسخہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے لیکن فن نجوم ہندی ہے جس کی وجہ سے عبارات اور بنے ہوئے خاکوں و نقوش میں اکثر مقامات پر الفاظ ہندی کے استعمال کیے گئے ہیں۔ ذیل کے چند نمونوں سے کچھ وضاحت ہوسکے گی:

نمونۂ خاکہ "

حوتی حولالی لوئی لوا	تھکہ راس	امي اد امي اد بایي لوئی برکھہ

"

نمونۂ عنوانات "دانستن صاحب طالع یعنی سوامی دوازدہ بروج کہ راس باشد۔ دانستن شرف مکان ہفت ستارہ کہ در ہندوی اوچ گویند۔ دانستن جوبیا یعنی مکان کمتر ہفت کواکب کہ در ہندوی

بیج گویند۔ خاصیت پنجہرا مفصل ذیل۔ خاصیت حوک'' وغیرہ۔

مجموعہ | اس مجموعہ میں تین کتابیں اور کچھ دیگر متفرق اوراق ہیں لیکن ہر ایک کے اوراق الگ الگ ہونے کی وجہ سے اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں کہ بغیر کسی دیگر مکمل نسخہ سے تقابل کیے صحیح طور پر وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی ہر کتاب کے اوراق ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں سے صرف دو کتابوں کے نام نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں اور تیسری کتاب کا نام تو واضح نہیں ہے البتہ مقدمہ میں موضوع کی وضاحت پائی جاتی ہے۔ کتابوں کے الگ الگ نام ذیل میں دیے جاتے ہیں :

۱۔ کتاب در بیان علم نجوم، ۲۔ تحفۃ المجربات، ۳۔ چار پیر چہاردہ خانوادہ،
۴۔ متفرق اوراق۔

ان میں ۲/۳ کا نسخہ دوسری لائبریریوں میں بھی موجود ہے اس لیے اس کا تعارف بعد میں کیا نسخوں کے ساتھ کیا جائے گا۔ باقی تین کے بارے میں چند الفاظ حاضر ہیں۔

(۱) علم نجوم | اسم مصنف، تصنیف، کاتب اور تاریخ کتابت مذکور نہیں۔ کتابت نیم نستعلیق صفحات ۱۳۔ درمیانی اوراق ناقص۔ نسخہ متعدد ابواب کے ساتھ مرتب تھا لیکن پیش نظر نسخہ میں ابتداء سے مسلسل انیسویں اور صرف اڑتیسویں باب تک کے عنوانات اپنی تشریحات کے ساتھ موجود ہیں۔ مصنف حمد و صلوٰۃ کے بعد موضوع نسخہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"ایں کتاب در بیان علم نجوم جمع کردہ شدہ است تا اگر کسی را حاجت باشد از شناختن وقت و ساعت و طلوع و غروب و اوقات پنج نماز و رفتار ہفت ستارہ و دوازدہ بروج زائچہ طالع مولود کودکان کہ دریابد ایں کتاب را مطالعہ کند از پارسی و ہندوی بدانچہ علوم نجوم را حاجت است دریابد۔"

(۲) تحفۃ المجربات | مصنف خواجہ حکیم ثنائی، کاتب کا نام مذکور نہیں، کتابت خط شکستہ، صفحات ۹۳۔

صفحہ اول کے حاشیہ پر مصنفِ نسخہ کا نام "حکیم سنائی" بھی درج ہے۔ اس نام کے حرف س اور ث کی گتھی سلجھانے کے لیے متعدد کٹلاگ کی کتابوں کا سہارا لینا پڑا لیکن کہیں سے کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ "فہرست کتب خانہ آصفیہ سرکارِ عالی حیدرآباد کی جلد اول ۱۳۴۵ھ سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حکیم سنائی کے علاوہ ایک اور یہی نام (سنائی) عہد اکبر بادشاہ میں ملتا ہے لیکن کوئی تصنیف یا دیگر حالات کا کوئی تذکرہ نہیں۔ پھر نسخہ "تحفۃ المجربات" کے سلسلے میں بھی فہرست مذکور سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اصل مصنف کون ہوسکتا ہے؟ کیونکہ فہرست مذکور میں اس کتاب کے دو نسخے ملتے ہیں جن کے مصنف کا نام حکیم الیاس بتایا گیا ہے:

پہلے نسخے کا نام تحفۃ المجربات صفحات ۳۳۵

دوسرے " " تحفۃ المجربات مع نسخہ جات متفرقہ در رسائل متفرقہ طبیہ، صفحات ۴۱۶

اب یہاں جو نسخہ ہے اس کے مضامین اور کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ ثانی کے نام سے کچھ ایسا اشارہ ملتا ہے کہ بہت ممکن ہے دونوں جگہوں کے نسخے ایک ہی مصنف کے ہوں۔ رہ گئی یہ تحقیق کہ اصل مصنف "حکیم سنائی" ہیں یا "حکیم الیاس"؟ اس سلسلے میں کوئی دوسرا ذریعہ بسیار تلاش کے بعد بھی اب تک میسر نہ آیا اس لیے پیش نظر نسخہ سے چند تحریریں نمونۃً پیش کی جارہی ہیں تاکہ اصحابِ تحقیق میں سے کوئی صاحب کچھ روشنی ڈال سکیں۔

نسخہ کا دیباچہ:-

"حمد موفورہ و ثنا ر نا محصورہ بحضرت ملک المتعال و بادشاہ لایزال کہ گشندہ نیلگون بر طناب بے ستون معلق داشتہ ... و درود بر سید کائنات و خلاصہ موجودات سلطان الانبیاء برہان الاصفیاء محمد مصطفیٰ ... فی الدارین کہ کتاب "تحفۃ المجربات" از تصنیف خواجہ حکیم ثنائی از برای فوائد مسلمانان تا ہر کسی از ...... مصنف را بدعا یاد آرند"

اس دیباچہ کے بعد مردوں، عورتوں سے متعلق جتنی قسم کی تمنائیں اور حاجتیں ہوسکتی

ہیں اُن سبھی کے بارے میں دوائیں اور دعائیں مع نقوش بالتفصیل درج ہیں۔ خواہ زن و شو کے تعلقات کا مسئلہ ہو یا زنانہ و مردانہ پوشیدہ امراض لاحق ہوں اور چاہے کسی مرد یا عورت کے مابین عشق و محبت کا سلسلہ پیدا کرنا مطلوب ہو۔

خدائے تعالیٰ کے بارہ[12] ناموں کے سلسلے میں ایک جگہ ذیل کی عبارت ہے:

"دوازدہ[12] نام باری تعالیٰ سی[13] ویک خاصیت دارد، ہر کہ تنگ آرد کافر گردد۔ خاصیت اول بروایت ابوبکر صدیقؓ اگر کسے رابستہ باشد پانزدہ[15] روز ایں نام بنویسد بشوید، بخورد مرد شود۔ خاصیت دوم بروایت امیر المومنین عمر خطابؓ ہر کہ ایں دوازدہ نام پنج بار بخواند جملہ ارواح مسخر او شوند۔ خاصیت سیوم بروایت عثمان اگر کسے را مقہور سازد ایں را بر خشت خام بخواند و در کفن بپیچید و در چاہ اندازد نماز جنازہ ہم بگذارد پس دو پیش دو چہار روز جانش بحق تسلیم گردد۔ خاصیت چہارم بروایت علیؓ اگر خواب کسے خواہی کہ بستہ شود بر ریسمان لعل دوازدہ[12] گرہ دہد بر ہر گرہی یک مرتبہ بخواند بر زمین پنہاں کند در حال خواب بستہ شود" الخ

اسی طرح تمام خصوصیات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد دوازدہ ناموں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دیو و پری اور جادو سے محفوظ رہنے کی ایک دعا ہے پھر دعائے تحخیتا "بیست و یک نام" اور اس کی افادیت کا تفصیلی ذکر ہے۔ اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دعائے تحخیتا کی روایت ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذکر کر دی جائے:

"دعائے تحخیتا روایت می کند جعفر بن محمد صادقؓ از پیغمبرؐ کہ من از جبرئیل شنیدہ ام، جبرئیل گفت کہ من از میکائیل شنیدہ ام، میکائیل گفت کہ من از اسرافیل شنیدہ ام، اسرافیل گفت کہ من از عزرائیل شنیدہ ام، عزرائیل گفت کہ من از لوح محفوظ دیدم خطی سبز نوشتہ دیدہ ام درازی آں خط پانصد سالہ راہ بود، ستبرای آں خط دویست سالہ راہ بود و ازاں خط از پشت جانور برمی آید و

برساق عرش می رسند وگفت دران ست کہ مرا معراج بروند در لوح محفوظ خطی نوشتہ دیدہ ام از جبرئیل پرسیدم این خط چیست ؟ گفت ازاں تو بر می آید و برائے محمدؐ عطا شد۔ جبرئیل گفت ہر کہ این بیست ویکنام تمخیثا را بخواند دیا بر خود دارد ازحسدِ حاسداں و دیو یا پری .... آتش و غرق شدن آب و زہر بادہا، مخالف چوں سرخ بادہ ناسور و قولنج و تپ ولرزہ و درد سر و درد بدن و درد گلو و درد شکم واز ہمہ علّتہا ایمن گردد۔ وہر کہ نا ہا بدارد اگر صد تیغ بروی زنند یکتا رموی اُو برید نتواند۔ اگر کسے غیب داری ۲ دو رکعت نماز بگذارد بنام آں غایب ونیت کند واین نا ہا را بخواند یا نوشتہ در زیر بالینِ خود بدارد در خواب بیند۔ پیغمبرؐ امیرالمومنین علیؓ را وصیت کردند بجہت نگاہ داشتن این نا ہا ش علیؓ این بیست ویک نام را نوشتہ نگاہ دارد بعد ازاں بر ہر کہ روی بنمای پیش اوی روی بفتح مظفر باز گشتن وکفار را ہزیمت ومقہور کرد ند برکت این نا ہا امیرالمومنین علیؓ ہدیہ بفرزندان خود از این با ہارون رشید را دادند اورا خزانہ بادشاہ بلخ رسید واز خزانہ محمد شاہ رسید۔ یادگاری بنوشتم کہ آخرت کار آید۔ دعای تمخیثا اینست " بِسْمِ اللّٰہِ الرحمٰن الرحیم یا تمخیثا الذی لاتاخذہ سنۃ ولا نوم لہٗ" ہر کہ این نام را با خود بدارد دُزد بروی غایب شود واز احتلام فارغ شود۔ این نام را برساق عرش نوشتہ اند نور او ہفتاد بار تاباں تر است از نور آفتاب" الخ

مذکورہ بالا دیے گئے، نمونوں میں ناظرین کو اگر املا، قواعد یا دیگر قسم کی خامیاں نظر آئیں تو یہ کاتبِ نسخہ کی کتابت پر محمول کی جائیں۔ احقر کے قلم نے ان میں کسی قسم کی خیانت روا نہیں رکھی ہے، ہو بہو جو کچھ نسخہ میں موجود تھا نقل کر دیا ہے۔ جتنے بھی نسخوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے اُن سب میں کتابت کی خامیاں نظر آتی ہیں۔

(۴) متفرق اوراق | یہ چار صفحات ہیں جو غالباً مختلف کتب سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ ان میں

دیوانِ راجا سے چند غزلیں، اسمائے چہاردہ معصوم،" خاصیت پوشید." عنوان کے تحت
لباس کی پوشش کا بیان بصورت نظم، ہفتہ کے ساتوں دنوں کی خصوصیات،" ترجمہ
حدیث حضرت پیغمبرؐ" عنوان کے تحت کچھ اشعار ہیں جن میں مہینہ کے ہر دن کی خصوصیات
کا ذکر ہے نیز کچھ دعائیں ہیں جو زنانہ امراض، پیدائش اولاد اور دشمن کی ہلاکت سے متعلق ہیں۔

۱؎ Annual Report, 1927: Page 17 ۲؎ ایضاً Page 19 . ۳؎
L. Bagdanov ۴؎ Jutius Germanus ۵؎ Annual
Report, 1929. Page 5 ۶؎ ایضاً Page 4 : 1929 ۷؎ ایضاً ۸؎
Annual Report 1930: P.5 ۹؎ ایضاً Page 2 : 1932 ۱۰؎ موصوف اردو کے
مشہور شاعر اشک امرتسری کے برادر بزرگ تھے۔ ۱۱؎ جس دور کی یہ باتیں قلم زد کی جا رہی ہیں۔
وشوا بھارتی کی حیثیت کالج کی ہی تھی جو کلکتہ یونیورسٹی کے ماتحت تھی لیکن یہاں ریسرچ کا بھی نظم و
ضبط تھا جو مقالہ جات مکمل ہو جانے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں پیش ہوتے تھے اور پھر وہیں سے پی ایچ
ڈی کی ڈگری دی جایا کرتی تھی۔ پھر یہ کالج ۱۹۵۱ء میں یونیورسٹی ہو گئی۔ ۱۲؎ Annual
Report, 1932: Page 3 ۱۳؎ ایضاً Page 2 : 1938- ۱۴؎
Visva Bharati News, 1935: Page 42 ۱۵؎ ایضاً Page 95
۱۶؎ Annual Report 1939: Page 9 ۱۷؎ ایضاً Page 9 : 1940
۱۸؎ انہی مسٹر موصوف کی ضرورت اور طلب پر میں وشوا بھارتی یونیورسٹی میں آیا۔ اس زمانے میں
یہ مسٹر شعبۂ اسلامی میں ریڈر کے منصب پر فائز تھے۔ دو سال تک شعبہ میں عارضی طور پر میں مسٹر
موصوف کے ماتحت فارسی مخطوطات کی نقلیں کیا کرتا تھا جو زیادہ تر تاریخِ افغان سے متعلق ہوا
کرتی تھیں۔ انہی سالوں میں حیدر آباد کے میرے محترم و مشفق ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب یہاں یونیورسٹی
کی اعلیٰ کمیٹی کے ممبر تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی رورل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھی تھے

شانتی نیکیتن ہی میں موصوف سے مجھے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ یہ ملاقات میرے معاشی مستقبل کے لیے
وجہ طمانیت بن گئی۔ ڈاکٹر موصوف کی ایما اور کرم فرمائی سے یونیورسٹی کی لائبریری میں اردو، فارسی اور
عربی کتب کی خدمت کے لیے فروری ۱۹۶۶ء میں مستقل تقرر ہو گیا اور اب تک اسی ذمہ داری کے طفیل
اپنے اہل وعیال سمیت ارض شانتی نیکیتن پر ایام حیات بسر کر رہا ہوں۔

[19] Annual Report., 1961 : Page 109 [20] ایضاً [21] Visva Bharati News, Feb. 1966 [22] Annual Report, 1966-67: Page 100
[23] موصوف دو سال سے رخصت لے کر خرطوم (سوڈان) میں بحیثیت پروفیسر اسلامیات مقیم ہیں۔
[24] حافظ موصوف ڈاکٹر انصاری صاحب کی عدم موجودگی میں شعبہ اسلامیات کا پورا نظم سنبھالے ہوئے ہیں۔ ــه یہ غالباً وہی مسٹر حسین شہید سہروردی ہیں جو پاکستان کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔
[25] Visva Bharati News V.1, 1932 : Page 10 [26] Annual Report, 1933 : Page 12 [27] Visva Bharati News V.1, 1933, Page 70 [28] یہ کوارٹر یہاں دو ناموں "نظام ہاؤس" یا "حیدرآباد ہاؤس" سے متعارف ہے۔ [29] Annual Report 1927 : Page 19
[30] ایضاً: 1934 : Page 2 [31] ایضاً 1952: Page 46 [32] ایضاً Page 49 [33] Visa Bharati News, V.4, 1935: Page 42
[34] شروع میں رابندر ناتھ ٹیگور ہی کالج کے پریسیڈنٹ تھے اور اسی نام سے انھوں نے فنڈ قائم کیا تھا جس کے ذریعے وہ چندہ فراہم کیا کرتے تھے۔ [35] Annual Report 1927 : Page 27 ــه کچھ عربی مطبوعات جرمن اور انگلینڈ سے بھی تحفۃً آئی تھیں۔
[37] "لغت نامہ دہخدا" میں حرف نون کے تحت نامی تخلص کے متعدد شعراء کا ذکر مع تصنیفات کیا گیا ہے لیکن "ہفت دلبر" کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ دیگر کتب میں بھی تلاش کیا گیا لیکن افسوس کہ اس مثنوی کا ذکر مجھے کہیں نہ مل سکا۔ اگر کوئی صاحب تحقیق نشاندہی فرمائیں تو مشکور ہوں گا۔

۳۷ آج کل بنگلہ سال ۱۳۸۷ء چل رہا ہے۔ (یہ بنگلہ سال بیساکھ کے مہینہ سے شروع ہوتا ہے اس کے ماہ وہی ہیں جو ہندی فصلی کے ہیں) ۳۸ موصوف شیر گڈھ (پنجاب) میں ۹۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۲۴ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ اپنے والد سید رحمت اللہ اور چچا سید داؤد سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چچا کے زیر ہدایت روحانیت کے مقامات طے کیے۔ پھر چچا نے اپنے ایک خاص مرید شیخ عبدالوہاب کے سپرد کر دیا تاکہ وہ ان کو صوفیہ کے آداب سلوک و طریقت سکھائیں۔ چنانچہ شاہ ابوالمعالی نے خوب ریاضت کی، صوم و صلوٰۃ صحرا میں گزارتے، نیلوفر کے سبز پتے ابال کر روزہ افطار کرتے۔ ۹۸۲ھ میں اپنے مرشد کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ مقرر ہو گئے۔ موصوف صوفی کے علاوہ شاعر بھی تھے اور تخلص غربتی تھا۔ ان کا ایک مرتب شدہ دیوان پایا جاتا ہے اس کے علاوہ مزید چھ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔" ("پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ" از ڈاکٹر ظہور الدین احمد، بر صفحہ ۲۳-۴۹ شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء) ۳۹ اسی طرح کے خطوط و جوابات تقریباً مولانا یوسفی ہراتی کے بھی ہیں جو ہمایوں بادشاہ کے منشی تھے اور جن کے خطوط و جوابات "بدائع الانشاء یا انشاء یوسفی" کے نام سے مشہور رہے۔ اور یہ نسخہ یہاں لائبریری میں موجود ہے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ ۴۰ آج کل بنگلہ سال ۱۳۸۷ء چل رہا ہے

تبصرے

عربی کا نعتیہ کلام، از ڈاکٹر عبداللہ عباسی ندوی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۹۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد -/۱۵ روپے، پتہ: مکتبۂ اسلام، نمبر ۳۷، گوئن روڈ لکھنؤ۔

اس کتاب میں عربی میں نعت گوئی کی تاریخ اور اس کے سرمایہ کا مختصر جائزہ لینے کے بعد عربی کے مشہور نعت گو شاعروں اور ان کے نعتیہ کلام کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نعتوں کے منتخب اشعار اردو ترجموں کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ فاضل مؤلف عربی اور اردو دونوں زبانوں کے مسلمہ ادیب ہونے کے علاوہ ایک سربرآوردہ خاندان صوفیاء کے چشم و چراغ ہیں اس لیے اس موضوع پر لکھنے کا حق ان سے زیادہ کسی اور کو کیا ہو سکتا تھا۔ عربی میں کعب بن زہیر کا قصیدہ بردہ جو بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے اور شیخ بوصیری کا قصیدہ بردہ نعت گوئی کے تمام سرمایہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح حضرت حسان بن ثابت جن کا دیوان یورپ میں طبع ہو گیا ہے، دربار نبوی کے مشہور شاعر ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تینوں شاعروں کو اپنے کلام کی پذیرائی و مقبولیت کی سند خود بارگاہ قدس نبوی سے عطا ہوئی ہے اس بنا پر فاضل مؤلف نے ان تینوں حضرات اور ان کی نعتوں کا تاریخی ادبی اور تنقیدی حیثیت سے مفصل جائزہ لیا ہے جو عربی زبان وادب کے طلباء کے لیے بہت

مفید ہوگا، ایک عام خیال یہ ہے کہ فارسی اور اردو کی نعتوں میں جو جوش و خروش اور زورِ بیان و کلام ہے وہ عربی نعتوں میں نہیں ہے اور خود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے (ص۔ ۱۱) پھر جہاں تک عربی نعتوں کا تعلق ہے ان میں بھی فاضل مؤلف کے لفظوں میں یہ فرق ہے کہ "بظاہر صحابۂ کرام کے کلام میں اتنا جوش و خروش نہیں ہے جو بعد کے لوگوں میں دیکھا جاتا ہے" اب سوال یہ ہے کہ یہ بہت عجیب و غریب بات ہے اور ایسا کیوں ہے؟ ڈاکٹر عبداللہ عباسی اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "لیکن یہ بات آپ کو اس وقت بے حقیقت نظر آئے گی جب آپ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ دیکھیں گے کہ صحابۂ کرام نے اپنی دلسوزی اور فنائیت کا اظہار عمل سے کیا تھا، بعد کے لوگوں نے اپنے قول سے کیا" (ص ۹۹) اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ صحابۂ کرام کی والہانہ عشق و محبت اور مجنونانہ فریفتگی و وارفتگی کے چند نمایاں واقعات کا ذکر کر کے لکھا ہے: عصر اول میں جو نعتیں کہی گئیں وہ ایک اہم ضرورت اور دین کی نصرت کے لیے وقت اور ماحول کے پیش نظر ایک فرض دینی سمجھ کر لکھی گئی تھیں، ان کا مقصد بھی قصیدہ خوانی برائے اظہار تعلق نہ تھا۔ آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا انحطاط اس درجہ پہنچ گیا کہ اہل تعلق کے سامنے نہ جہاد کی مصروفیت رہی اور نہ کتاب و سنت کی قابل ذکر خدمت کا کام رہ گیا تو ان کے جذبۂ اظہار حب نبوی کا ذریعہ صرف شعر رہ گیا" (ص ۱۰۲) ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس فرق کی بنیادی وجہیں دو ہیں: ایک وجہ تو وہ فرق ہے جو عربی شاعری اور عجمی شاعری میں ہے، عرب شاعر حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ اس کے دلی تاثرات پیکر محسوسات میں چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں اور درحقیقت یہی اس کا شاعرانہ کمال ہے، وہ کسی کی مدح یا عشق و محبت کی کیفیات کے اظہار میں اغراق (جو مبالغہ کی انتہائی قسم ہے) سے کام لے کر کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو ان ہونی ہو اور جو وہم و گمان سے بھی ماوراء ہو، عرب شاعری کا یہی وہ وصف

ہے جو اس میں تاثیر کا ضامن ہے، اس کے برخلاف عجمی شاعری میں حد سے زیادہ مبالغہ ہوتا ہے اور اس میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ ایسے اشعار سے ذہنی التذاذ تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن قلب پر تیر و نشتر کا کام نہیں کر سکتے، عربی شاعری بنی امیہ کے دور تک اپنے اصل رنگ و روپ میں رہی، لیکن عہد بنی عباس میں ایرانیوں کے ساتھ حد سے زیادہ خلط ملط کے باعث عربی شاعری پر ایرانی اثرات کا غلبہ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ دور از کار مبالغہ آرائی نے اس کا حقیقی رنگ بگاڑ دیا۔ اس کی بہترین مثال متنبی کا دیوان ہے جو عاشق کی لاغری کو بیان کرتا ہے تو کہتا ہے:

وَلَوْ قَلَمٌ أُلْقِيتُ فِي شَقِّ رَأْسِهِ مِنَ السُّقْمِ مَا غَيَّرْتُ مِنْ خَطِّ كَاتِبِ

یعنی میں اس درجہ لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر مجھکو قلم کے سر کے شگاف میں رکھ دیا جائے تو لکھنے والے کی تحریر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوگا۔ بس یہی فرق صحابۂ کرام کی نعتوں اور بعد کے عربی شاعروں کی نعتوں میں ہے، صحابۂ کرام اصل عربی شاعری کے مزاج اور اس کی طبیعت کے حامل اور پاسدار تھے اور بعد کے شاعروں پر ایرانی اور عجمی رنگ غالب تھا۔ ایک کا رنگ اصلی اور حقیقی تھا اور دوسرا رنگ مصنوعی اور بناوٹی۔ مولانا شبلی نے اپنے مقالہ "شعر العرب" میں تقابلی اشعار نقل کر کے عربی اور عجمی شاعری کے اس بنیادی فرق کو نہایت مفصل طور پر واضح کیا ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے پیکر تھے، انھیں معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "إِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ الثَّرْثَارُونَ، الْمُتَفَيْهِقُونَ الْمُتَشَدِّقُونَ۔"

ترجمہ: میرے نزدیک سب سے برے وہ لوگ ہیں جو چرب زبان ہیں۔ بڑھ بڑھ کے باتیں کرتے ہیں اور باچھیں اور نتھنے پھلا پھلا کر کلام کرتے ہیں، اس بنا پر جو عشق صحابۂ کرام کو حضور کے ساتھ تھا وہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی محبت اور عشق کے اظہار میں وہ توازن، اعتدال و احتیاط کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے،

ان کو یقین تھا کہ حضورؐ کی تعریف قرآن سے زیادہ نہیں ہو سکتی اس لیے اپنی نعتوں کو قرآن کے مضامین تک محدود رکھتے تھے، کعب بن زہیر نے جب حضورؐ کی مدح میں یہ شعر پڑھا

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ　　وَصَارِمٌ مِّنْ سُیُوْفِ الْھِنْدِ مَسْلُوْلُ

ترجمہ: "حضورؐ بے شبہ نور ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور آپ ایک بہترین کشیدہ تلوار ہیں" تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک اتار کر کعب بن زہیر کو ہبہ فرما دی۔ ایک شعر کی داد اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن غور کیجیے، اس شعر میں شاعر نے جو کچھ کہا ہے اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہے اور قرآن میں جو کچھ حضورؐ کی نسبت فرمایا گیا ہے شاعر نے سر مو اس سے تجاوز نہیں کیا ہے، اس بنا پر اس شعر میں صداقت بھی ہے اور خلوص بھی اور قلب پر اس کا اثر بھی ہوتا ہے لیکن بعد کے دور میں جب مبالغہ آرائی شاعری کا عام چلن ہو گئی تو رفتہ رفتہ عالم یہ ہو گیا کہ کسی پیر فقیر کی مدح لکھنے پر آئے تو اسے پیغمبر سے بڑھا دیا اور پیغمبر کی مدح سرائی شروع کی تو اسے عرش پر خدا کا ہمنشین بنا دیا۔ ایسی شاعری لذتِ کام و دہن کا سامان تو کر سکتی ہے دلوں میں آگ نہیں لگا سکتی ہزار اس قسم کے اشعار پڑھیے جن میں احمد اور احد میں صرف ایک میم کا پردہ حائل بتایا گیا ہے۔ دل پر ان کا اثر خاک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!" پڑھیے تو احساس و شعور کے تار مرتعش ہو جاتے ہیں۔ (س)

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم و قاعدہ ۸

اُردو بازار، جامع مسجد دہلی

(۱)	مقام اشاعت	اردو بازار جامع مسجد دہلی
(۲)	وقفۂ اشاعت	ماہانہ
(۳)	طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
(۴)	ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	سکونت	۱۳۶ ۳ اردو بازار دہلی
(۵)	ایڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	نزد بال برادری سول لائن علی گڑھ (یو۔ پی)
(۶)	ملکیت	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر

مصباح اللغات

مکمل عربی اردو لغت
طبع فوٹو آفسٹ

پچاس ہزار سے زیادہ عربی لفظوں کا جامع و مستند ذخیرہ۔

یہ شاندار عربی اردو لغت اپنی غیر معمولی خصوصیتوں کی وجہ سے لاجواب ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک اس درجہ کی کوئی ڈکشنری شائع نہیں ہوئی جس میں عربی الفاظ اور لغت کے اتنے بڑے ذخیرے کو ایسے نفیس ترجمے اور نکھرے ہوئے مطلب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہو۔ سالہا سال کی تلاش و تحقیق اور محنت کے بعد بڑی تقطیع کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات کی یہ بے نظیر کتاب اصحاب ذوق کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

المنجد جو عربی لغت کی جدید کتابوں میں سب سے زیادہ نفیس و دلپذیر سمجھی جاتی ہے۔ "مصباح اللغات" نہ صرف اس کا مکمل ترجمہ ہے بلکہ اس کی تیاری میں بہت سی بلند پایہ کتابوں سے اخذ و استنباط کی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر مدد لی گئی ہے جیسے قاموس، تاج العروس، لسان العرب، اقرب الموارد، نہایہ، مجمع البحار، مفردات امام راغب، منتہی الارب وغیرہ کئی سال کی مسلسل کتابت کے بعد ۱۹۶۰ء کے آخر میں اس کا فوٹو آفسٹ ایڈیشن طبع ہوا تھا۔ اب کتاب کا یہ دوسرا نقش ہے۔ آخر میں جدید لغات کے تتمہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۰۲۸، سائز بہت ہی موزوں اور شاندار، جلد خوبصورت اور مضبوط دلپسند گرد پوش۔ قیمت جلد ۷۲ روپے۔ قیمت غیر مجلد ۶۵ روپے

یہ واضح رہے کہ ان دنوں صرف المنجد ہی ساٹھ روپے سے زیادہ کی ملتی ہے۔

مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

اپریل ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ: بیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامان اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول - اسلام کا نظام حکومت - سلطیہ - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ" تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ" تدوین قرآن - اسلام کا نظام مساجد -
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے) - کتابت حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیر سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد نمبر ۸۶ | جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق اپریل ۱۹۸۱ء | شمارہ نمبر ۴

نظرات — سعید احمد اکبر آبادی

مقالات

نظرات

یاد ہوگا اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ایک سیمینار سرینگر (کشمیر) میں بڑے تزک و احتشام اور طمطراق سے حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ پر منعقد ہوا تھا اور اس میں متعدد مفید اور ضروری تجاویز کے ساتھ ایک نہایت اہم اور بنیادی تجویز "مولانا محمد انور شاہ اکاڈمی" کے قیام کی تھی۔ وزیر اعلیٰ جناب شیخ عبداللہ کو اس تجویز سے بہمہ وجوہ اتفاق تھا اور آپ نے حتمی وعدہ فرمایا تھا کہ وہ جلدی ہی اکاڈمی کا قیام کریں گے اور اس کے لیے ایک ابتدائی خاکہ تیار بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اتنی مدت گزر جانے کے باوجود آج تک یہ تجویز تشنۂ تکمیل ہے اور بظاہر اب اس کے عمل میں آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

مایوسی کے اس عالم میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہزاروں عقیدت مندوں اور تلامذہ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ اب آزاد کشمیر میں اس اکاڈمی کے قیام کی توقع پیدا ہوئی ہے، اس کی صورت یہ ہوئی کہ پروفیسر محمد اسلم (پنجاب یونیورسٹی لاہور) جو برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں میں کافی متعارف اور مشہور ہیں، انھوں نے آزاد کشمیر کے وزیر تعلیم کو ایک خط کے ذریعہ توجہ دلائی کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی ولادت باسعادت لوات نامی ایک گاؤں میں ہوئی تھی جو مظفر آباد کے قریب وادی نیلم میں اب بھی موجود ہے، حضرت شاہ صاحب کے والد مکرم یہیں رہتے تھے، بعد میں اپنے برادر نسبتی کے کہنے پر وہ وادی لولاب منتقل ہو گئے اور وہاں دودھوان اور ورنو میں قیام اختیار کر لیا اور چونکہ حضرت شاہ صاحب کی پیدائش ضلع مظفر آباد میں ہوئی تھی اس بنا پر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے وقت حضرت شاہ صاحب نے اپنا نام محمد انور مظفر آبادی لکھوایا تھا۔"

اس قدر لکھنے کے بعد پروفیسر اسلم نے تجویز پیش کی کہ آزاد کشمیر کی حکومت کو حضرت شاہ صاحب کی یادگار میں ایک اکاڈمی قائم کرنی چاہیے۔" اب اطلاع ملی ہے کہ حکومت نے اس تجویز کو منظور

کرلیا ہے اور اس کو عمل میں لانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے جس کے ایک رکن خود پروفیسر اسلم بھی ہیں کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، خدا کرے یہ منصوبہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے اور کاڈمی اپنے کام کا باقاعدہ آغاز کرسکے :

"اقبال صدی تقریبات" تمام ہندوستان میں حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر بڑی شان و شوکت سے منائی گئی ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہیں کہ اقبال جس طرح پاکستان کے عظیم شاعر اور مفکر ہیں ہیں اسی طرح ہندوستان کے بھی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں مغربی بنگال کی گورنمنٹ نے اقبال کی قدردانی و جوہر شناسی کا مستقل اور پائیدار ثبوت دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، گورنمنٹ کی سرپرستی میں اقبال پر ایک عظیم الشان سیمینار تو ہو ہی چکا تھا کہ اس کے بعد اس نے یہ کیا کہ بنگال کے ایک نامی گرامی آرٹسٹ سے علامہ اقبال کی ایک قدآدم تصویر بنوائی اور ۱۸ فروری ۱۹۸۱ء کو ایک عظیم الشان تقریب میں جس میں مقامی اور غیر مقامی مدعو حضرات سات سو کے لگ بھگ موجود تھے، اس تصویر کو رسم نقاب کشائی کے بعد کلکتہ کے اسمبلی ہال میں نصب کر دیا گیا، اور ساتھ ہی کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے نام سے ایک اردو کے پروفیسر کا عہدہ قائم کر دیا گیا ہے، اس سے پہلے مغربی بنگال کی گورنمنٹ اردو اکاڈمی بھی بڑی امنگوں اور حوصلے کے ساتھ قائم کر چکی ہے، ہم مسٹر باسو وزیر اعلیٰ اور ان کی گورنمنٹ کو ان اقدامات پر جو اس کی فراخ دلی اور صحیح معنی میں جمہوریت پسندی کی دلیل ہیں مبارکباد پیش کرتے اور اس کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں، ہمارے شکریہ کی مستحق بہار گورنمنٹ بھی ہے جس نے اردو دشمن تحریک کے باوجود اردو کو بہار کی سرکاری ثانوی زبان تسلیم کر لیا اور اس کا اعلان کر دیا ہے۔

آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس ملک کا ایک نہایت باوقار ادارہ ہے، لیکن ادھر کچھ عرصہ سے اس کانفرنس میں عربی، فارسی کی نمائندگی خاطر خواہ نہیں ہو رہی تھی، اب یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ہمارے فاضل دوست اور عربی اور اردو کے نامور محقق پروفیسر مختار الدین احمد صدر شعبۂ عربی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو صدر کانفرنس نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کا رکن نامزد کر دیا ہے۔
درحقیقت عربی و فارسی کو صحیح نمائندگی دینے کی غرض سے اس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک زمانہ تھا جب کہ برصغیر میں اردو زبان و ادب کے صرف تین ماہنامے اردو شعر و ادب کی فضا پر چھائے ہوئے تھے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تینوں رسالوں نے اردو زبان و ادب کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان تین میں سے دو رسالے ہمایوں اور مخزن تو لاہور سے شائع ہوتے تھے اور تیسرا رسالہ "زمانہ" کانپور سے نکلتا تھا لیکن ان میں فرق یہ تھا کہ اوّل الذکر دو رسالے علی الترتیب مسٹر بشیر احمد اور سر عبدالقادر کے تھے، یہ دونوں حضرات خوشحال تھے اور اردو رسالوں کی ادارت کے ساتھ وہ دونوں بیرسٹر بھی تھے اور اپنے پیشہ کا کام بھی کرتے تھے، اس کے برعکس "زمانہ" کانپور کے ایڈیٹر جناب دیانراین نگم بھی اگرچہ وکیل تھے لیکن ان کو اُردو زبان و ادب سے ایسا عشق تھا کہ انھوں نے اپنی تمام قوت اور صلاحیتیں "زمانہ" کے ذریعہ اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھیں، وہ وکالت تو کیا کرتے تھوڑی بہت جو جائداد تھی وہ بھی زمانہ کے نذر کر دی۔ نگم صاحب کی ان خدمات کی مدت کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اردو والوں نے اپنی زبان اور اس کے ادب کے اس مخلص خادم اور محسن کو یکسر فراموش کر دیا ہے، پریم چند صدی منائی گئی اور جس نے پریم چند کو پریم چند بنایا اس کے لیے کچھ نہیں کیا گیا، ضرورت ہے کہ اب جبکہ دیانرائن نگم صاحب کو بھی سو برس ہو رہے ہیں اردو کے ادیب اور دانشور اُن کی بھی یادگار منانے کی طرف متوجہ ہوں۔
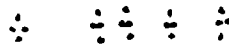
⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

⁂ ⁂ ⁂

خلافتِ ارض کیلئے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت

قرآن حکیم کی نظر میں

خلافت ارض اور علم اسماء

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی ناظم، فرقانیہ
اکیڈمی، بنگلور

(قسط دوم)

۹ــــ خلیفہ ہونے کا صحیح مطلب | اس موقع پر ایک اور اہم بحث یہ ہے کہ اس صفحۂ ارض پر انسان کے خلیفہ ہونے کی نوعیت و حیثیت کیا ہے؟ لفظ "خلیفہ" کے معنی جانشین، قائم مقام اور نائب کے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کو زمین میں خلیفہ بنانے کا صحیح مطلب کیا ہے اور وہ کس کا جانشین اور کس کا نائب ہے؟ تو اس بارے میں عام طور پر یہ مفہوم چل پڑا ہے کہ وہ اللہ کا نائب ہے اور خلافت سے مراد خلافتِ الٰہیہ ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اس نظریہ پر سخت تنقید کی ہے کہ "انسان اللہ کا خلیفہ ہے"۔ کیونکہ خلافت کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کی غیر موجودگی میں قائم مقامی کی جائے۔ یا کسی کی وفات کے بعد جانشینی عمل میں آئے۔ یا یہ کہ کسی معذوری کی بنا پر نیابت کا کام انجام دیا جائے۔ مگر معاذ اللہ خدا کے بارے میں اس قسم کی نیابت کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ نظریہ غلط اور

بے بنیاد ہے[1] بعض لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خلافتِ الٰہیہ سے مراد احکامِ ربانی کا نفاذ ہے مگر یہ قرآن کا نظریہ نہیں بلکہ لوگوں کی اپنی تاویل ہے۔

قرآن مجید میں کسی ایک جگہ بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ میں "اپنا خلیفہ" بنانے والا ہوں، بلکہ ہر جگہ یہ لفظ نکرہ استعمال کیا گیا ہے یعنی "ایک خلیفہ"۔ اور اس لفظ کے اصل لغوی معنی ہیں "پیچھے آنے والا"۔ اس لحاظ سے آیت کریمہ " اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً " کا مطلب ہوگا "دنیا میں پہلے سے جو مخلوق موجود تھی انسان اس کے پیچھے آنے والا ہے۔ اور مفسرین کا ایک گروہ اس کا قائل اور مؤید ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر المنار۔

" وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا " سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یعنی آدمؑ کو تمام اسماء اور ان کے مسمّیات بتا دینے کا مطلب یہ بھی ہوا کہ اس سے پہلے جتنے بھی موجودات اور جتنی بھی انواعِ حیات موجود تھیں سب کا علم دے دیا گیا۔ اب کوئی مزید اور نئی نوع اس دنیا میں آنے والی نہیں ہے۔ یہ دراصل اعلان ہے اس بات کا کہ اب نوعِ انسانی اور قیامت کے درمیان زیادہ فصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے نوعِ انسانی کو اب قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔

مسلم شریف کی ایک حدیث سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے، جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے چھ دنوں میں زمین اور اس کے متعلقات —— مختلف لوازمِ حیات —— کی تکمیل کرنے کے بعد ساتویں دن جمعہ کے روز بعد عصر دن کی بالکل آخری ساعتوں میں آدمؑ کو پیدا کیا[2]

اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کی طویل ترین مدّت کو اگر ہم سات ادوار میں تقسیم کر دیں تو حضرت آدمؑ کی تخلیق ساتویں دور کے آخری مرحلے میں عمل میں آئی ہے اور اب کائنات کا گویا کہ ڈراپ سین یا اختتام ہونے ہی والا ہے[3]

---

[1] ملخص از فتاوی ابن تیمیہؒ، جلد دوم۔ [2] ملاحظہ ہو مسلم، باب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار۔ [3] اس موضوع پر تفصیلی بحث اور حدیث بالا کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب " وجود باری کے شواہد "۔

قرآن انسان کو "خلیفہ" کہتا ہے۔ اب "حیاتیاتی" نقطۂ نظر سے اس قرآنی بیان کی صداقت اور اس کے دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ لاکھوں سال گزر جانے کے باوجود انسان کے بعد یا اس کی نوع میں کوئی "ارتقاء" نہیں ہوا ہے اور نہ ہی اس کے کوئی آثار نظر آرہے ہیں۔ ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ ارتقاء انسان ہی پر آکر رک گیا حالانکہ اس کو اس قانون کی رُو سے برابر جاری رہنا چاہیے تھا۔ اب آپ اس کو نظریۂ ارتقاء کی ناکامی کہیے یا اس نظریہ کی رو سے "ارتقائے حیات" کا ٹھہراؤ، بہرحال اس سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان "خلیفہ" ہے یعنی سب سے آخر میں آنے والا۔ اور مختلف حدیثوں کی تصریحات کے مطابق قیامت اسی پر قائم ہوگی۔

یہ تھا لفظ خلیفہ کا لغوی مفہوم۔ اب رہی یہ بات کہ اس سے اصل مقصود کیا ہے، کیونکہ یہ لفظ یہاں پر خصوصیت اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ لگایا ہے۔ تو جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے: یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیائے کرام کی عزت و تکریم کی خاطر استعمال کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ: اور وہی ہے جس نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا۔
(انعام ۱۶۵)[1]

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر ہم نے تم کو اُن (قوموں کے) بعد زمین میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔
(یونس ۱۴)

ان آیات میں خلافت ارض کا مقصد اور اس کا فلسفہ بھی بخوبی سمجھا دیا گیا ہے کہ انسان ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس نگارخانۂ عالم میں اُس سے حسنِ عمل

---

[1] ملاحظہ ہو مفردات قرآن، از راغب اصفہانی۔

کا مظاہرہ مطلوب ہے۔ ورنہ پچھلی قوموں اور پچھلی مخلوقات ہی کی طرح اس کا انجام بھی بہت برا ہوگا۔

حاصل یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کا لقب اس لیے عنایت فرمایا ہے کہ اُسے اپنی ذمہ داری کا صحیح احساس ہو اور تمام انواعِ حیات سے اپنے آپ کو ممتاز اور برتر تصور کرتے ہوئے اپنے فرائض اور مقصد زندگی کو بجالائے۔ یہ گویا کہ خلیفہ کا اصطلاحی مفہوم ہے کہ وہ چونکہ اس کائنات کا کُل سرسبد ہے اس لیے وہ تمام موجودات عالم اور کل انواع حیات پر حکومت کرے اور ہر ایک سے اس کے "مقام و مرتبہ" کے مطابق رحمت و شفقت کا برتاؤ کرے، کیونکہ وہ خدائے رحمان کا نمائندہ ہے۔ اسی بنا پر اس کو تمام اشیائے عالم اور کل انواع حیات کا علم دیا گیا تاکہ وہ ہر ایک کے مقام و مرتبہ کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اور جیسا کہ گزر چکا اس سے شرک اور مظاہر پرستی کا دروازہ بھی بند کرنا مقصود تھا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ؏ اور ہم نے اولادِ آدم کو یقیناً عزت بخشی اور انھیں بر و بحر میں سواریاں عطا کیں اور (خورد و نوش کی) عمدہ چیزوں سے انھیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انھیں کلی فضیلت بخشی۔ (بنی اسرائیل ۷۰)

ایک موقع پر خلافت کی اہمیت اور اس کی ذمہ داری کا احساس اس طرح دلایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْعَدْلِ: اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس تم لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کرو۔ (ص ۲۶)

ان تمام آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق خصوصی طور پر اور مکمل منصوبے کے تحت عمل میں آئی ہے۔ نہ تو وہ خود بخود ارتقائی طور پر ظہور پذیر ہوا ہے اور نہ ہی وہ

اپنے اعمال وافعال اور دستور حیات کی تدوین میں آزاد وخود مختار ہے کہ جو چاہے اپنی صوابدید کے مطابق کرے "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" (میں زمین میں ضرور ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے الفاظ اس کی صراحت کر رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق پورے شعور اور مکمل منصوبے کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جیسا کہ دوسرے مواقع پر اللہ تعالیٰ اپنے ازلی قانون کی تصریح اس طرح کرتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک متعین ضابطہ بنایا۔ (فرقان - ۲)

بہر حال انسان کو تمام مخلوقات میں سب سے آخر میں پیدا کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان مخلوقاتِ الٰہی میں غور وفکر کر کے اپنے مرتبے ومقام کو پہچانے اور خالق کی نشانیوں کا سراغ لگائے جس کے ذریعہ علم ومعرفت کے ابواب کھل سکتے ہیں اور شکوک وشبہات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

۱۰ــــ عالمِ ارض میں انسان کی اہمیت | "اللہ نے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام اور ان کے خواص بتا دیے" اس سے ایک اور بنیادی حقیقت یہ بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے ایک زبان اور لغت بھی وضع کی، کیونکہ اظہار بیان اور تعلیم و تدریس کے لیے ایک زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

---

[1] اصول فقہ کی رو سے یہ مفہوم "دلالۃ النص" کے تحت واضح ہو رہا ہے، جس کو "قیاس جلی" بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی محض لغت (یا جملوں کی بناوٹ) سے کوئی ایسا مفہوم ثابت ہونا جس سے ظاہری الفاظ خاموش ہوں۔ اس کو ظاہری حکم کے لوازم اور مقتضیات بھی کہا جا سکتا ہے، جو غور وفکر کے بعد واضح ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن میں غور وفکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

چنانچہ اس لحاظ سے خود خداوند عالم جلّ شانہٗ ہی سب سے پہلا اور اصل "واضع لغت" قرار پاتا ہے[۵۷] ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کی قدرت سے باہر تھی کہ وہ اپنے ظہور کے ساتھ ہی اپنے لیے ایک زبان بھی خود ہی لے آتا، جو اس کو ہزاروں سال کی کوششوں اور تجربوں کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور بغیر زبان کے تعلیم ممکن نہیں۔

اس کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زندگی کے میدان میں یکہ وتنہا اور حیران و پریشان نہیں چھوڑ دیا اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی رہنمائی ورہبری سے غافل نہیں رہا، بلکہ ہر ہر مرحلے میں اُس کی یاوری و رہبری کی اور قدم قدم پر اس کی اس طرح مدد کی جس طرح ایک بزرگ اور شفیق باپ ایک ننھے بچے کی قدم قدم پر مدد اور دستگیری

---

۵۷ یہ امام اشعری کا استدلال ہے، ملاحظہ ہو تفسیر معارف القرآن ۱/۱۸۲

اب فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ نے ——— جو ہر قسم کے جواہر واعراض سے پاک ہے ——— حضرت آدم سے کس طرح گفتگو کی اور انھیں کس طرح اور کس زبان میں ان امور کی تعلیم دی؟ یہ سب غیر ضروری اور لاطائل مسائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی "تعلیم ازلی" کا ایک واضح اور مکمل نمونہ آج ہمارے سامنے خود قرآن حکیم کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ جس طرح تعلیم الٰہی کی اصل حقیقت و ماہیت کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح "وحی الٰہی" کی اصل کُنہ و حقیقت کا ادراک بھی عقل انسانی سے باہر ہے۔ مگر اس وحی الٰہی کا وہ ابدی نمونہ جو قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے وہ اپنے لازوال ابدی حقائق و سچائیوں کے باعث ان امور کے برحق ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم قرآن جیسے لازوال سرچشمۂ ہدایت کو محض دیکھ کر ہی ان تمام "امور غیب" کی صداقت و حقانیت کا یقین کر سکتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں مزید کسی خارجی دلیل یا شواہد کی ضرورت نہیں ہے۔

∴ ∴ ∴

کرتا ہے۔ اس طرح تخلیقِ انسان کے بعد خلاق فطرت کا تعلق انسان سے کسی بھی مرحلے میں اور کسی بھی طرح منقطع نہیں ہوا، بلکہ ہر ہر قدم پر اس کی تعلیم جاری رہی، نامعلوم امور میں اس کو صحیح راستہ دکھایا گیا، زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے گئے اور ارضی احوال سے نپٹنے کے تمام طریقے سمجھا دیے گئے۔

اس بیان سے اُن تمام فلاسفہ اور دہریین کے باطل نظریات کی تردید بھی مقصود ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور یہاں پر کوئی مابعد الطبیعی رہنما قوت کارفرما نہیں ہے، یا خالق کا کام صرف پیدا کر دینا ہے اور ہدایت و رہنمائی اس کے فرائض میں داخل نہیں ہے یا یہ کہ یہ کائنات "اندھی مشیت" کے تحت رواں دواں ہے اور یہاں پر کوئی ناظم و مدبّر ہستی موجود نہیں ہے۔ یا یہ کہ تمام مظاہر کائنات اور کل انواعِ حیات آپ سے آپ رواں دواں ہیں، ان کا کوئی خالق و رب نہیں ہے، یا یہ کہ یہ پوری کائنات ایک مشین کی طرح جاری و ساری ہے اور تمام واقعات و حوادث محض علت و معلول کے بنیادی قانون کے ماتحت ظہور میں آرہے ہیں، یا "فطرت خود بخود خداؤں کی مداخلت کے بغیر سب کچھ کر لیتی ہے" یا "مادہ خالی ہیولیٰ یا محض منفعل ذات نہیں ہے بلکہ وہ مادرِ کائنات ہے جو خود اپنے ہی رحم سے تمام نتائج برآمد کرتی ہے"۔

بلکہ بعض گستاخوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کو سرحد تک پہنچا دیا ہے"۔ (معاذ اللہ)

قرآن حکیم نے ان تمام نظریات کی ترجمانی اور ان پر تبصرہ خود اپنے الفاظ اور اسلوب میں اس طرح کیا ہے:

وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ○ اور انھوں نے کہا کہ یہ تو صرف دنیوی زندگی ہے اور ہم کو صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (کوئی مافوق ہستی نہیں)۔ ان کے پاس

(غلط نظریہ) پر کوئی دلیل (صحیح علم) نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف ظن و تخمین سے کام لیتے ہیں۔ (جاثیہ ۲۴)

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑے مقصد کی خاطر اس کائنات کی تخلیق کی اور اس کو اپنی ازلی حکمت و مصلحت کے تحت ہر قسم کی ضروریات زندگی اور سامانِ آرائش و زیبائش سے لیس کیا، پھر نہایت درجہ رحمت و شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسان کی قدم قدم پر رہنمائی کی اور کسی بھی حال میں اس کو یکہ و تنہا نہیں چھوڑا اور زندگی کے کسی بھی دور میں اپنے تعلق کو اس سے منقطع ہونے نہیں دیا، پھر اسی طرح دورِ آدم کے بعد نبی آخر زماں صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنے چند مخصوص بندوں کو منتخب کیا اور اُن کے ذریعہ اپنی مرضی اور پیغام اور نجات انسانی کے لیے واضح راہ عمل ظاہر کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے اس آخری پیغام کا کامل نمونہ آج ہمارے سامنے قرآن کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک "کلام برتر" اور نوعِ انسانی پر پروردگار عالم کی رحمت و رأفت کا ایک نہایت درجہ اعلیٰ اور بہترین نمونہ ہے جو نوعِ انسانی کے مشاہدہ میں آسکا ہے۔

طبیعی لحاظ سے مظاہر کائنات میں جس طرح رحمانیت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح شرعی لحاظ سے اس کلام برتر میں نوعِ انسانی پر خلاّق ازل کی شفقت و مہربانی کے نقوش نظر آتے ہیں، جو تاریخی اعتبار سے تمام بنی نوع انسان کے لیے ـــــ بلا تفریق رنگ و نسل ـــــ ایک "عالمی منشور" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذاہب عالم کی تاریخ میں ان سے بہتر، جامع، متوازن اور نوعِ انسانی کے لیے مشفقانہ و کریمانہ قوانین کا نظارہ چشم فلک نے کبھی نہیں کیا ہے۔ ایسا جامع و مکمل اور عادلانہ قانون ـــــ جو عقلی حیثیت سے فطرت انسانی اور اس کی تمدنی ضروریات کے عین مطابق اور ہر دور میں ناقابلِ تغیر و تنسیخ رہا ہو ـــــ ایک معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک شاندار مظہر ہے۔

یہ نوعِ انسان پر خالق عالم کی ربوبیت اور اس کے کریمانہ رویہ کے دو اعلیٰ مظاہر ہوئے، جو نوعِ انسانی کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کو واضح کر رہے ہیں۔ پہلا تعلق طبیعی (نیچرل) ہے اور دوسرا تعلق شرعی و اخلاقی۔ یعنی جس ہستی نے انسان کی ظاہری اور جسمانی و مادّی ضروریات کے تحت اس جہان کی رنگا رنگیوں کو پیدا کیا اسی نے اُس کی رُوحانی اور اخلاقی ضروریات کے تحت انسانِ اول سے براہ راست اور اس کے بعد دیگر انسانوں سے بالواسطہ طور پر وحی و الہام کی شکل میں رابطہ قائم رکھا اور کسی بھی لمحہ اس کی ہدایت و رہنمائی سے غافل نہیں رہا۔

انسان اول کی اس خصوصی تعلیم و تربیت اس بات کا اظہار ہے کہ اس کائنات میں انسان کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ دیگر مظاہر کائنات کی طرح کوئی معمولی وجود نہیں ہے، بلکہ وہ اس کائنات کی وہ ہستی ہے جس کے گلے میں "خلافت ارض" کا طوق (اصلاح عالم کا فریضہ اور عدل الٰہی کے قیام کی ذمہ داری بشکل جہاد)[۱] ڈال دیا گیا ہے۔ یہ وہ بارِ "امانت" (احزاب-۷۲) ہے جس کے اٹھانے سے تمام موجودات عالم عاجز ہو گئے اور پوری کائنات تھرّا گئی۔ طبیعی اعتبار سے مظاہر کائنات کو عدل و رحمت کا مظہر بنانے کی ذمہ داری خلّاقِ فطرت نے براہ راست اپنے ذمہ رکھی اور ان کے لیے ایک طبیعی ضابطہ اور قانون بنا دیا (اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ) مگر شرعی و اخلاقی اعتبار سے عالم انسانی میں نظام عدل کے قیام کی ذمہ داری خود انسانوں ہی کے سپرد کی گئی کہ ہر دور میں چند صالح افراد اٹھیں اور یہ ازلی و آفاقی فریضہ انجام دیں (وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ)۔ اس سے فطرت و شریعت کی یکسانیت اور ہم رنگی مطلوب ہے۔ حکمِ اوّل مظاہر فطرت

---

[۱] خلافت ارض کے نقطۂ نظر سے فلسفۂ جہاد کی تشریح و تفصیل اگلے ابواب میں کی گئی ہے۔

کو دیا جا رہا ہے اور حکم ثانی عالم انسانی کو۔

۱۱ــــ علم اسماء اور نظام ربوبیت | علم اسماء کی تحقیق کرنا دراصل "خدا کے کاموں" یا خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے جو بطور "ربوبیت" اس کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظاموں میں جاری و ساری ہیں۔ اس لحاظ سے "خلیفہ" کا ایک کام اور اس کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ "علم اسماء" یا "نظام ربوبیت" کی تحقیق اور ان کے اسرار سربستہ کی راز جوئی کر کے مشرک اور بے دین لوگوں کی رہنمائی کرے، جن کو مظاہر کائنات کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا ہوا ہے یا جن سے وہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر نظام کائنات کو سمجھنے اور اس سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس سے اعراض کر کے غلط روش اور غلط طرز فکر اختیار کرنے والوں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ لا وَاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ج فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ○ کیا انھوں نے ارض و سماوات کے عالم میں اور ان تمام چیزوں میں جن کو اللہ نے پیدا کر رکھی ہیں نظر نہیں کی؟ اور اس پر بھی غور نہیں کیا کہ عجب نہیں کہ اُن کا وقت (موت یا تباہی کا) بھی قریب آپہنچا ہو؟ اس (واضح حقیقت) کے بعد وہ آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے۔؟ (اعراف ۔ ۱۸۵)

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ اور ارض و سماوات میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ (یوسف ۔ ۱۰۵)

حقیقت یہ ہے کہ عالم ارض اور عالم سماوات اور ان کے حیرت انگیز نظاموں میں اتنے دلائل و شواہد اور اس قدر نقشہائے ربوبیت موجود ہیں جن سے اعراض کرنا اور آنکھیں

بند کر لینا مشکل ہے۔ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک ورق اور اس کے تمام نقش ونگار پر اس کے حیرت انگیز خالق ومربیّ اور مدبّر ومنتظم کا نام اور پتہ ایک عجیب وغریب اور اعجازی زبان میں لکھا ہوا ہے، جس کو سمجھنا ہی نشانہائے ربوبیت کو سمجھنا اور اس علم کی چھان بین کرنا، دلائلِ آفاق وانفس کی تدوین کرنا ہے تاکہ منکرین ومعاندین پر اتمام حجت ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام کائنات میں غور وفکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس پر مختلف حیثیتوں سے ابھارا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ یقیناً زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور رات دن کے ہیر پھیر میں عقل مندوں کے لیے بہت سے نشانات موجود ہیں۔ (آل عمران - ۱۹۰)

نظام کائنات سے عبرت وبصیرت حاصل نہ کرنے والوں نیز صحیح نتائج اور صحیح افکار کو جھٹلانے یا اُن سے اعراض واغماض برتنے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ﺯصلے لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا ز وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ز وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا ط اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور انسان پھیلا رکھے ہیں جن کے دل تو ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں ہیں، اور اُن کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ہیں، اور اُن کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ (کیونکہ) یہ لوگ غافل (اور بے پروا) ہیں۔ (اعراف ۱۷۹)

حضرت آدمؑ کو علم اسماء دیے جانے کی ایک بڑی حکمت ومصلحت یہ بھی تھی کہ اولاد آدم میں یہ علم پھیلے اور منشائے خداوندی کے مطابق اس دنیا میں دلیل واستدلال اور

حجت و برہان کا بازار گرم ہو۔ مگر آج کل یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ علوم فطرت یا علوم تکوین — جن کو موجودہ زبان میں سائنس کہا جاتا ہے — نیچریت یا مادیت کے ہم معنی ہے حالانکہ حقیقتاً سائنسی علوم میں اس قسم کی کوئی چیز موجود نہیں ہے، بلکہ وہ تو حیرت انگیز طور پر آج قرآن اور اسلام کی تصدیق و تائید کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ غلطی جو کچھ بھی ہے وہ بعض لوگوں کے اپنے ذہنوں اور اپنے افکار میں ہے، اصل علوم میں نہیں۔ ہمیں انہی غلط افکار و نظریات کی تردید کرنی ہے۔ سائنس درحقیقت کائنات کے آثار و مظاہر کے آزادانہ مطالعہ اور طریق فکر کا نام ہے۔ کائنات کے مظاہر اور ان کے اسرار کا مشاہدہ و تحقیق کر کے اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے قوانین و ضوابط کو ترتیب دے کر استقرائی حیثیت سے نتائج اخذ کرنا ہی سائنس کا مقصد اور طریقِ فکر ہے۔ اس حیثیت سے تمام سائنسی علوم قرآن حکیم کے طرز فکر اور اُس کے تلقین کردہ نظام سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے مؤید و مصدق نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ موضوع وقت کا اہم ترین موضوع ہے اور اس پر تحقیقی کام کرنا وقت کی ایک اہم ترین علمی ضرورت ہے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوگا ذہنی و فکری اعتبار سے عالم انسانی کی رہنمائی نامکمل رہے گی اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار نہیں ہو سکے گی۔

سائنٹیفک بنیادوں پر قرآن حکیم کے نظام دلائل کا جائزہ یا دلائل آفاق کی تدوین سے دو بڑے فائدے مقصود ہیں: (۱) اہل ایمان کے علم و یقین میں اضافہ اور دین حق پر اُن کی ثابت قدمی (۲) منکرین حق کے شکوک و شبہات کا ازالہ اور ان پر اتمام حجت، جیسا کہ آیات ذیل سے ثابت ہوتا ہے:

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

مِنَ السَّمَاۤءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ○ تِلۡكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡكَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ○

حا، میم۔ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو بڑی قوت اور بڑی حکمت والا ہے یقیناً زمین اور آسمانوں میں ایمان لانے والوں کے لیے بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری خلقت اور (صفحۂ ارض پر) جانداروں کے پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لیے دلائل موجود ہیں۔ اور اسی طرح دن رات کے ہیر پھیر میں اور جو کچھ اللہ نے اوپر سے رزق (پانی کی شکل میں) اتارا پھر اُس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کر دیا اور ہواؤں کے نظام ادل بدل میں دانشمندوں کے لیے واضح نشانیاں موجود ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تو یہ لوگ اللہ اور اُس کے نشانات و دلائل کے بعد آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ (جاثیہ - ۱-۶)

لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ○ تاکہ وہ اس کو متنبہ کر سکے جس (کا دل) زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر بات ثابت ہو جائے (یٰسین ۷۰)

۱۲۔۔۔ علم اسماء اور معرفت الٰہی | علم اسماء کی تحقیق کا سب سے اہم مقصد معرفتِ الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی نظام ربوبیت کی تحقیق کے نتیجے میں خدائے تعالیٰ کی بے مثال صفات مثلاً اس کی وحدت و یکتائی، قدرت، ہمہ دانی، حکمت و مصلحت، مخلوق پروری، رحمت و رأفت اور اس کی عجیب و غریب منصوبہ بندی کا بھرپور نظارہ و مشاہدہ ہو جاتا ہے، جو توحیدِ شہودی اور عین الیقین کی منزل اور اس کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اور اس منزل تک پہنچ جانے کے بعد انسان کو فکری اعتبار سے کسی بھی طرح بھٹکنے اور غلط راستوں کی طرف نکلنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔

اس اعتبار سے حسب ذیل آیات کریمہ تمام سائنسی اور کائناتی علوم اور ان کے

مطالعہ کا نچوڑ اور ان کا ماحصل ہیں۔ جو کوئی غیر جانبداری کے ساتھ مظاہر کائنات اور
ان کے نظاموں کی چھان بین کرے گا وہ لازمی طور پر اس منطقی نتیجے تک ضرور پہنچے گا۔
ان آیات میں پورے قرآن اور مطالعۂ کائنات کا عطر کشید کر لیا گیا ہے۔ یہ وہ بلند پایہ
آیات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اگر پہاڑ پر بھی نازل کر دی جاتیں تو وہ ان کے معارف
کے بوجھ کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہو جاتا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ج
هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِكُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط سُبْحٰنَ
اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى ط یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

وہی اللہ ہے جس کے سوا (اس کائنات میں) کوئی دوسرا الٰہ (نرالے اور حیرتناک
افعال والا) موجود نہیں ہے۔ قابل مشاہدہ اور نا قابل مشاہدہ (طبیعی اور مابعد الطبیعی
عالموں کا) جاننے والا وہی ہے۔ وہ نہایت مہربان اور سراپا رحمت ہے (جیسا کہ تمام
مظاہر کائنات گواہی دے رہے ہیں) وہی اللہ ہے جس کے سوا دوسرا کوئی الٰہ موجود نہیں
ہے (جو اپنی مخلوق پر غایت درجہ مہربان ہو) وہ بادشاہ ہے، (سب عیبوں سے) پاک
ہے، ہر طرح سالم ہے، امن دینے والا ہے، نگہبانی کرنے والا ہے، سب پر غالب ہے،
(خرابیوں کا) درست کرنے والا اور بڑی عظمت والا ہے۔ اللہ (جس کی یہ شان ہے)
لوگوں کے شرک (اور ان کی تمام فکری لغزشوں) سے پاک ہے۔ وہی اللہ (اکیلا) ہے
جو (تمام انواع حیات کو) پیدا کرنے والا، ٹھیک ٹھیک (ضابطوں کے مطابق) بنانے
والا اور (رحم مادر میں اُن کی) صورت گری کرنے والا ہے۔ (ان خوبیوں کی بنا پر) اس کے
اچھے اچھے نام ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں اس کی تسبیح کر رہی ہیں۔ اور وہ

زبردست اور حکمت والا ہے۔ (حشر ـ ۲۲ ـ ۲۴)

حدیث شریف میں ان آیات کی بڑی فضیلت آئی ہے جو بلا وجہ نہیں ہے۔ ان آیات کریمہ کی موجودہ دور میں بڑی اہمیت ہے جو عصر جدید کے لیے تریاق کا حکم رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی کائنات میں صفات الٰہی (اسمائے حسنیٰ) کی جھلکیاں اور ان کا ایمان افروز نظارہ موجود ہے۔ جو نگاہ بصیرت ڈالنے پر عیاں ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر خلّاق فطرت کو زمین اور آسمانوں کا نور کہا گیا ہے۔ (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔ اس نور الٰہی کا مشاہدہ ہی "وحدۃ الشہود" کہلاتا ہے جو بندۂ مومن کی معراج ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے راقم سطور کی کتاب "وجود باری اور قیامت کے شواہد: دنیائے نباتات میں" دیکھنی چاہیے۔

۱۳ــ خلّاقِ فطرت کی ہمہ دانی | ان تصریحات وتفصیلات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی تمام اشیاء اور ان کی تمام جزئیات کا علم (ان کے خالق و ناظم اور مدبر و مربی ہونے کی حیثیت سے) حاصل ہے ورنہ حضرت آدم کو ابتدائے آفرینش ہی میں تمام اسماء کی تعلیم دے دینا ممکن نہ ہوتا۔ اس سے بہت سے فلاسفہ اور ان کے متبعین کی باطل خیال آرائیوں کی تردید بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ کیا وہ بے علم رہ سکتا ہے جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بہت ہی باریک بین اور خبردار ہے (ملک ـ ۱۴)

وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ ج وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ اور اس نے (اس کائنات کی) ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ (انعام ـ ۱۰۱)

اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۝ ہاں جان لو کہ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (حم سجدہ ـ ۵۴)

۱۴ــــ قوانین فطرت غیر متغیر | ان حقائق کے ملاحظہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر ایک نظم و ضبط کے پابند ہیں اور ان کے اصولوں میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو رہا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یعنی روز ازل میں اللہ تعالیٰ نے ان مظاہر کے جو ضوابط مقرر کر دیے تھے ان میں مرور ایام کے باعث کوئی رد و بدل ممکن نہیں ہے۔ جن مظاہر یا موجودات کے جو خواص و آثار دور آدم میں (یا اس سے پہلے) متعین کر دیے گئے تھے وہی اب تک برابر چلے آرہے ہیں، جن سے موجودہ انسان بتدریج آگاہی حاصل کر رہا ہے۔ اگر ان مظاہر اور اُن کے آثار و خواص میں بدنظمی اور انتشار ہوتا اور ان کے اصولوں میں تغیر و تبدل ممکن ہوتا تو پھر نہ تو ان کی تعلیم ممکن ہوتی اور نہ ان علوم کی باضابطہ تدوین ہی عمل میں آسکتی۔ خود نقاش فطرت کا ارشاد ہے:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ز وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ○ اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (زمر- ۶۲)

وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ○ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک متعین ضابطہ بنایا۔ (فرقان - ۲)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی ○ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ○ پاکی بیان کر اپنے رب برتر کی، جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور (ان کا جسمانی نظام) ٹھیک ٹھاک کیا، اور وہ جس نے (تمام مخلوقات کا اپنا اپنا فطری و طبیعی نظام) مقرر کیا پھر (ہر ایک کو اُس نظام کے مطابق) چلنے کی توفیق دی۔ (اعلیٰ - ۱ - ۳)

یہ چند ہمہ گیر اور وسیع کلیات ہیں جن کا دائرہ عالم جمادات، عالم نباتات، عالم حیوانات اور عالم افلاک سب پر محیط ہے۔ ان کلیات کے مطابق ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر ایک بڑے سے بڑے نظام شمسی تک ہر ایک نظام ربوبیت ہی کے ماتحت رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوقات کو پیدا کرنے کے بعد انھیں بے ضابطہ اور بے مہار چھوڑ نہیں دیتا

بلکہ نہایت درجہ منظم اور حیرت انگیز طریقے سے ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کر رہا ہے۔ اس مادی کائنات کی تمام اشیاء اور اُن کے تمام قوانین و ضوابط نہایت درجہ منظم اور باضابطہ ہیں، جن میں بدنظمی اور انتشار کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ تم خدائے رحمان کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں پاؤ گے۔ نظر ڈال کر دیکھو کیا تمہیں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر ڈالو تو تمہاری نظر تھک کر اور ناکام ہو کر لوٹ آئے گی۔ (ملک ۔ ۳۔ ۴)

۱۵۔۔۔ فطرت و شریعت کی ہم آہنگی | یہیں سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ علم دین اور علم تکوین (علم فطرت) میں اصلاً کوئی تعارض و تضاد نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہوئے اور ہر دو ایک ہی مبدءِ فیض کی جانب سے تعلیم کیے ہوئے ہیں، بلکہ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ نہ کہ باہم متحارب اور دست بگریباں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حکمت (اور منصوبہ بندی) کے ساتھ پیدا کیا ہے یقیناً اس باب میں اہل ایمان کے لیے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت ۔ ۴۴)

ان دونوں کی تطبیق و ہمنوائی سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمے کے دو مظہر ہیں؛ ایک سے اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے تو دوسرے سے اُس کی صفات ازلی و ابدی سچائیوں کا اثبات مطلوب ہے۔ قرآن اور کائنات ایک دوسرے کے لیے آئینے کی مانند ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے میں اپنا عکس نظر آتا ہے اور اپنے صحیح نقش و نگار ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۶۔ اسباب وعلل کا سلسلہ | مظاہر کائنات کا نظم وضبط کا پابند ہونا اور ان میں متعین قوانین وضوابط کا پایا جانا اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ اشیاء میں تاثیر ہوتی ہے اور کائنات میں علل واسباب کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے، اگرچہ علت العلل اور مسبب الاسباب خود حق تعالیٰ جل شانہ ہے، یہ اس کی حکمت بالغہ کا مظاہرہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے مصالح اور ان کی آزمائش دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چیزوں میں ایسے خواص رکھے ہیں جو دوسرے خواص کو جنم دیتے ہیں۔ انہی خواص وتاثیرات کی بدولت حیوانات ونباتات کے درمیان بہت سی چیزوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ مثلاً: آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا تبادلہ اور "نائٹروجن کا چکر" (Nitrogen Cycle) وغیرہ۔ اس دوطرفہ تبادلے کی وجہ سے فطرت میں ایک توازن قائم ہے۔

غرض قرآن حکیم میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں مادّی کائنات میں جاری شدہ اسباب وعلل کے اثبات میں بنیادی اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر ہے کہ اللہ نے آسمان سے (یعنی آسمان کی بلندی سے) بارش برسائی، پھر اس بارش کے ذریعہ قسم قسم کے نباتات اُگا دیے۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝

اور اس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس پانی کے ذریعہ مختلف نباتات کے جوڑے نکال دیے۔ (طٰہٰ - ۵۳)

اس آیت کریمہ میں مختلف قسم کے پیڑ پودوں کے اُگنے کا سبب بارش کو قرار دیا ہے، جیسا کہ دیگر آیات میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ ایک جگہ رنگ برنگے میووں کو بھی بارش کا سبب قرار دیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ

مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ط (اے مخاطب) کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس پانی کے ذریعہ مختلف قسم کے رنگ برنگے میوے نکال دیے۔ (فاطر -۲۷)

ایک اور مقام پر فرمایا کہ ان میووں اور انواع و اقسام کے پھلوں وغیرہ کا ذائقہ اور ان کی لذت جدا جدا مقرر کی گئی ہے، جو ان اشیاء میں "تاثیر" پر "نص قطعی" ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا گیا کہ اس باب میں دانش مندوں کے لیے وجود باری کے دلائل موجود ہیں۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے چند قطعے ہیں (جن میں) انگوروں کے باغ، کھیتیاں اور کھجوروں کے درخت —— شاخوں دار اور بے شاخوں والے —— ہیں، سب ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں (مگر اس کے باوجود) ہم ذائقہ میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس میں عقل مندوں کے لیے (وجود باری کے) دلائل موجود ہیں۔ (رعد -۴)

اس آیت کریمہ کی رو سے اشیائے کائنات میں "الوان" (رنگوں) اور "اُکُل" (ذائقوں) کا اختلاف پایا جاتا ہے، جو ان کی نوعی خواص و تاثیرات پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ خواص و تاثیرات وجودِ باری اور اس کی ربوبیت کا بھی زبردست ثبوت ہیں، جن میں —— غور و فکر کرنے کے باعث اس سلسلے میں ناقابل تردید دلائل و شواہد فراہم ہوتے ہیں۔ یہی خواص و تاثیرات تمام طبی اور سائنسی علوم کی بنیاد بھی ہیں جو ان دلائل و شواہد کی فراہمی میں آج ہمارے معاون و مددگار ہیں۔ لہٰذا ان علوم کا انکار کرنا یا اشیاء میں خواص و تاثیرات کے نظریے کو غلط اور مہمل قرار دینا قرآن حکیم کی ان تصریحات و تعلیمات کا انکار کرنا ہے۔

اشیاء میں خواص و تاثیر کیا ہے؟ آگ جلاتی ہے۔ پانی آگ بجھاتا ہے، پانی پیاس بجھاتا ہے، پانی نظام ہضم میں مدد دیتا ہے، پانی سے نباتات اگتے ہیں، پانی تمام زندہ اشیاء کا

جزء ہے، پانی پروٹو پلازم کا جزء ہے، پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن دو عناصر سے مرکب ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے، شکر مٹھاس پیدا کرتی ہے، نمک میں نمکینی ہوتی ہے، نمک سوڈیم اور کلورین دو عناصر کا مجموعہ ہے، کریلا ذائقہ میں کڑوا ہے مگر صحت کے لیے مفید ہے، لیموں میں بہت سے طبی فوائد موجود ہیں، ہم سانس کے ذریعہ آکسیجن لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ نباتات کی غذا خاص کر کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے۔ غذا اور میووں میں مواد لحمیہ (پروٹینز) مواد نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) اور مواد شحمیہ (فیٹس) وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ جو ہمارے جسمانی نظام کے نشو ونما اور ان کی تندرستی کے لیے بہت اہم ہیں، انسان نباتات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح بجلی ہمارے گھروں کو منور کرتی ہے۔ بجلی ایک طاقت ہے جو الکٹرونوں کے ایک سیدھ میں بہاؤ کا نام ہے۔ کسی چیز کو گرم کرنے سے اس سے حرارت اور بھاپ خارج ہوتی ہے۔ اس بھاپ کو مقید کر کے اس سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ بھاپ سے مشینیں چلتی ہیں، ریلیں اور موٹریں چلتی ہیں۔ بھاپ اور بجلی ہماری اکثر تمدنی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ ایٹم میں ایک زبردست قوت موجود ہے جو ایٹمی قوت کہلاتی ہے۔ ایٹمی قوت سے بجلی حاصل ہوتی ہے۔ ایٹمی قوت سے جہاز، آبدوز اور میزائیل وغیرہ چلتے ہیں۔ ایٹمی قوت سے ایٹم بم بنایا جاتا ہے جس کی تباہ کاریاں ہیبتناک اور رونگٹے کھڑا کر دینے والی ہیں۔

اسی طرح روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ برقی مقناطیسی لہروں کے ذریعہ ہماری آواز کو کرۂ ارض کے چاروں طرف پھیلایا جا سکتا ہے جس کے باعث ہم اپنے ریڈیو پر آن کی آن میں دن بھر کی خبریں سن لیتے ہیں۔ آواز کے طبعی اصولوں کی بنیاد پر ایجاد کردہ ٹیلی فون کے ذریعہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ بات کر سکتے ہیں۔ ٹرانسمیٹر، ٹیلی پرنٹر اور ٹیلکس کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا کے کسی بھی حصے میں

آن کی آن میں پہنچا سکتے ہیں۔

مختلف شعبوں سے تعلّق رکھنے والے یہ چند اہم پہلو آپ کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ تمام چیزوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ ان امور اور حقائق کے ملاحظہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ پورا کارخانۂ قدرت اسباب وعلل اور خواص وتاثیرات کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور ہماری روزمرّہ کی زندگی میں اسباب وعلل اور ان کی کارفرمائیوں سے صَرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

غرض یہ اور اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جن کا ذکر سائنسی اور طبّی علوم میں کیا جاتا ہے۔ اور اشیاء کی انہی خواص وتاثیرات سے استفادہ کا نام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ نعمتیں ان اشیاء کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہیں۔ جن کا بیان تفصیل کے ساتھ اگلے باب میں آرہا ہے۔

اشیاء میں خواص وتاثیرات کے انکار کا نظریہ دراصل اشعری علم کلام کا حصّہ ہے[1] جس کی

---

[1] اشعری علمِ کلام (بانی ابوالحسن اشعری، المتوفی ۳۲۵ھ) چوتھی صدی ہجری میں فلسفۂ یونان اور اس کی ترویج واشاعت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے الحاد اور اعتزال کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختیار کیا گیا تھا مگر وہ زمانہ لد گیا۔ اب نہ وہ ملحد رہے اور نہ وہ معتزلہ بلکہ آج موجودہ سائنسی علوم کی ترویج واشاعت کے نتیجے میں ہم کو جس قسم کے الحاد ودہریت کا سامنا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم قرآن کی اصل تعلیمات پر نظر رکھتے ہوئے موجودہ چیلنج کا سامنا کریں اور حقائق کا انکار نہ کریں۔ حقائق بہرحال حقائق ہوتے ہیں جن کے انکار کی نہ تو قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے اور نہ اس قسم کے علمی حقائق کا انکار دین کی کوئی خدمت ہے۔ آج بجائے اشعریت کے "ماتریدیت" کی ترویج واشاعت کی ضرورت ہے جو فکر جدید سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے اور اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اسی میں جدید علمِ کلام کی تدوین کی صلاحیت بھی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

صدائے بازگشت آج بھی کہیں کہیں سنائی دیتی رہتی ہے۔ حالانکہ اشیاء میں خواص وتاثیر خود اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب وغریب حکمت ومصلحت کے باعث رکھ چھوڑی ہے جو اس کے ہمہ گیر "نظام تقدیر"[1] اور "نظام ربوبیت" کا ایک جزو اور ایک زبردست مظہر ہے۔ اشیاء میں خواص وتاثیر کا انکار قرآنی آیات کریمہ کے صاف وصریح "نصوص" کا انکار ہے جو کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور نہ اس میں کوئی عقلی خوبی ہو سکتی ہے! بلکہ قرآن عظیم کے دلائل آفاق وانفس کا تقریباً سارا دارومدار انہی خواص وتاثیرات پر ہے۔ آپ ان خواص وتاثیرات کا اقرار کیے بغیر دلیل واستدلال سے کام نہیں لے سکتے اور کسی منکر خدا پر حجت وبرہان قائم نہیں کر سکتے۔ اس طرح پورا عقلی واستدلالی نظام ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کے آثار ومظاہر میں غور وفکر کرنا ایک بے کار اور عبث کام ٹھہرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اس عقل وفکر کے لازمی نتائج ہوں گے جو محض اس غلط مفروضے کی بناء پر پیدا ہوئے کہ "اشیاء میں خواص وتاثیر مطلق موجود نہیں ہے" حالانکہ زمانہ قدیم سے اب تک عوام وخواص سب کے سب ان خواص وتاثیرات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ برابر مستفید ہو رہے ہیں اور کبھی ان کا انقطاع عمل میں نہیں آسکا۔ اور آج تو جدید مصنوعات اور جدید سواریوں وغیرہ سے استفادہ کرنا عملاً اور علانیہ طور پر گویا کہ ان خواص وتاثیرات کا اقرار واعتراف کرنا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی کو ٹیلی فون کرتے ہیں تو ہمارا عقیدہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر ہم یہ سمجھ کر ٹیلی فون کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہماری آواز مطلوبہ دور دراز مقام تک پہنچ جائے گی۔ اور ہمارا اس طرح خیال کرنا گویا کہ اس ٹیلی فونی نظام میں کارفرما "اشیاء کی خواص وتاثیرات" کا اقرار واعتراف کرنا ہے، اسی طرح جب ہم کسی موٹر، ٹرین یا ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو گویا کہ ہم غیر شعوری طور پر ان کی مشنری میں کارفرما برق وبھاپ کی

---

[1] ملاحظہ ہو پچھلے صفحات میں فقرہ ۱۳ کے تحت سورۂ فرقان اور سورۂ اعلیٰ کی آیات۔

"قوت محرکہ" کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی بدولت ہم اتنے وقت میں فلاں مقام تک پہنچ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب جادو یا طلسم یا کوئی آسیبی خلل نہیں ہے بلکہ خدائے رحمان ہی کے مقرر کردہ مادی اشیاء کے ضوابط کا نتیجہ ہے، جن کی حقیقت طبعی علوم (Physical Sciences) کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ ان حقائق کا انکار کر کے ہم موجودہ تمدنی دنیا میں ایک دن بلکہ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتے۔ آج ہماری زندگی کے تمام شعبوں کو یہ علوم اور ان کی کارفرمائیاں پوری طرح گھیرے ہوئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کا جو "تقدیری نظام" بنایا ہے ——جس کو علم جدید کی اصطلاح میں نظام فطرت کہا جاتا ہے—— اس میں ایسی خوبیاں رکھ دی ہیں کہ ان کے بنیادی اصولوں اور ضوابط کو کام میں لا کر انسان ان اشیاء کے نظام سے مستفید ہو سکتا ہے اور یہ چیز جس طرح انکار خدا کی دلیل نہیں بن سکتی (منکرین و معاندین کی غلط منطق کے مطابق) اسی طرح وہ خداوند کریم کے نافع و ضار اور مسبب الاسباب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکتی۔ نفع و نقصان کی اصل باگیں رب العالمین ہی کے قبضے و اختیار ہی میں رہیں گی اور ان تمام اشیاء پر اصل حکمرانی اسی کی رہے گی۔ ان مظاہر میں اس کے احکام سے سرتابی کی مجال نہیں ہے۔ وہ جب چاہے ان اشیاء سے اُن کی یہ خصوصیات زائل کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کو فنا کر سکتا ہے۔ مگر یہ ایک دوسری بحث ہے۔ اس سے موجودات عالم میں ودیعت شدہ "فوائد" (جن کو قرآن حکیم کی دیگر آیات میں اللہ کی نعمتوں اور اس کے نشانات سے تعبیر کیا گیا ہے) سے انکار لازم نہیں آتا۔ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی حدود میں بالکل صحیح ہیں اور ہم افراط و تفریط کا شکار ہوئے بغیر ان دونوں کے درمیان صحیح حدود کو قائم رکھیں، ورنہ سررشتۂ حیات ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور سوائے حیرانی و سرگردانی کے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس عالم رنگ و بو میں خواص و تاثیرات کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ

کائنات اور اس کے مظاہر دفعتاً نمودار نہیں ہو گئے، بلکہ مختلف مراحل سے گزر کر یا دوسرے لفظوں میں ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ حالت تک پہنچے ہیں۔ اگر خداوند عالم چاہتا تو آن کی آن میں اور دفعتاً کوئی حیوان یا پیڑ پودا یا اس وجود میں جلوہ گر ہو سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ قوانینِ فطرت کا ایک مضبوط سلسلہ جاری کیا گیا جو تدریج وارتقا کی شکل میں جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنی جسمانی تکمیل کے لیے پورے نو ماہ تک بطنِ مادر میں رہ کر باہر آتا ہے اور بتدریج ایک طویل عرصے کے بعد جوان ہوتا ہے، پہلے وہ یک خلوی ہوتا ہے، پھر چند خلوی، پھر کثیر خلوی۔ ہر خلیہ (Cell) اپنے اندر ایک پوری کائنات رکھتا ہے[1] جس میں ودیعت شدہ خواص و تاثیرات کے مطالعہ پر ابواب کے ابواب سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔

غور فرمائیے تو نظر آئے گا کہ یہ سارا سلسلۂ وجود خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے اور کائنات میں تدریج وارتقا سے ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ان خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کے درمیان کامل نظم و ضبط اور مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو ایک ناظم اور ضابط اور مدبر و منتظم کی طرف اشارہ اور رہنمائی کرتی ہے، یہی خدا ہے۔

حضرت آدمؑ کو مظاہر کائنات کی شناخت و پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ اُن کے آثار و خواص کا علم ـــ بتصریح مفسرین ـــ عطا کیے جانے کی ایک غرض و غایت بھی یہی تھی کہ انسان ان ظاہری اسباب و علل میں غور و فکر کر کے ان کے پس پردہ کارفرما شاہد

---

[1] حیوانی اور نباتاتی خلیوں کی ساخت و پرداخت اور ان کی کارفرمائیوں کا علم ایک وسیع اور مستقل ہے، جس کو citology یا Cell Biology (علم خلیہ) کہتے ہیں۔ یہ حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے۔

حقیقت کی جلوہ افروزیوں کا پتہ لگانے اور اپنی عقل و دانش کو ہمیشہ مصروف اور برسرِ پیکار رکھے۔ یہ گویا ایک بہت بڑا امتحان اور ایک بہت بڑی آزمائش ہے جو ازل سے جاری و ساری ہے۔

اور اس علم کی دوسری غرض و غایت یہ تھی کہ اشیائے عالم کے خواص و تاثیرات سے واقفیت حاصل کر کے ان میں خالقِ کائنات کی طرف سے ودلیعت شدہ فوائد سے مستفید ہو کر اپنی زندگی کو بہتر بنائے۔ اول سے آخرت بنتی ہے تو ثانی سے اس کی دنیا سنورتی ہے۔ اور ان دونوں میں توازن قائم کرنا ہی اسلام کا اصل کارنامہ ہے۔

آج اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ان مادی علوم اور مادی اشیاء کی کارفرمائیوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مادی حیثیت سے قوت و طاقت حاصل کرنا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ سیاسی اعتبار سے غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی دراصل اسباب و علل اور نظام تعلیل ہی کے ماتحت ہے۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے مادی اسباب و علل کا جائزہ لینا اور اس کے لیے مکمل منصوبہ تیار کرنا بہت ہی اہم بات اور بنیادی چیز ہے مگر یہ چیز محض خواہشات اور آرزوؤں کے سہارے برپا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اہلِ اسلام کے طرزِ فکر میں تبدیلی آنی ضروری ہے اور انھیں ہر حال میں حقیقت بیں اور حقیقت شناس ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا کے لیے جو مادی قوانین جاری و ساری کیے ہیں اُن سے صرفِ نظر کرنا قوموں کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

۱۷ طب و صحت میں اسباب و علل کی کارفرمائی اور عالمِ اسباب کے دیگر حقائق [ل]

اوپر کی بحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اشیاء و اجسام میں تاثیر اور خاصیت موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام طبی علوم بھی — جن کا تعلق سائنسی علوم ہی سے

ل ممکن ہے بعض حضرات کو یہ بحث غیر ضروری معلوم ہو۔ مگر ایک تو یہ پچھلی بحث کا تتمہ ہے، دوسری حیثیت سے اس میں قرآن اور حدیث کے بعض نئے دلائل اور نئے گوشے آرہے ہیں (بقیہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کائنات اور اس کے مظاہر دفعتاً نمودار نہیں ہو گئے، بلکہ مختلف مراحل سے گزر کر یا دوسرے لفظوں میں ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ حالت تک پہنچے ہیں۔ اگر خداوند عالم چاہتا تو آن کی آن میں اور دفعتاً کوئی حیوان یا پیڑ پودا لباس وجود میں جلوہ گر ہو سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ قوانین فطرت کا ایک مضبوط سلسلہ جاری کیا گیا جو تدریج وارتقاء کی شکل میں جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنی جسمانی تکمیل کے لیے پورے نو ماہ تک بطن مادر میں رہ کر باہر آتا ہے اور بتدریج ایک طویل عرصے کے بعد جوان ہوتا ہے، پہلے وہ یک خلوی ہوتا ہے، پھر چند خلوی، پھر کثیر خلوی۔ ہر خلیہ (Cell) اپنے اندر ایک پوری کائنات رکھتا ہے[1] جس میں ودیعت شدہ خواص و تاثیرات کے مطالعہ پر ابواب کے ابواب سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔

غور فرمائیے تو نظر آئے گا کہ یہ سارا سلسلۂ وجود، خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے اور کائنات میں تدریج و ارتقاء سے ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ان خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کے درمیان کامل نظم وضبط اور مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو ایک ناظم اور ضابط اور مدبر و منتظم کی طرف اشارہ اور رہنمائی کرتی ہے، یہی خدا ہے۔

حضرت آدمؑ کو مظاہر کائنات کی شناخت و پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ اُن کے آثار و خواص کا علم ـــــ بتصریح مفسرین ـــــ عطا کیے جانے کی ایک غرض و غایت بھی یہی تھی کہ انسان ان ظاہری اسباب و علل میں غور و فکر کر کے ان کے پس پردہ کارفرما

---

[1] حیوانی اور نباتاتی خلیوں کی ساخت و پرداخت اور ان کی کارفرمائیوں کا علم ایک وسیع اور مستقل ہے، جس کو Citology یا Cell Biology (علم خلیہ) کہتے ہیں۔ یہ حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے۔

حقیقی کی جلوہ افروزیوں کا پتہ لگائے اور اپنی عقل و دانش کو ہمیشہ مصروف اور برسرِ پیکار رکھے۔ یہ گویا ایک بہت بڑا امتحان اور ایک بہت بڑی آزمائش ہے جو ازل سے جاری و ساری ہے۔

اور اس علم کی دوسری غرض و غایت یہ تھی کہ اشیائے عالم کے خواص و تاثیرات سے واقفیت حاصل کر کے ان میں خالقِ کائنات کی طرف سے ودلیعت شدہ فوائد سے مستفید ہو کر اپنی زندگی کو بہتر بنائے۔ اول سے آخرت بنتی ہے تو ثانی سے اس کی دنیا سنورتی ہے۔ اور ان دونوں میں توازن قائم کرنا ہی اسلام کا اصل کارنامہ ہے۔

آج اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ان مادی علوم اور مادی اشیاء کی کارفرمائیوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مادی حیثیت سے قوت و طاقت حاصل کرنا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ سیاسی اعتبار سے غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی دراصل اسباب و علل اور نظام تعلیل ہی کے ماتحت ہے۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے مادی اسباب و علل کا جائزہ لینا اور اس کے لیے مکمل منصوبہ تیار کرنا بہت ہی اہم بات اور بنیادی چیز ہے مگر یہ چیز محض خواہشات اور آرزوؤں کے سہارے برپا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اہلِ اسلام کے طرزِ فکر میں تبدیلی آنی ضروری ہے اور انھیں ہر حال میں حقیقت بیں اور حقیقت شناس ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا کے لیے جو مادی قوانین جاری و ساری کیے ہیں اُن سے صرفِ نظر کرنا قوموں کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

۱۷　طب و صحت میں اسباب و علل کی کارفرمائی اور عالمِ اسباب کے دیگر حقائق [1]	اوپر کی بحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اشیاء و اجسام میں تاثیر اور خاصیت

موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام طبی علوم بھی — جن کا تعلق سائنسی علوم ہی سے

[1] ممکن ہے بعض حضرات کو یہ بحث غیر ضروری معلوم ہو۔ مگر ایک تو یہ پچھلی بحث کا تتمہ ہے، دوسری حیثیت سے اس میں قرآن اور حدیث کے بعض نئے دلائل اور نئے گوشے آرہے ہیں (بقیہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہے ـــــ درست اور صحیح ہیں۔ لہٰذا علاج و معالجہ اوراد و یات وغیرہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ چیزیں توکل کے خلاف ہیں، بلکہ یہ تو تعلیم الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج معالجہ کیا ہے اور اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے۔

قرآن مجید اس سلسلے میں ہمارے لیے ایک بہترین رہنما اور ہادی ہے جس نے ہمارے لیے چند بنیادی اصولوں کو پیش کر کے ایک خاکہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اس نے امراض وعوارض کے وجود کو تسلیم کر کے بیماروں اور مریضوں کو شرعی طور پر رخصتیں عطا کی ہیں۔ اور دوسری حقیقت یہ کہ علاج و معالجہ کے اصول کو اصولی طور پر تسلیم کر کے گویا کہ اسباب وعلل کے برحق ہونے کی تصدیق کی ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ [۳]

(بقیہ ص ۲۹) اور تیسری حیثیت سے اس بحث کے آخر میں چند ایسے حقائق اور نتائج نکالے گئے ہیں جو ہمارے فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے اور ہمارے اذہان کو صیقل کرنے میں نہایت درجہ مؤثر ہیں۔ اس وقت دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے ہماری پستی و انحطاط اور ہمارے فکری و عملی جمود کی جو حالت و کیفیت ہے اس کا تقاضہ ہے کہ کار تجدید و اصلاح کے لیے خرابیوں کی اصل جڑ بنیاد تلاش کی جائے پھر اس کا علاج تجویز کیا جائے۔ اصلاح نیچے سے اور درجہ بدرجہ ہونی چاہیے۔ اصل جڑ کو برقرار رکھتے ہوئے محض شاخوں کو چھانٹ دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ مادی اور سائنسی علوم سے صدیوں کی دوری نے ہمیں بہت سی غلط فہمیوں اور غیر معقول باتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ ہمارے ذہن و فکر میں اساسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں اور سوچنے سمجھنے کا انداز بدلا جائے، مسلم معاشرہ میں حقائق کے سمجھنے اور ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ پیش پا افتادہ مسائل کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر ناخنِ تدبیر سے انھیں سلجھایا جائے۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا: اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم سے کوئی شخص حاجت ضروریہ سے فارغ ہوا ہو یا تم نے (اپنی) بیویوں سے قربت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو (نساء ۴۳، مائدہ-۶)

اس آیت کریمہ میں مریض کے لیے پانی نہ ہونا تیمم کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ یہ حکم دراصل سفر اور مابعد کی حالتوں کے ساتھ مشروط ہے، ورنہ مریض کے لیے محض اس کا مطلقاً مریض ہونا ہی تیمم کے جواز کے لیے کافی ہے[1]

اسی طرح رمضان شریف کے روزے جو فرض ہیں مرض اور سفر کی صعوبتوں کا خیال کرتے ہوئے ان کی قضا دوسرے دنوں میں جائز رکھی گئی ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط

جو شخص تم میں بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رہے۔ (بقرہ ۱۸۴)

اسی طرح حج اور عمرہ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ قربانی کا جانور قربان گاہ تک پہنچنے سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں مگر کسی بیماری یا سر کی تکلیف وغیرہ کی بنا پر اس میں رخصت ہے کہ اس سے قبل بھی سر منڈانا جائز ہے۔

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ج

اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک کہ قربانی (کا جانور) اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ (سر منڈا کر) فدیہ دے دے یعنی (تین) روزے یا (چھ مسکینوں کو) خیرات یا (ایک بکری) ذبح کرنے (ان) سے کوئی ایک

---

[1] ملاحظہ ہو احکام القرآن، از جصاص رازی، جلد ۱ ص ۳۶۸۔

صورت اختیار کرے)۔ (بقرہ - ۱۹۶)

ان آیات کے ملاحظہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عوارض واسباب شرعاً معتبر ہیں اور ان اسباب وتاثیرات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ شریعت حقہ نے ان اسباب وعلل اور اثرات وطبائع کا اعتبار کرتے ہوئے مختلف شرعی امور میں رخصت واجازت دے رکھی ہے اور احکام وفرائض کی ادائیگی میں تخفیف وتیسیر کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔

یہ تو جسمانی عوارض کے برحق ہونے کا اصول بیان تھا۔ اب ان عوارض ولواحق کو زائل کرنے کے لیے علاج ومعالجہ کے حق ومبنی برصواب ہونے کا بیان ملاحظہ ہو: شہد کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ اس میں لوگوں کے لیے (بہت سی بیماریوں میں) شفا رکھ دی گئی ہے:

يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط

اُس کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے (نحل - ۶۹)

پھر اس کے بعد فوراً ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی دلیل موجود ہے۔ (نحل ۶۹)۔

یعنی باری تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی بے نظیر ربوبیت کی ان کے لیے جو اسباب وعلل کے اس وسیع سلسلہ میں غور وفکر کرکے حقائق کا استنباط کرتے ہیں اور منکرین ومعاندین کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآن حکیم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ایک عظیم خصوصیت "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والا) کے بمصداق ہر باب میں کوئی واضح حکم دے کر یا کوئی واضح اشارہ کرکے تفصیلات (خصوصاً شرعی امور میں) اپنے رسول برحق اور ہادئ مطلق کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے

زیر بحث موضوع (علاج و معالجہ اور اسباب و علل وغیرہ) کے بارے میں ہم کو سیرت نبوی اور سنت مطہرہ میں واضح ہدایات ملتی ہیں، جن کے ملاحظہ کے بعد مزید کسی قسم کے شک و شبہ اور قیل و قال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس موضوع پر سب سے بہترین تصنیف علامہ ابن قیمؒ کی "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" ہے، جس میں علامہ موصوف نے اس سلسلے میں مروی تمام احادیث و روایات کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کر کے ان کی حکمتیں اور علتیں بیان کی ہیں۔ ان احادیث کے مطابق رسول اکرم صلعم نے مختلف مواقع پر خود بھی علاج و معالجہ کیا ہے اور صحابۂ کرامؓ کو بھی مختلف چیزوں کے ذریعہ علاج کا طریقہ بتایا ہے۔ اس لحاظ سے "طب نبوی" کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہے اور بہت اہم بھی۔ طب نبوی کے ان جواہر پاروں اور بیش بہا اصولوں کی قدر و قیمت موجودہ عصری تحقیقات کی رُو سے کیا ہے؟ اس موضوع پر ایک محقق (عبدالغنی عبدالخالق) نے اپنے دو معاونین (ایک طبی ماہر اور ایک عالم حدیث) کی مدد سے بہت بڑا اور قابل قدر کام یہ کر ڈالا ہے کہ زاد المعاد کی مذکورہ بالا تمام روایات کی چھان بین اور اصل مراجع سے ان کی تصحیح و مقابلہ کرنے کے بعد ان پر نئے انداز سے کلام کر کے اس کو "الطب النبوی لابن القیم الجوزیۃ" کے نام سے شائع کر دیا ہے[1] اس لحاظ سے یہ ایک بہت ہی وقیع اور معرکۃ الآراء علمی کتاب بن گئی ہے۔

بہر حال اس موقع پر زاد المعاد سے علامہ موصوف کی اصولی بحث کی تلخیص پیش کی جاتی ہے جو موصوف نے ابتدائی فصلوں میں کی ہے۔ اور اسی کتاب کے حوالے سے چند حدیثیں بھی ـــــ زیر بحث موضوع سے متعلق ـــــ نقل کی جاتی ہیں۔

مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ کتاب مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی ہے۔

فرمایا کہ ہر مرض کے لیے دوا موجود ہے۔ جب کسی بیمار کو دوا دی جاتی ہے تو وہ اللہ کے حکم سے صحتیاب ہو جاتا ہے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری دنیا میں بھیجی ہے اس کے لیے شفا (کا سامان) بھی بھیجا ہے۔

مسند احمد بن حنبل اور سنن (ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ) میں ابو خزامہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بتائیے کچھ پڑھ کر پھونکنے کے بارے میں جن کو ہم اختیار کرتے ہیں، یا وہ دوائیں جن کو ہم بطور علاج استعمال کرتے ہیں، یا مصیبتوں سے بچنے کی وہ تدبیریں جن کو ہم اختیار کرتے ہیں، کیا یہ تمام چیزیں اللہ کی تقدیر کو پھیر دیتی ہیں؟ فرمایا کہ یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی سے ہیں۔

(یعنی ایسا کرنا بھی تقدیر ہی کے ماتحت ہے اس سے الگ نہیں۔ مطلب یہ کہ یہ بات پہلے ہی سے مقدر ہو چکی ہوتی ہے کہ فلاں بندہ فلاں تدبیر سے اچھا ہو جائے گا۔ لہذا ان اسباب وعلل کے مطابق عمل کرنا تقدیر الٰہی کے منافی نہیں)۔

"یہ حدیثیں اسباب ومسبّبات (علل ومعلولات) کے وجود پر دلالت کر رہی ہیں اور ان میں ابطال ہے ان لوگوں کا جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ نیز رسول اکرم صلعم کا یہ بیان کہ "ہر مرض کی دوا (اس کارخانۂ قدرت میں) موجود ہے" اس کا عمومی اعتبار سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بعض قاتل امراض اور ایسے امراض بھی ہو سکتے ہیں جو طبیبوں کی دسترس سے باہر ہوں، اور جن کا علم اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی سے پوشیدہ رکھا ہو، اور وہ اس کی پہنچ سے باہر ہو[1] سوائے اتنے علم کے جتنا کہ اس نے خود سکھا دیا ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلعم نے

---

[1] علامہ ابن قیمؒ کی بصیرت اور دوربینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو بطور ایک اصول تسلیم کر کے دراصل علم کی وسعت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ طب جدید حقیقت (باقی صفحہ ۲ پر)

شفا کو موقوف کیا اس پر کہ دوا کو بیماری سے جوڑا جائے (یعنی بیماری اور دوا کے ملاپ سے شفا وجود میں آتی ہے) ۔ کیونکہ مخلوقاتِ الٰہی میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کی ضد نہ ہو۔ اس طرح ہر بیماری کی ایک ضد اس کی دوا کی شکل میں موجود ہے ۔

اس لحاظ سے نبی کریم صلعم نے صحتیابی کو بیماری سے دوا کی موافقت پر موقوف فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دوا اپنی کیفیت میں بیماری کے درجہ سے تجاوز کر جاتی ہے یا کمیت میں زیادہ ہو جاتی ہے تو ایک نئے مرض کی شروعات ہوتی ہے ۔ اسی طرح اگر وہ بیماری کے درجہ سے کم ہو جائے تو بیماری کے مقابلے سے قاصر رہتی ہے ۔ نیز معالج اگر دوائی سے واقف نہ ہو تو اس صورت میں بھی شفا حاصل نہیں ہوتی ۔ اسی طرح اگر زمانہ (کے طبعی حالات) اس دوائی کے استعمال کے لیے سازگار نہ ہوں تو اس صورت میں بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ اسی طرح بدن اگر کسی دوائی کا متحمل نہ ہو یا اس کو انگیز کرنے کی قوت نہ رکھتا ہو یا اس کی تاثیر میں اس طرح کا کوئی دوسرا مانع موجود ہو تو ان سب صورتوں میں بھی عدم مطابقت کی وجہ سے

(بقیہ صہ۳۴) انہی پوشیدہ اسباب وعلل اور کارخانۂ قدرت کے پوشیدہ اجزاء وعناصر کی دریافت کے ذریعہ علاج ومعالجہ کو بہتر سے بہتر بنانے کا نام ہے بہرحال یہ کلیہ جس طرح دورِ قدیم میں صادق آرہا تھا اسی طرح دورِ جدید میں بھی پوری طرح صادق آرہا ہے، اور شاید قیامت تک بھی اسی طرح صادق آتا رہے گا ۔ یہ ایک زندہ اور ابدی حقیقت ہے کہ انسان آج جس قدر امراض کا علاج دریافت کرتا جا رہا ہے اسی قدر نئے نئے امراض پیدا ہوتے جا رہے ہیں، جو اس کی حکمت ودانش کے لیے ایک چیلنج بنے ہوئے ہیں ۔ مگر حقیقتاً کارخانۂ قدرت میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے ۔ یہ تناسب غالباً قیامت اسی طرح باقی رہے گا، تاکہ انسان کو ہمیشہ اپنی کم مدری اور بے کسی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا رہے اور وہ اپنے سے ایک برتر ہستی کے وجود کا اقرار واعتراف کر کے اس کی بارگاہ صمدیت کی طرف لپکنے پر آمادہ ہو سکے ۔

جسمانی شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حصول صحت کے مرض اور دوا کے درمیان کامل مطابقت اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ حدیث شریف کے یہ دونوں بہترین پہلو ہیں۔

موجودات عالم کی اس ضد اور ان کے درمیان مزاحمت و مقابلہ آرائی کے اس پہلو اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی اس (عجیب و غریب) خصوصیت پر غور کرنے سے رب العالمین کی کمال قدرت، اس کی حکمت و دانائی، اس کی محکم صنعت، اس کی منفرد ربوبیت و وحدانیت اور مخلوقات پر اس کی حکمرانی و قہرمانی کا حال واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس (عظیم و برتر ہستی) کے علاوہ سب کے سب متضادات (ایک دوسرے کی ضد) کا مجموعہ ہیں۔ نیز یہ کہ وہی ایک غنی اور بے نیاز ہے اور اس کے سوا سب کے سب محتاج اور حاجت مند ہیں۔

ان احادیث صحیحہ میں علاج و معالجہ کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ توکل کے منافی نہیں ہے جس طرح کہ بھوک پیاس اور گرمی و سردی کا ازالہ ان کی ضد سے کرنا توکل کے منافی نہیں ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ توحید کی حقیقت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ان اسباب کو چھیڑا نہ جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے تقدیری اور شرعی دونوں حیثیتوں سے مسبّبات کے (لازمی) تقاضوں کے طور پر پورے عالم رنگ و بو میں پھیلا رکھا ہے (مطلب یہ کہ مسببات کے حصول کے لیے ان اسباب سے تعرض کرنا لازمی ہے۔ جب تک پانی نہ پیا جائے پیاس زائل نہ ہوگی، جب تک غذا نہ استعمال کی جائے بھوک دور نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب تک جہاد نہ کیا جائے دشمن کا زور اور غلبہ دور نہیں ہو سکتا، جب تک طاقت حاصل نہ کی جائے کسی کو زیر نہیں کیا جا سکتا، جب تک کسی قوم کے پاس مناسب ہتھیار اور اسلحہ موجود نہ ہوں وہ کسی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (قس علیٰ ذالک۔)

اس میں رد ہے ان لوگوں کا جو دوا دارو کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر شفا ہمارے لیے مقدر ہے تو دوا چنداں مفید نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر شفا مقدر نہیں ہے تب بھی دوا سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے[1]

(حاشیہ صفحہ ۳۷ پر)

یہ بیان کیا ہے مختلف حکمتوں اور عبرتوں سے بھرپور اسباق وبصائر کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ اصول وکلیات صرف طب وصحت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دراصل ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں بھی اسباب وعلل کی کارفرمائی کا یہی حال ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی عالم اسباب سے الگ اور آزاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو کچھ اس ڈھنگ سے پیدا کیا ہے کہ اس کا ہر ذرہ اور ہر فرد دوسرے ذرہ اور دوسرے فرد سے بندھا ہوا ہے اور کوئی کسی سے مستغنی اور بے پرواہ نہیں ہے۔ استغناء صرف ایک ذات برحق کی شان ہے۔ ورنہ تمام مخلوقات محتاج اور عالم اسباب کے وسیع سلسلوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ (باقی آئندہ)

(صفحہ ۲۶ کا حاشیہ) زاد المعاد، ۲/۶۲ (قوسین کے درمیان کے الفاظ اور توضیحی جملے اضافہ شدہ ہیں)

فلسفہ حدودِ اسلامی پر ایک نظر

(جناب شاہد علی صاحب عباسی ایم۔ اے (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ عثمانیہ)

(قسط دوم)

نفس کا خاصہ ہے کہ کسی بھی قسم کی پابندی و مشقت سے الّا یہ کہ لذت آور ہو دور بھاگتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قوانین صحت کی پابندی کے دلآویز نتائج سے واقف ہوتے ہوئے بھی پوری پابندی نہیں کرتا۔ کیا اس عدم پابندی کے باعث قوانین صحت کی سچائی کسی بھی درجہ میں متاثر ہو سکتی ہے؟ قرنِ اول کا صالح معاشرہ اگرچہ بہت ہی قلیل مدت تک قائم رہا لیکن ایک تو یہ معلوم ہو گیا کہ اسلامی اصول نظری اعتبار ہی سے نہیں بلکہ عملی اعتبار سے بھی ممکن الوقوع ہیں، دوسرے یہ کہ اسلامی اصول کی پابندی جتنی زیادہ کی جائے گی فرد اور اجتماع دونوں ہمہ جہت اتنی ہی ترقی کریں گے۔

صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے بے شک چھوٹے بڑے جرائم سرزد ہوئے لیکن ارتکاب جرم نے اس عہد منفرد کی کئی خصوصیات سامنے کر دیں۔ ایک تو ارتکاب گناہ کے فوری بعد مثبت احساسِ ندامت، دوسرے انابت الی اللہ تعالیٰ کی شدت جس سے نہ صرف جرم کے جراثیم قوی اور متعدی نہ ہو سکے بلکہ مدارج اخروی بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔ ایسا معاشرہ جس میں جرم و گناہ کا امکان ہی باقی نہ رہے جنت ہی میں ہو گا؛ یہاں تو دیکھنا یہ چاہیے کہ نفسِ امّارہ تا نفسِ مرضیہ نفوس کی شرح فی صد کیا ہے۔ مزید برآں

صحابہ کا ایک بڑا طبقہ نفس کی چھیڑ چھاڑ سے اگرچہ محفوظ نہ تھا مگر چھیڑ چھاڑ اور غلبہ میں ایک فاصلۂ عظیم ہے۔

نصب قضاء چونکہ فرض ہے[۱] جب تک قاضی کو دائرۂ شریعت میں انصاف پر مبنی فیصلہ کرنے کا اختیار رہے، سلطان عادل و جائر[۲] بلکہ اہلِ بغاوت کی طرف سے بھی عہدۂ قضاء قبول کرنا جائز ہے اور اس کے قضایا تا وقتیکہ حدودِ شرع سے متجاوز نہ ہوں نافذ ہوں گے۔ سلطانِ جائر یا اہلِ بغاوت کا اقتدار پر آنا ہی ایک قیامت ہے، اگر کارِ قضاء بھی معطل ہو جائے تو سرکشوں اور بدمعاشوں کی بن آئے اور ایک طرح کی انارکی اور فتنہ پھیل جائے۔

رہی معاشرہ کی اصلاح سے پہلے نفاذِ حدود کے ظلم ہونے کی بات سو کچھ تو محررہ بالا تحریر پر اور کچھ اس پر غور کرنا چاہیے کہ آج اگر نفاذ حدود کے لیے اصلاحِ معاشرہ کی شرط رکھی جائے، اصلاحِ معاشرہ کے لیے افہام وتفہیم کی شرط رکھی جائے، افہام وتفہیم کے لیے عدم جبر کی شرط رکھی جائے اور آخر کار بات اگر قبول از خود پر ٹھہرے تو اصلاح معاشرہ کے حقیقی امکانات بوجہ مرض کے کہنہ ہونے کے چند ہی فیصد ہوں گے۔ سید قطب شہید اور سید ابوالاعلیٰ مودودی (رحمہما اللہ تعالیٰ) کا زمانہ قحط میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل سے اس پر استدلال کرنا تعجب خیز ہے۔ بہرحال آج صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقدامات نہ صرف مختلف گوشوں میں بیک وقت شروع ہوں بلکہ تمام ممکنہ ذرائع بھی بھرپور طور پر استعمال ہوں، اس کے لیے ایک[۱] تو اخلاص اور حوصلہ کی ضرورت ہے، دوسرے[۲] دیانت دار آہنی اشخاص کا حصول۔ یہاں حضرات علماء سے ہم چند اہم سوالات کرنا چاہتے ہیں:

(۱) شریعت کے نفاذ میں کن کن چیزوں کی رعایت ضروری ہے؟ حالات؟ وقت؟ عوام کا مجموعی رجحان؟

(۲) اگر یہ خطرہ ہو کہ احکامِ شریعت کل کے کل ایک دم نافذ کر دیے جائیں تو ممکن ہے کہ ردعمل منفی ہو اور آگے چل کر نفاذِ شریعت متاثر ہو تو کیا رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ راہ ہموار کی جا سکتی ہے؟ یعنی بعض چیزیں بمقتضائے وقت معطل رکھی جائیں، مگر ارادہ ان کو نافذ

کرنے کا ہو۔؟

حدِّ زنا | اب بطور ماڈل حدِّ زنا سے متعلق مندرجہ ذیل مجمل خاکہ ملاحظہ فرمائیے جسے قرآن وحدیث، کتب تفسیر و شرح حدیث اور مذاہب اربعہ و ظاہریہ کی معتبر و مستند کتابوں کی روشنی میں اختصار کے پیش نظر بشکل دفعات ترتیب دیا گیا ہے۔

(۱) زنا کی تعریف : زنا[۵۵] وہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی عورت کی شرمگاہ (قُبُل) میں جو نہ صرف ہر دو طرح کی مِلک اور دونوں کے شبہ ہی سے خالی ہو بلکہ شبہتہ اشتباہ سے بھی خالی ہو بطریق حرام اپنی خواہش پوری کرے یا کوئی عورت کسی مرد کو اپنے اوپر ایسے ہی فعل کا قابو دے دے۔ پس مجنون اور طفلِ عاقل کی وطی زنا نہ ہوگی کیونکہ ان دونوں کا فعل بصفتِ حرمت موصوف نہیں۔ اور رکن[۵۶] زنا یہ ہے کہ التقائے ختانین و موالاۃِ حشفہ پایا جائے کیونکہ دخول و وطی اسی سے ثابت ہوگی۔

علم بالتحریم کی شرط : (۳) شرطِ زنا یہ ہے کہ فاعل حرمت[۵۷] زنا سے واقف ہو حتیٰ کہ لاعلمی پر شبہ واقع ہونے کے باعث حد قائم نہ کی جائے گی۔

حاکم یا قاضی کی جرح شہادت : (۴) زنا قاضی کے پاس اس طرح ثابت[۵۸] ہوگا کہ چار گواہ لفظ زنا کی صراحت کے ساتھ گواہی دیں، لفظ وطی یا جماع کافی نہیں۔ جب چار گواہوں نے مجلس واحد میں کسی شخص پر زنا کی گواہی دیدی تو قاضی ان سے پوچھے گا کہ زنا کیا چیز ہے؟ اور ملزم نے کہاں زنا کیا؟ اگر گواہوں نے زنا کی صحیح تعریف بیان کر دی اور کہا کہ ہم نے دیکھا کہ ملزم کا المیل فی المکحلۃ (سرمہ دانی کے اندر سلائی کی طرح) دخول کیا تو اب ان سے قاضی کیفیت زنا پوچھے گا، پھر کیفیت زنا اگر بتا دی تو ان سے وقت دریافت کرے گا، جب گواہوں نے ایسا وقت بتایا کہ اس کو زمانۂ دراز نہ گزرا ہو تو قاضی سوال کرے گا کہ کس عورت سے زنا کیا؟ اور کس جگہ کیا؟ مکان بتائے جانے کے بعد اگر قاضی گواہوں کی عدالت سے بخوبی واقف ہو تو اب ملزم کی طرف متوجہ ہوگا اور مشہود علیہ یا مشہود علیہا سے

اس کا احصان دریافت کرے گا، اگر اس نے اپنے محصن ہونے کا اقرار کیا یا بصورت انکار گواہوں نے اس کے احصان پر گواہی دی تو اب قاضی مشہود علیہ سے احصان کی تعریف پوچھے گا کہ احصان کس کو کہتے ہیں؟ اگر اس نے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تو قاضی اس کو رجم (سنگسار) کرے گا اور اگر احصان گواہوں سے ثابت ہوا اور انھوں نے احصان کی صحیح تعریف بیان کر دی تو اس کا رجم کرنا واجب ہوگا۔

احصان کی تعریف : (۵) رجم کے واسطے جو احصان[۵] معتبر ہے وہ یہ ہے کہ آزاد عاقل بالغ مسلمان ہو کہ جس نے کسی آزاد عورت سے بنکاحِ صحیح نکاح کیا اور اس سے دخول کر لیا ہو اور وہ دونوں صفت احصان پر موجود ہوں۔

(۶) احصان[۵] کا ثبوت یا تو (ا) باقرار ہوتا ہے، یا (ب) دو مردوں کی گواہی سے یا (ج) ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے۔

سزائے غیر محصن : (۷) اگر غیر محصن[۶] ہو تو اس کی حد (سزا) سو کوڑے ہیں بشرطیکہ آزاد ہو اور اگر غلام ہو تو پچاس کوڑے ہیں۔

گواہی : (۸) چار مسلمان[۷] آزاد مردوں کی گواہی زنا پر ضروری ہے، اگر چار سے کم ایک یا دو یا تین آزاد مردوں نے گواہی دی تو گواہی مردود قرار دی جائے گی اور گواہوں کو حد قذف (اسی کوڑے) لگے گی۔

(۹) اگر چار گواہوں[۸] میں کوئی ایک گواہ غلام[۹] یا مکاتب[۱۰] یا کافر[۱۱] یا محدود[۱۲] القذف یا اندھا[۱۳] یا طفل[۱۴] نکلے تو سوائے طفل کے سب گواہوں کو حد قذف ماری جائے گی اور مشہود علیہ کو حد نہ ماری جائے گی۔

(۱۰) اگر[۱۵] چار فاسق گواہی دیں یا گواہ راستبازی کی جانچ میں ٹھیک نہ ثابت ہوں تو مشہود علیہ پر حد جاری کی جائے گی اور نہ ان گواہوں پر کیونکہ وہ تعداد میں چار ہیں۔

شہادت[۱۶] کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مجلس شہادت متحد ہو حتی کہ اگر گواہوں نے

مختلف مجلسوں میں گواہی دی تو ان کی گواہی قبول نہ کی جائے گی اور سب کو حد قذف دی جائے گی۔

(۱۲) اگر چار گواہوں نے کسی مرد پر زنا کی گواہی دی لیکن کیفیت و ماہیت بتانے سے انکار کیا یا بعض نے کیفیت و ماہیت بیان کی اور بعض نے بیان نہ کی تو نہ گواہی قبول ہوگی اور نہ خود گواہوں پر حد قذف واجب ہوگی کیونکہ تعداد کا مل ہونا وجوب سے مانع ہے۔

(۱۳) اگر چار گواہوں نے ایک شخص پر زنا کی گواہی دی مگر جس عورت سے زنا کیا ہے اس میں اختلاف کیا، یا زنا کی جگہ میں اختلاف کیا، یا زنا کے وقت میں اختلاف کیا تو ان کی گواہی باطل ہوگئی لیکن گواہوں پر حد واجب نہ ہوگی۔

اقرارِ زنا: (۱۴) زنا کا ثبوت مرد یا عورت کے اقرار سے بھی ہوتا ہے، اس سلسلے میں تین باتیں اہم ہیں:

(۱) اگر مُقِر (اقرار کرنے والے) نے قاضی کے بجائے کسی دوسرے کے سامنے جس کو اقامتِ حدود کا اختیار نہیں، اقرار کیا تو اگرچہ اقرار چار مرتبہ کیا ہو غیر معتبر ہے۔

(ب) اقرار کا صریح ہونا اور اس کے کذب کا ظاہر نہ ہونا ضروری ہے۔

(ج) اور یہ بھی ضروری ہے کہ اقرار حالتِ ہوش میں ہو چنانچہ اگر اس نے نشہ میں اقرار کیا تو اس کو حد زنا نہ ماری جائے گی۔

صورتِ اقرار: (۱۵) اقرار کنندہ عاقل بالغ اپنی ذات پر چار مرتبہ اپنی چار مجلسوں میں زنا کرنے کا اقرار کرے۔ بعض کے نزدیک مجالس قاضی کا اعتبار ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک اقرار کنندہ کی مجلسوں کا مختلف ہونا شرط ہے، چنانچہ مجلس واحد میں اگر اس نے چار مرتبہ اقرار کیا تو یہ بمنزلہ ایک اقرار کے ہے۔

تلقینِ رجوع: (۱۶) اقرار کنندہ کو تلقین کرنا جس سے حد دور ہو جائے مندوب ہے اس لیے قاضی کو چاہیے کہ اقرار کنندہ کو اقرار پر جھڑکے اور کراہت ظاہر کرے بلکہ ایک طرف

دور کر دینے کا حکم دے۔ اب اگر اس نے چار مرتبہ اقرار کر لیا تو جوازِ اقرار کے لیے اس کے صحیح العقل ہونے کی تحقیق کرے گا چنانچہ اس سے دریافت کرے گا کہ زنا کیا ہے؟ کیوں کر ہوتا ہے؟ کس کے ساتھ کیا ہے؟ کہاں کیا ہے؟ کیونکہ اس میں شبہ کا احتمال ہے، زمانہ بھی پوچھے گا کیونکہ ممکن ہے کہ ایام نابالغی میں زنا کیا ہو۔ جب زنا ثابت ہوگیا تو پوچھے گا کہ آیا وہ محصن بھی ہے؟ اگر اس نے اقرار کیا تو احصان کی تعریف پوچھے گا، اگر احصان کی تعریف بھی ٹھیک ٹھیک بیان کر دی تو پھر رجم (سنگساری) کا حکم دے گا۔

رجوعِ مُقِر: (۱۷)[۱۹] اگر اقرار کنندہ نے اقامتِ حد سے پہلے یا عین بیچ میں اپنے اقرار سے رجوع کر لیا تو رجوع قبول کیا جائے گا اور اس کی راہ چھوڑ دی جائے گی، رجوع میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔

(۱۸)[۲۰] اور اگر اقرار کنندہ نے رجوع نہ کیا لیکن بھاگا تو اس سے تعرض نہ کیا جائے گا، یا اقرارِ زنا پر تو قائم رہا لیکن محصن ہونے سے رجوع کیا تو یہ رجوع قبول ہوگا اور بجائے سنگساری کے کوڑے مارے جائیں گے۔

اعتبارِ تقادم: (۱۹)[۲۱] تقادمِ عہد (تمادیِ ایام) جس طرح ابتداءً قبولِ شہادت میں مانع ہے اسی طرح قضاء کے بعد اقامت سے مانع ہے چنانچہ اگر تھوڑی حد قائم کیے جانے کے بعد وہ بھاگ گیا، پھر تقادمِ عہد کے بعد گرفتار ہو کر آیا تو اس پر باقی حد قائم نہ کی جائے گی، امام محمدؒ نے تقادم کی مدت ایک ماہ مقرر کی ہے اور یہی امام اعظم اور امام ابو یوسف (رحمہما اللہ تعالیٰ) سے مروی ہے۔

کیفیتِ سزا: (۲۰)[۲۲] حدود مسجد میں قائم نہ کی جائیں گی۔

(۲۱)[۲۳] مسلمانوں کے ایک گروہ کو قیامِ حدود کے وقت موجود رہنا چاہیے۔

(۲۲)[۲۴] مرد کے بدن پر صرف ایک ازار رہے گی اور تمام حدود میں کھڑے ہونے کی حالت میں سزا دی جائے گی، عورت کسی صورت میں برہنہ نہ کی جائے گی لیکن زائد کپڑے

(الحشو والفروۃ) اتارلیے جائیں گے اور اگر عورت کے بدن پر سوائے حشو وفروہ کے کچھ نہ ہو تو یہ نہ اتارے جائیں گے اور عورت کو بٹھلا کر حد ماری جائے گی۔

(۲۳) کوڑے کے تسموں پر گھنڈی نہ ہو اور چوٹ درمیانی درجہ کی لگائی جائے، نہ ایسی کہ زخم پہنچائے اور نہ ایسی کہ تکلیف ہی نہ ہو۔

(۲۴) جس کوڑے سے مارا جائے وہ بھی درمیانی قسم کا ہونا چاہیے، نہ بہت سخت ہو اور نہ بہت نرم، اور ہاتھ اتنا ہی اوپر اٹھے کہ بغل دکھائی نہ دے۔

(۲۵) کوڑے سوائے چہرہ، سر اور شرمگاہوں کے تمام بدن پر متفرق مارے جائیں گے۔

(۲۶) کسی حد میں نہ ممدود کیا جائے گا نہ پکڑا یا باندھا جائے گا بلکہ کھڑا چھوڑ دیا جائے گا الّا یہ کہ وہ لوگوں کو عاجز کرے۔ ممدود کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ زمین پر ڈال دیا جائے اور کھینچا جائے، یا مارنے والا کوڑے کو کھینچے اور سر پر بلند کرے، یا مارنے کے بعد کھینچے یہ سب اس لیے نہ کیا جائے کہ یہ استحقاق پر زیادتی ہوگی۔

(۲۷) سخت گرمی یا سخت جاڑے میں حد قائم نہ کی جائے گی، اسی طرح شدت گرمی یا شدید جاڑہ میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(۲۸) اگر مریض پر حد رجم (سنگساری) واجب ہوئی تو فوری قائم کر دی جائے گی اور اگر کوڑے واجب ہوئے ہوں تو صحتیابی کا انتظار کیا جائے گا، اگر ایسا مرض ہو جس کے زائل ہونے کی امید نہ ہو جیسے سل وغیرہ یا یہ شخص ناقص، ضعیف الخلقت ہو تو اس کو ایک عثکال جس میں سو کشادہ تسمے ہوں اس طرح مارا جائے کہ ہر تسمہ بدن پر لگے، اور اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک ولادت کے بعد نفاس سے فارغ نہ ہو لے اسے حد نہ ماری جائیگی۔

(۲۹) رجم (سنگساری) کی صورت میں مرد کے لیے گڈھا (الحفرۃ) نہ کھودا جائے گا، اس کے برخلاف عورت کے لیے مناسب یہ ہے کہ سینہ تک گڈھا کھودا جائے اور اگر نہ کھودا گیا تو کچھ مضر نہیں۔

متفرقات : (۳۰)[۳۲] جب رجم شہادت سے ثابت ہوا ہو تو واجب ہے کہ پہلے گواہ رجم کریں، پھر امام اور پھر دوسرے لوگ۔ اگر گواہوں نے ابتداء کرنے سے انکار کر دیا تو مشہود علیہ سے حد ساقط ہو جائے گی مگر گواہوں پر حد قذف واجب نہ ہوگی کیونکہ سنگساری میں ابتداء سے انکار کرنا صریح رجوع از شہادت نہیں۔

(۳۱)[۳۳] اگر اس شخص نے خود اقرار کیا ہو تو امام المسلمین ابتداء کرے، پھر عام مسلمان رجم کریں۔

(۳۲)[۳۴] مرجوم کو غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا اور اس پر نماز پڑھی جائیگی۔

(۳۳)[۳۵] شبہ سے حد واجب نہ ہوگی، شبہ کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

(ا) شبہہ در فعل یا شبہۃ الاشتباہ :۔ یعنی غیر دلیل الحل کو دلیل گمان کرنا۔

(ب) شبہہ در محل یا شبہہ حکمیہ :۔ یعنی محل میں کوئی دلیل حلیت کی قائم ہے مگر اس کا عمل کسی مانع کے سبب ممتنع ہو گیا۔

(ج) شبہہ در عقد

(۳۴)[۳۶] زنا اگر جبر و اکراہ کے تحت ہو تو مجبور پر حد نہیں۔

(۳۵)[۳۷] جو شخص کبھی مجنون ہو جاتا ہو اور کبھی اس کو افاقہ ہوتا ہو وہ اگر حالتِ افاقہ میں زنا کرے تو حد زنا کے لیے ماخوذ ہوگا اور اگر وہ کہے کہ اس نے حالتِ جنون میں زنا کیا تو حد جاری نہ ہوگی کالبالغ اذا قال زنیت وانا صبی۔

(۳۶)[۳۸] اگر کوئی کئی مرتبہ زنا کرے اور اسے اب تک حد نہ لگی ہو تو ایک بار ہی حد لگائی جائے گی۔

(۳۷) محصن کے حق میں کوڑے اور سنگساری[۳۹] دونوں اور غیر محصن (باکرہ) کے حق میں کوڑے اور ایک سال کی تغریب (شہر بدر کرنا)[۴۰] دونوں جمع نہ کیے جائیں گے۔ ہاں تغریب امام المسلمین پر موقوف ہے، اگر مصلحت سمجھے تو از راہِ سیاست و تعزیر شہر بدر کر دے۔

(۳۸) اگر قاضی فقیہ عادل ہو تو لوگوں کو ادائے شہادت کا معائنہ کیے بغیر رجم کرنے کی گنجائش ہے اور اگر قاضی فقیہ غیر عادل یا عادل غیر فقیہ ہو تو لوگوں کو جب تک کہ ادائے شہادت کا بذاتِ خود معائنہ نہ کرلیں، رجم کرنا روا نہیں۔

خلاصۂ و نتائج (۱) فاعل کو حرمتِ زنا کا علم رہنا شرط ہے۔

(۲) رجم کے لیے احصان اور تجلید کے لیے عقل و بلوغ شرط ہے۔

(۳) شبہہ سے خالی ہونا ضروری ہے۔

(۴) چار عادل گواہوں کا مجلس واحد میں کالمیل فی المکحلۃ کا مشاہدہ مع دیگر متفق علیہ تفصیل کے بتانا اور سنگساری کی صورت میں ابتداء کرنا شرط ہے۔

(۵) بصورت اقرار مُقِر (اقرار کرنے والے) کا باہوش ہونا اور الفاظ کا صریح ہونا شرط ہے، مزید برآں اقرار چار بار اور چار مجالس میں ہونا ضروری ہے، اس پر مستزاد قاضی کی تفصیلی تحقیق و تلقین اور فیصلہ کے بعد بھی حقِ رجوع ہے۔

(۶) مریض، ضعیف الخلقت اور حاملہ و نفساء کی رعایت۔

(۷) مجبور پر حد نہیں۔

(۸) تمادی ایام قبولِ شہادت اور فیصلہ کے بعد اقامت ہر دو میں مانع ہے۔

زناکاری کے اثرات[۴۲] (۱) حد سے متجاوز جنسی انہماک خلل اعصاب اور Functional Psychoses کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔

(۲) جنسی بداعتدالیوں کے جسمانی اثرات Manic Depressive Paranoid اور Schizophrenic جیسے دماغی امراض کے پیدا کرنے میں خاصا اہم حصہ لیتے ہیں۔ مزید برآں زانی کے جذبات، خواہشات، خیالات، اخلاق و سماجی قدروں میں عدم توازن اس کے اندر شدید اندرونی کشمکش، پُر تشدد جذبات، مسلسل دماغی تناؤ نیز تصادم پیدا کرنے کا خاص سبب ہوتا ہے، چنانچہ ریاستہائے متحدہ

امریکہ میں Psychoneuroses میں اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ متعدد تخمینوں کے مطابق یہاں کی بالغ آبادی کے ۲۵ سے ۵۰ فیصدی کے درمیان افراد کسی نہ کسی حد تک دماغی طور پر بیمار رہیں۔

(۳) اوباش و بدکار لوگ شاذونادر ہی بڑھاپے تک پہنچ پاتے ہیں۔

(۴) امراضِ خبیثہ

(۵) امراضِ قلب

(۶) جنسی ہسٹریا

(۷) کینسر کے دیگر اسباب میں سے ایک سبب آزادانہ جنسی اختلاط اور ایک قبل از وقت بلوغ نسوانی بھی ہے۔

(۸) خودکشی کی ترغیب (ناکامی کی صورت میں)

(۹) خاندانی زندگی کا انحطاط، رشتۂ ازدواج کی ناپائیداری اور طلاق و تفریق کی کثرت۔

زناکاری کے ان اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے متذکرہ بالا[۴۳] اسلامی حدود کے فلسفہ پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مجرم و معاشرہ دونوں کے جرم سے پہلے، جرم کے دوران اور جرم کے مابعد کیفیات کے تجزیہ و تحلیل اور اس کے عمیق مطالعہ پر مبنی ہے۔

واالعلم عند اللہ تعالیٰ۔

المراجع

[۱] نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث سید الاخیار للعلامہ قاضی قضاۃ القطر الیمانی محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۵ھ۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ بمصر للمرۃ الثانیہ ۱۳۴۴ھ (رمز نیل) ج ۹ باب وجوب نصبۃ ولایۃ القضاء والامارۃ وغیرھا۔ اور علامہ

ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں۔ "فنصب القاضی فرض لانہ ینصب لاقامۃ أمر مفروض وھو القضاء الخ" بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ ج ۷ ص ۲۔

۵۲ ہدایہ ج ۳ ص ۱۷ المطبوعہ محولہ بالا۔ لسان الحکام فی معرفۃ الاحکام للامام ابی الولید ابراہیم بن محمد المعروف بابن الشحنۃ الحلبی الحنفی المتوفی ۸۸۲ھ۔ مطبعۃ جریدۃ البرہان الاسکندریۃ ۱۲۹۹ھ (رمز "لسان") ص ۳۔

۵۳ "احکام القرآن" للقاضی أبی بکر محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد المعروف بابن العربی المعافری الاندلسی الاشبیلی المالکی المتوفی ۵۴۲ھ۔ مطبعۃ السعادۃ۔ بمصر الطبعۃ الاولی ۱۳۳۱ھ (رمز "احکام") ج ۲ ص ۸۳۔ "التفسیر المظہری" للعلامۃ القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی المظہری المجددی الفانی فتی المتوفی ۱۲۲۵ھ۔ ندوۃ المصنفین۔ الدہلی۔ غ۔م۔ (رمز "المظہری") ج ۶۔ ص ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۳ و ۴۹۸، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للعلامۃ أبی بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی ۵۸۷ھ۔ (رمز "بدائع") ج ۷ ص ۳۳۔ ۳۴۔ المغنی للعلامۃ موفق الدین أبی محمد عبداللہ بن احمد بن قدامۃ المتوفی ۶۳۰ھ مطبعۃ المنار۔ بمصر ۱۳۴۸ھ بتصحیح السید رشید رضا۔ الطبعۃ الاولی ج ۱۰ ص ۱۶۹۔ (رمز "المغنی") الشرح الکبیر علی متن المقنع للامام شمس الدین أبی الفرج عبدالرحمن بن أبی عمر محمد بن أحمد بن قدامۃ المقدسی المتوفی ۶۸۲ھ الطبعۃ الاولی۔ مطبعۃ المنار بمصر ۱۳۴۵ھ بتصحیح السید رشید رضا (رمز "المقدسی") ج ۱۰ ص ۱۱۹۔ وفی المغنی "الزانی من أتی الفاحشۃ من قبل أو دبر" ج ۱۰ ص ۱۵۱۔ وفی المقدسی "وحد اللوطی کحد الزانی سواء وعنہ حدہ الرجم لکل حال" ج ۱۰ ص ۱۷۵۔ ولکن عند الامام الشافعی کما فی کتاب الأم۔ ج ۷ ص ۱۶۹ وقال ایضاً "لایرجم [اللوطی] الا أن یکون قد أحصن" فتاوی عالمگیری مطبع منشی نولکشور۔ غ۔م (رمز "عالمگیری") ج ۲ ص ۳۲۷ ملخصاً۔

۵۴ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷۔ وفی المقدسی "وأقل ذلک تغییب الحشفۃ فی الفرج"

ج ۱ ص ۱۸۰۔

ھ تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر للحافظ أبی الفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ شرکۃ الطباعۃ الفنیہ المتحدۃ بالقاہرہ ۱۳۸۴ھ (رمز "تلخیص") ج ۴ ص ۶۱۔ المحلی لابی محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ بمصر بتحقیق محمد منیر الدمشقی ۱۳۵۲ھ (رمز "المحلی") ج ۱۱ ص ۲۲۹۔ اختلاف الفقہاء للامام أبی جعفر احمد بن محمد الطحاوی المتوفی ۳۲۱ھ۔ مطبعۃ معہد البحوث الاسلامیہ اسلام آباد بتحقیق محمد صغیر حسن المعصومی۔ غ۔م۔ ج ۱ ص ۱۵۷ (رمز "اختلاف") المغنی ج ۱۰ ص ۱۵۶۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۰-۱۲۱ اور ص ۱۸۴۔

لہ احکام ج ۱ ص ۱۴۹۔ السنن الکبریٰ لابی بکر احمد بن علی البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ مع الجوہر النقی لابن الترکمانی المتوفی ۷۴۵ھ۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ۔ (رمز "بیہقی") ج ۸ ص ۲۳۰-۲۳۱۔ بدائع ج ۷ ص ۴۹۔ (اب آگے صرف کتابوں کے نام دیں گے) فتاویٰ قاضیخاں (رمز "قاضیخاں") ج ۳ ص ۴۷۷۔ مغنی المحتاج للشربینی (رمز "الشربینی") ج ۴ ص ۱۴۹-۱۵۰۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۶-۱۹۷۔ کنز الدقائق (اردو۔ رمز "کنز") کتاب الحدود۔ المختصر القدوری (رمز "قدوری") ص ۱۸۵۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۷ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷ دفی المقدسی یشترط فی شہود الزنا سبعۃ شروط (۱) ان یکونوا اربعۃ (۲) ان یکونوا رجالاً کلھم (۳) الحریۃ (۴) العدالۃ (۵) ان یکونوا مسلمین (۶) ان یصفوا الزنی (۷) مجیٔ الشہود کلھم فی مجلس واحد" ج ۱۰ ص ۱۹۵-۱۹۸ وکذا فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۵-۱۷۹

که فی المقدسی "یشترط للاحصان شروط سبعۃ (۱) الوطء فی القبل (۲) ان یکون فی نکاح (۳) ان یکون النکاح صحیحاً (۴) الحریۃ (۵) البلوغ (۶) العقل (۷) ان یجد الکمال فیھما جمیعاً حال الوطء فیطأ الرجل العاقل الحر امرأۃ عاقلۃ حرۃ" ج ۱۰ ص ۱۵۸-۱۶۱ وذکرت ایضاً فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۶-۱۲۹۔ وزاد فی بدائع۔

(۸) الاسلام" ج ۷ ص ۳۷ وکذافی قاضیخاں ج ۳ ص ۷۹۴ ء لکن فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۹، فی المقدسی ج ۱۰ ص ۱۶۲ "لا یشترط الاسلام فی الاحصان..... وقال عطاء والنخعی والشعبی و مجاهد والثوری هو شرط فی الاحصان" قدوری ص ۱۸۵۔ السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ (اردو) ص ۲۰۹۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۱-۴۹۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: المظہری ج ۶ ص ۴۲۶۔ ۴۲۹۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۶-۲۵۹۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۳۹-۱۴۱۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۱۳-۲۱۷۔ بدایۃ المجتہد لابن رشد الحفید (رمز "بدایۃ المجتہد") ج ۲ ص ۴۳۶۔ اور المیزان الکبریٰ لعلامہ عبدالوہاب الشعرانی (رمز "المیزان") ج ۲ ص ۱۴۳۔

۸ھ فتاوی قاضیخاں ج ۴ ص ۷۹۴۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸۔ المدونۃ الکبریٰ للامام مالک روایۃ الامام سحنون التنوخی عن الامام عبدالرحمٰن بن قاسم۔ (رمز "المدونۃ") ج ۴ ص ۳۹۷ لیکن امام مالک کے نزدیک عورتوں کی شہادت احصان میں بھی قبول نہ کی جائے گی، چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب وصفحہ مذکورہ۔

۹ھ تفسیر جامع البیان للطبری ج ۱۸ ص ۳۶۔ تفسیر فتح القدیر للشوکانی (رمز "فتح القدیر") ج ۴ ص ۳۔ کتاب الأم للشافعی (رمز "کتاب الأم") ج ۶ ص ۱۴۴۔ الرسالۃ للشافعی ص ۶۷۔ و ۱۲۸-۱۳۷۔ بدائع ج ۷ ص ۵۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۷۸۴۔ المیزان ج ۲ ص ۱۴۳-۱۴۴۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ کنز، کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۵ تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے۔ احکام القرآن للجصاص الرازی (رمز "الجصاص") ج ۲ ص ۲۰۵-۲۰۶۔ المظہری ج ۶ ص ۴۱۷۔ کتاب الأم ج ۶ ص ۱۲۱-۱۲۲۔ الرسالۃ للشافعی ص ۱۲۸-۱۳۷۔ المحلی ج ۱۱ ص ۲۳۶-۲۴۲۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۱۰-۲۱۳۔ نیل الاوطار ج ۷ "باب ماجاء فی رجم الزانی المحصن وجلد البکر وتغریبہا" اور باب حد الرقیق خمسون جلدۃ" شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۶۵ و ص ۷۰-۷۱۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۵۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۴۲-۱۵۱۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۴۰-۱۷۵۔ ہدایہ ج ۲ ص ۲۸۹-۲۹۰۔

نلہ المظہری ج ۶ ص ۴۳۵ ـ بیہقی ج ۸ ص ۲۳۴ ـ ۲۳۵ ـ المدونۃ ج ۴ ص ۳۸۳ ـ کتاب الام ج ۶ ص ۱۲۲ ـ ۱۲۳ ـ المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۹ ـ ۱۸۰ ـ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۹ ـ ۲۰۰ ـ بدائع ج ۷ ص ۴۷ ـ ۴۸ ـ کنز (اردو) کتاب الحدود ـ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۳ ـ

للہ کنز کتاب الحدود ـ ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۳ ـ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۵ ـ اختلافی بحث کے لیے دیکھیے کتاب الام ج ۷ ص ۱۴ ـ المغنی ج ۱۰ ص ۱۸۱ ـ ۱۸۲ ـ المقدسی ج ۱۰ ص ۲۰۰ بدائع ج ۷ ص ۵۹ ـ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۸ ـ

۲لہ کتاب الخراج لابی یوسف (اردو) ص ۲۶۴ ـ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۸ ـ وفی اختلاف الفقہاء للطحاوی" قال اصحابنا وعثمان البتی واللیث لاحد علیھم .... وقال مالک یحد الشھود وھو قول عبد اللہ بن حسن" ج ۱ ص ۱۴۶ ـ

۳لہ المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۸ ـ ۱۷۹ ـ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۷ ـ ۱۹۸ ـ بدائع ج ۷ ص ۴۸ ـ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۷ ـ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۳ ـ وفی المیزان " ھکذا عند الائمۃ الثلاثۃ مع قول الشافعی انہ لا بأس بتفریقھم ووجہ الاول طلب التثبت فی اقامۃ الحد ووجہ الثانی المبادرۃ الی التطھیر اذ اکمل النصاب ولو فی مجلس بحسب اجتہاد الحاکم ومایراہ من الحظ الاوفی والمصلحۃ للمسلمین ـ" ج ۲ ص ۱۷۶ ـ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۲ ـ

۴لہ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷ ـ

۵لہ المدونۃ ج ۴ ص ۴۰۱ ـ ۴۰۲ ـ بیہقی ج ۸ ص ۲۳۵ ـ بدائع ج ۷ ص ۴۸ ـ ۴۹ ـ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۶ ـ ہدایہ ج ۲ ـ ص ۵۰۱ ـ ۵۰۲ ـ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۴ ـ

۶لہ بدائع ج ۷ ص ۴۹ ـ ۵۰ ـ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷ ـ

۷لہ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۳ ـ بدائع ج ۷ ص ۵۰ ـ قدوری ص ۱۸۵ ـ ترمذی ج ۱ ص ۱۷۱ ـ ۱۷۲ ـ ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۷ ـ ۴۸۸ ـ حسن، حماد، مالک (المدونۃ ج ۴ ص ۴۰۳)

شافعی (کتاب الأم ج ۶ ص ۱۱۹)، ابو ثور اور ابن المنذر کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار کرلینا بھی حد جاری کرنے کے لیے کافی ہے کمافی المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۰ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں المظہری ج ۶ ص ۴۳۵ - ۴۳۷، نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۹ - ۲۶۵ بیہقی مع الجوہر النقی ج ۸ ص ۲۲۵ - ۲۲۸ -

۵۸ بخاری ج ۳ احادیث ۱۷۱۹ - ۱۷۲۳ - ۱۷۲۶ - ۱۷۲۷ مسلم کتاب الحدود مع شرحہ للنووی - مسند الامام الاعظم ص ۱۵۷ - ۱۶۱ - ابن ماجہ ص ۱۸۶ - ۱۸۷ تلخیص ج ۴ کتاب حد الزنا نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۶۵ - ۲۶۷ اور ص ۲۵۹ - ۲۶۱ - کنز کتاب الحدود - قدوری ص ۱۸۵ - بدائع ج ۷ ص ۵۱ - ۵۲ - قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۷ - وفی المقدسی " ولیعتبر فی صحۃ الاقرار ان یذکر حقیقۃ الفعل لتزول الشبھۃ " ج ۱۰ ص ۱۹۱ - وقال النووی رح " وقد جاء تلقین الرجوع عن الاقرار بالحدود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن الخلفاء الراشدین ومن بعدھم واتفق العلماء علیہ " شرح مسلم للنووی رح ج ۲ ص ۶۶ - ہدایۃ ج ۲ ص ۴۸۸ - ۴۸۹ -

۵۹ ترمذی ج ۱ ص ۱۷۱ - بدائع ج ۷ ص ۶۱ - ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۸ کنز کتاب الحدود قدوری ص ۱۸۵ - عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸ - تلخیص الحبیر ج ۴ کتاب حد الزنا - بیہقی ج ۸ ص ۲۲۸ - المقدسی وفیہ " وبھذا قال عطاء ویحیی بن یعمر والزھری وحماد ومالک والثوری واسحق وأبو حنیفۃ وأبو یوسف " ج ۱۰ ص ۱۳۸ وکذا فی المغنی وزاد فیہ اسم الشافعی - ج ۱۰ ص ۱۷۳ - غرائب القرآن للقمی وفیہ " وبہ قال أبو حنیفۃ والشافعی والثوری وأحمد واسحق " ج ۱۸ ص ۴۵ - المظہری ج ۶ ص ۴۳۷ - اختلاف ج ۱ ص ۱۴۲ - نیل الاوطار وفیہ " والی ذلک ذھب أحمد والشافعیۃ والحنفیۃ والعترۃ وھو مروی عن مالک فی قول لہ وذھب ابن ابی لیلی والبتی وأبو ثور وروایۃ عن مالک وقول الشافعی انہ لا یقبل منہ الرجوع عن الاقرار بعد کمالہ کغیرہ من الاقرارات "

ج ۷ ص ۲۶۸-۲۷۰۔

۲۰ھ المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۳-۱۷۴۔ بدائع ج ۷ ص ۶۱۔ ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸

۲۱ھ ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۰-۵۰۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۸۔ وفی المیزان ملخصاً "وھذا قول أبی حنیفۃ وعند الائمۃ الثلاثۃ ان الشھادۃ فی الزنا والقذف وشرب الخمر تسمع بعد مضی زمان طویل من الواقعۃ" ج ۲ ص ۱۷۸ بدائع وفیہ "لم یقدرہا ابوحنیفۃ رحمہ اللہ للتقادم تقدیرا وفوض ذلک الی اجتھاد کل حاکم فی زمانہ" ج ۷ ص ۴۶-۴۷۔ وکذا فی قاضیخاں بلفظہ ج ۴ ص ۷۷۴ وفیہ ایضاً "والتقادم لا یمنع صحۃ الاقرار بالزنا" ج ۴ ص ۸۷۴ تکملۃ لسان الحکام للعلامہ برہان الدین الحلبی ج ۴۴۔

۲۲ھ ابن ماجہ، باب النہی عن اقامۃ الحدود فی المسجد۔ کتاب الأم ج ۷ ص ۱۵۰۔ اختلاف۔ ج ۱ ص ۱۴۹۔ بدائع ج ۷ ص ۶۰۔ المختصر بھامش الأم ج ۵ ص ۱۷۷

۲۳ھ احکام ج ۲ ص ۸۴-۸۵۔ فی غرائب القرآن للقمی "ومعنی الطائفۃ ... وعن عطاء وعکرمۃ اثنان وعن الزھری وقتادۃ ثلاثۃ وقال ابن عباس والشافعی أربعۃ بعدد شھود الزنا وعن الحسن عشرۃ لأنہا اول عقد وجوز ابن عباس الی اربعین رجلا من المصدقین باللہ" ج ۱۸ ص ۴۶۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۷-۱۳۸۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۶۹-۱۷۰۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹

۲۴ھ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۳۸۔ مسلم مع شرحہ للنووی ج ۲ ص ۶۹۔ نیل الاوطار۔ ج ۷ ص ۲۸۲۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۷-۱۳۰۔ کنز کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۵۔ بدائع ج ۷ ص ۶۰۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۰-۴۹۱۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۸۰-۴۸۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ المختصر للمزنی بھامش کتاب الأم ج ۵ ص ۱۷۶۔

۲۵ؔ احکام ج ۲ ص ۳۸۴۔ المظہری ج ۶ ص ۴۱۶ - ۴۱۷۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۳ - ۲۸۵ کتاب الأم ج ۶ ص ۱۳۲۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۹۔ کنز کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۵ - بدائع ج ۷ ص ۶۰۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۹۔ قاضیخان ج ۴ ص ۴۸۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹

۲۶ؔ کتاب الخراج (اردو) ص ۴۶۰ - ۴۶۱۔ المظہری ج ۶ ص ۴۱۷ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۵ کتاب الأم ج ۶ ص ۱۳۱ - ۱۳۲۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۸۹ - ۴۹۰ [ولم یذکر رفع الید الا فی کتاب الخراج لأبی یوسف القاضی۔ انتہی۔ شاہد علی عباسی] المختصر للمزنی بہامش الأم ج ۵ ص ۱۷۶

۲۷ؔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹ و ۶۰۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۰۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ - ۳۳۰۔ المختصر بہامش الأم ج ۵ ص ۱۷۶۔

۲۸ؔ بدائع ج ۷ ص ۶۰۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۰۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اختلاف للطحاوی۔ ج ۱ ص ۱۴۶ - ۱۴۹۔ المختصر للمزنی بہامش کتاب الأم ج ۵ ص ۱۷۶

۲۹ؔ نیل الاوطار نقلا عن المروزی وفیہ "وقد حکی فی البحر الاجماع علی انہ یمہل البکر حتی تزول شدۃ الحر والبرد والمرض المرجو ..... وأما المرجوم اذا کان مریضاً او نحوہ فذہبت العترۃ والشافعیۃ والحنفیۃ ومالک الی أنہ لا یمہل للمرض ولا لغیرہ اذ القصد إتلافہ" ج ۷ ص ۲۸۳۔ المختصر للمزنی بہامش الأم ج ۵ ص ۱۷۶ (ولم یذکر القطع۔ شاہد) بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۰۔

۳۰ؔ المظہری ج ۶ ص ۴۳۷ - ۴۳۹۔ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۵ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۹ و ۲۳۰۔ کتاب الأم ج ۶ ص ۱۲۲۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۰ - ۲۸۵۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۸ - ۱۴۲۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۰ - ۱۳۴۔ کنز کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۶۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹

قاضیخاں ج ۴ ص ۴۸۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ وفیہ " والنفساء فی اقامۃ الحد علیہا بمنزلۃ المریضۃ والحائض بمنزلۃ الصحیحۃ حتی لا ینتظر خروجہا من الحیض" ولم یذکر العشکال فی الہدایۃ ج ۲ ص ۳ و ۴ والترمذی ج ۱ ص ۱۷۳ والمختصر بھامش الام ج ۵ ص ۱۶۶۔

۳۱ھ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۰-۲۲۱۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۲-۱۲۳۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۷-۱۳۸۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ ولم یذکر الضرر فی غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۶ وبدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶ وکنز کتاب الحدود تفصیل مذاہب کے لیے دیکھیے اختلاف ج ۱ ص ۱۴۵-۱۴۶ ونیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۷-۲۸۰ وشرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۶۷ اور تلخیص ج ۴ ص ۵۸۔

۳۲ھ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ ولم یذکر حد التغریب فی الکنز کتاب الحدود وقدوری ص ۱۸۵ وبدائع ج ۷ ص ۵۸-۵۹ وہدایۃ ج ۲ ص ۴۸۹ وقاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۹۔ نیز ملاحظہ ہو: نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۶-۲۷۷۔

۳۳ھ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۰۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۶-۲۷۷۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۳ وفیہ " وھو قول الثوری" کنز کتاب الحدود۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۹۔

۳۴ھ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۶۔ بخاری ج ۳ حدیث ۶۸۲۳۔ مسلم مع شرحہ للنووی، کتاب الحدود ج ۲ ص ۶۸۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۱۷-۲۱۸۔ المدونۃ ج ۴ ص ۴۰۰۔ المختصر بھامش الام ج ۵ ص ۱۶۶۔ المحلی ج ۱۱ ص ۲۴۴-۲۴۶۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۲۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۸ اور ص ۱۶۴-۱۶۵۔ قدوری ص ۱۸۵۔ بدائع ج ۷ ص ۶۳۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔

۳۵ھ مسند الامام الاعظم مع تنسیق النظام ص ۱۵۷-۱۵۸۔ کتاب الآثار للامام محمد الشیبانی ص ۱۲۵۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۳۸-۲۳۹۔ ابن ماجہ ص ۱۸۶ تفصیل کے لیے دیکھیے المظہری ج ۶۔

ص ۳۰۴۔۳۴۳۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۱۔۲۷۲۔ تلخیص الحبیر ج ۴ ص ۵۶۔ بدائع ج ۷ ص ۳۳۔۳۷۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۳۔۴۹۶۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۱۔۴۷۳۔ الاشباہ والنظائر لابن نجیم ص ۱۶۴۔۱۶۵۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۰۔۳۳۱۔

۳۶ھ بخاری حدیث ۱۰۴۳۳۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۵۸۔۱۶۰۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۸۴۔۱۸۵۔ کنز کتاب الحدود۔ بدائع ج ۷ ص ۳۴۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۹۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۳۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۲۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: بیہقی ج ۸ ص ۲۳۵۔۲۳۶۔ الموطا للامام محمد مع التعلیق الممجد باب الاستکراہ فی الزنا۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۵ اور عالمگیری ج ۲ کتاب الحدود الباب الثالث۔ ولکن لا یباح الزنا عند الاکراہ وغلبۃ الشبق کما فی البدائع ج ۷ ص ۳۴۔

۳۷ھ المغنی ج ۱۰ ص ۱۶۹۔۱۷۰۔ بدائع ج ۷ ص ۵۱۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۵۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۱۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۲۰۱ وفیہ "لا نعلم فیہ خلافاً وبہ قال الشافعی وابو ثور واصحاب الرأی"

۳۸ھ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۷۰۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۹۷ وفیہ "قال ابن المنذر أجمع علی ھذا کل من نحفظ عنہ من أھل العلم منھم عطاء والزھری ومالک وابوحنیفۃ وأحمد واسحاق وأبوثور وأبو یوسف وھو مذھب الشافعی"

۳۹ھ احکام ج ۱ ص ۱۵۰۔۱۵۱۔ المدونۃ ج ۴ ص ۳۹۷۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۳۷۔۱۳۸۔ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۸۔۴۷۹۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۲۔ مغنی المحتاج للشربینی ج ۴ ص ۱۴۶ وکذا فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۴۔۱۲۶ والمقدسی ج ۱۰ ص ۱۵۷ اور دونوں نے تائید میں عمر، عثمان، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور النخعی، الزھری، الاوزاعی، مالک، شافعی، ابوثور، اصحاب الرأی، ابو اسحاق الجوزجانی اور ابوبکر الاثرم رحمہم اللہ تعالیٰ کے نام لیے ہیں۔ وفی بدایۃ المجتہد "قال الجمھور لا جلد علی من وجب علیہ الرجم وقال الحسن البصری واسحق

وأحمد وداؤد الزانی المحصن یجلد ثم یرجم" ج ۲ ص ۳۶۳ تقابلی بحث کے لیے دیکھیے
المظہری ج ۶ ص ۴۲۴ - ۴۲۶ اور نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۵ - ۲۵۶ -

۴۰ اختلافی اور تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں: احکام ج ۱ ص ۱۵۰ - غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۰ - ۴۲ - المظہری ج ۶ ص ۴۱۷ - ۴۲۲ - بیہقی ج ۸ ص ۲۲۱ - ۲۲۳ - نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۲ - ۲۵۴ - تلخیص ج ۴ ص ۶۰ - ۶۱ - ترمذی ج ۱ ص ۱۷۳ - اختلاف ج ۱ ص ۱۳۷ - ۱۳۸ - کتاب الام ج ۶ ص ۱۱۹ - ۱۲۰ - المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۳ - ۱۳۷ - المقدسی ج ۱۰ ص ۱۶۵ - ۱۶۹ - مغنی المحتاج للشربینی ج ۴ ص ۱۴۷ - ۱۴۹ - بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۴ - ۳۶۵ - المیزان ج ۲ ص ۱۷۴ - ۱۷۵ - ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۲ - ۴۹۳ - اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "قلتُ اذا رای القاضی مسلماً یقع فی المعاصی لغلبۃ الشہوۃ مع الندم والاستحیاء یأمرہ بالغربۃ والسفر واما من لا یستحیی ولا یندم فنفیہ عن الارض حبسہ حتی یتوب واللہ اعلم" دیکھیے المظہری ج ۶ ص ۴۲۲ -

۴۱ قاضیخاں ج ۴ ص ۴۸۱ - عالمگیری ج ۶ ص ۳۲۹ -

۴۲ ملخص از "قریبِ تمدن" بقلم محمد اکرام اللہ - اقبال پبلیکیشنز - امین آباد روڈ - لکھنؤ -
۱۹۷۰ء - اور دوسری کتبِ نفسیات وسماجیات وطب -

۴۳ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی فلسفۂ حدود پر بہت نفیس بحث کی ہے (ہمارا مقالہ دراصل اسی کا ناقص ضمیمہ ہے) چنانچہ ملاحظہ ہو: حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ باب ۵۰، الحدود ص ۴۴۸ - ۴۴۹ -

افلاطون، عینیت اور اقبال

ح۔ عامر صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ فلسفہ علیگڈھ یونیورسٹی

زندگی کی وسیع ترین حقیقتوں کا ادراک، فلسفہ کا پیش لفظ ہے۔ فلسفہ انسانی زندگی کی طرح اپنی طویل تاریخ کے دریچوں میں مقید ہے۔ مختلف دور، مختلف مکاتیب فکر، مختلف شخصیتیں اور اس کے احساسات ونظریات کا علم الجھا ہوا معمہ ہی تو ہے۔ کچھ شخصیتیں، کچھ نظریات، اور کچھ مکاتیب فکر ایسے ہیں کہ ان کے اثرات کو ایک خاص دور تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اثرات صدیاں گزرنے کے بعد بھی اتنے اہم اور دوررس ہیں کہ لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ بند کر کے گزر جانا "سوچ کی گہری ندی" میں دراڑ پیدا کر سکتا ہے۔ ہزاروں شب و روز کا فاصلہ، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور فلسفیانہ مسائل میں طرفین کی سی دوریاں، لیکن پھر بھی اتنے گہرے اثرات؟

افلاطون اور اقبال دونوں مفکرین اپنے زمانے کے نمائندہ ہیں۔ دونوں میں صدیوں کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی، مذہبی اور فلسفیانہ تحریکوں کا سنگم ہے۔ لیکن —— کیا دونوں میں کوئی تعلق بھی ہے؟!

افلاطون کی یہ بات شروع کریں تو فرینک تھلی کی یہ چند سطور شاید ہمارے لیے آسانی پیدا کریں۔

"With in the Framework of the Platonic System, we have a Combination and

Transformation of Teachings of the Leaders of greek thought. with the sophists plato agrees that knowledge — if knowledge be restricted to appearances — is impssible; with the socrates, that genoaine knowledge is always by concepts; with Heraclitus, that the world is in constant changel Sensuous appearances and charactrized by change) with the Eleatics, that the realworld — for plato the world of Ideas — is unchan-gable; with the Atomists, that Being is manifold (Plato admits a pludality of Ideas); with the Eleatics, that is one (the form of the good in unity); with nearly all the Greek thinkers, that it is basically rational; with Anaxagoras that mind rules it and that mind is distinct from matter. His system is the mature fruit of the history of greeks philosophy down to his time."[1]

---

[1] A History of Philosophy — F. thilly.

فلسفہ کا سب سے اہم سوال "حقیقت" کے بارے میں ہے۔ مختلف مکاتیب فکر نے مختلف انداز میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک ایسا "معمہ" ہے جو اب تک "شرمندۂ معنی نہ ہوا"۔ مختلف فلاسفہ نے "حقیقت" پہ اپنی آرار کا اظہار کیا ہے۔

عینی فلاسفہ کا خیال ہے کہ حقیقت 'آگہی یا شعور' ہے۔ مادی مفکرین کے خیال میں 'مادہ' ہے۔

انسانی زندگی "شعور اور اشیار" کا سنگم ہے۔ ان کی بے سوچے سمجھے تشریح سے بڑے مسائل اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ عیاں ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی حقیقت ماننے کا مطلب ہے کہ اسے "بنیادی حقیقت" کے طور پہ قبول کیا جائے۔

عام اصطلاح میں "عینی" کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے مقاصد اتنے اونچے ہوں کہ پانا ناممکن ہو[1] لیکن فلسفیانہ عینیت اس سے قطعاً مختلف ہے یہاں عینی سے مراد ہے "آگہی یا شعور کو بنیادی حقیقت ماننے والا" بریڈلے کا خیال ہے "There is not, and there cannot be, any reality and the more that any thing is spiritual, so much the more it is veritably real". [2]

افلاطون کے فلسفہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پیش کردہ 'فلسفۂ تصور' کو سمجھا جائے۔ افلاطون کا خیال ہے کہ اشیاء بجائے خود تبدیل نہیں ہوتیں۔ سُرخ رنگ بجائے خود سُرخ ... ہے اور کبھی بجائے خود سفید رنگ میں تبدیل نہیں ہوتا۔ بلکہ "A change is

---

1. The meaning of Philosophy J. G. Brenan. 238
2. Appearance and Reality. F. H. Bredly.

always a change from something A To Something else 'B' and A and B Can not them selves be things that change."۵۱

یعنی "شے" ازل و ابد سے "حقیقت" ہے۔ چاہے سچی ہو یا جھوٹی۔ یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی شے ایک ہی وقت پر سچی بھی ہو اور جھوٹی بھی۔ علم حاصل کرنے کے انسان کے پاس کئی ذریعے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں، دیکھتے ہیں، سونگھتے ہیں، چھوتے ہیں۔ (حواس خمسہ) لیکن ضروری نہیں کہ ان ذرائع سے ہمارے پاس جو علم آئے وہ سچ ہی ہو۔ زمین گول ہے، لیکن ہمیں چپٹی دکھائی دیتی ہے کیا ہم اس ذریعۂ علم (حواس خمسہ) کو قابلِ اعتماد تصور کریں۔ ہماری "محسوسات" کی دنیا سے آگے بھی ایک بے انتہا کائنات پھیلی پڑی ہے۔ اس کا ادراک کیسے ہو، ہم اسے کیسے جانیں، ہم اس کا علم کیسے حاصل کریں۔ کیا ہم اس دنیا کو عقل Intellect سے نہیں جان سکتے ہیں؟

افلاطون نے شے کی اصل جاننے کو علم کہا ہے۔ اور اس کے ہاں جاننے کا معنی اس چیز کا "تصور" ہے لیکن یہ تصور بجائے خود ہے کیا۔ اس کے جاننے، معلوم کرنے اور پرکھنے کا کونسا ذریعہ ہے۔

"افلاطون کے تصورات کو نفسیاتی کیفیت، سادہ سا خیال۔ برکلے کا ذاتی احساس یا کانٹ کی Innate categories نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے نقوش ہیں، جو وقت کی حدود سے باہر ہیں۔ اس دنیا میں پھیلی ہوئی یہ اشیاء ان کا مبہم عکس ہیں، ہمارے ذہن میں جو خیالات ابھرتے ہیں، ان کی مبہم پرچھائیاں ہیں۔"۵۲

(باقی آئندہ)

---

1. Ency clopedia of Philosophy Gilbert Ryle.
2. The meaning of Phil.

تبصرے

اسلام اور عہد حاضر | مؤلف مولانا جمیل احمد نذیری مبارکپوری۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۵۶ مجلد مع ڈسٹ کور قیمت دس روپے۔ ناشر: دارالمصنفین۔ مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔

یورپ کو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا منبع و ماخذ قرار دینے کا پروپیگنڈا خود اہل یورپ نے کچھ ایسی زبردست ٹیکنک سے کیا ہے کہ باقی دنیا خود کو ہمیشہ سے انتہائی غیر مہذب و غیر متمدن اور جاہل سمجھ کر ندامت اور خفت کے دامن میں منہ چھپانے لگی، لیکن تاریخی حقائق اس امر کے شاہد ہیں کہ جب یورپ میں علم و دانش کا ایک بھی چراغ روشن نہ تھا، مشرق اس وقت بھی علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا، خصوصاً طلوعِ اسلام کے بعد تو یہ عالم ہوا کہ جہاں جہاں اسلام کے فدائیین پہنچتے رہے، علم و حکمت کی روشن راہیں کھلتی رہیں۔ یہ اسلام کے نام لیوا ہی تھے جن کی بدولت یورپ میں "احیاءِ علوم" اور "اصلاح کلیسا" جیسی زبردست تحریکیں جاری ہوئیں اور جس کے نتیجہ میں اہل یورپ پہلی بار علم و عقل کی طرف راغب ہوئے اور یہ علمائے اسلام ہی تھے، جن کی بدولت یورپ میں سائنس و فلسفہ جیسے مردود و مکفور علوم کا بول بالا ہوا۔ یہ تمام حقیقتیں پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں، لیکن زمانہ کی کروٹوں نے اس قوم و ملت کو مقتدی بنا کر چھوڑ دیا ہے جسے کل تک دوسری اقوام کی امامت کا منصب حاصل تھا۔ ایک وقت تھا کہ یورپ میں "پاپائیت" کے غلبہ کا یہ عالم تھا کہ سائنسی تحقیقات کو "ما خلت فی الدین" سمجھا جاتا تھا لیکن جب علماء اسلام کے علمی و تحقیقی کارناموں کا آفتاب بلند ہوا تو یورپ میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور بالآخر اہل یورپ نے نہ صرف یہ کہ سائنس کو مذہب کا حریف بنا ڈالا، بلکہ اس کے دائرۂ

کار کو صرف انسان کی ذاتی و نجی زندگی تک محدود کر کے یہ نظریہ عام کر دیا کہ مذہب انسان کی علوم و فنون کی اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں زبردست رکاوٹ ہے۔ یہ نظریہ آغاز میں عیسائیت اور یہودیت کے لیے تھا، لیکن بعد میں اسے اسلام پر بھی چسپاں کر دیا گیا۔

زیر نظر کتاب "اسلام اور عہد حاضر" میں مؤلف محترم نے خاصی کاوش و تحقیق سے کام لے کر ثابت کیا ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں، خصوصاً اسلام، سائنسی ترقیات کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہوتا، بلکہ وہ آگے ـــــ اور آگے بڑھنے کی تعلیم دیتا ہے اور سائنس سے پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔

اس موضوع پر اگرچہ اردو میں اور بھی اہم کتب موجود ہیں لیکن امید ہے کہ مولانا جمیل احمد صاحب کی یہ کتاب بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ کتاب میں تکرار مضامین نہ ہوتی تو بہتر تھا۔

"مغربی تہذیب کا شجرۂ نسب" کے زیر عنوان مؤلف موصوف نے "دور جدید" "دور سائنس" اور "مغربی تہذیب" کو ہم معنی ٹھہرایا ہے، حالانکہ یہ تینوں اصطلاحیں الگ الگ مفہوم رکھتی ہیں۔

(فرحت عثمانی)

سیر المنازل | ترجمہ و تدوین: ڈاکٹر نعیم احمد۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۱۶۴، غیر مجلد قیمت چالیس روپے۔ ناشر ادبی اکادمی۔ علی گڑھ۔

"سیر المنازل" دراصل ایک بیش قیمت تاریخی فارسی مخطوطہ ہے، جس کے مصنف مرزا سنگین بیگ بن علی اکبر بیگ ہیں جو مغل سلطنت کے زمانۂ اختتام میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے۔ یہ ملازمت انھیں اسی تصنیف کی قدر کے طور پر اس وقت کے دہلی کے ریذیڈنٹ جنرل چارلس تھیوفلس مٹکاف نے دلائی تھی۔ ڈاکٹر نعیم احمد صاحب نے پہلے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ کے لیے اسی مخطوطہ کے فارسی متن کی تدوین کی اور اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ، حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

اب تک آثار الصنادید (سرسید احمد خاں) ہی کو اپنے موضوع پر پہلی کتاب سمجھا جاتا رہا ہے

لیکن "سیرالمنازل" کی دریافت و اشاعت نے ثابت کر دیا ہے کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ "آثارالصنادید" کی اشاعت سے ۲۵ سال قبل مرزا سنگین نے دلّی کی گلیوں، کوچوں، مسجدوں، مقبروں اور آثار کی تاریخ "سیرالمنازل" کے نام سے لکھ ڈالی تھی۔ اس میں ایسی معلومات بھی ہیں، جن کا ذکر سرسید احمد خاں مرحوم نے نہیں کیا۔ بے شبہ مرزا سنگین نے اس کتاب کا مواد حاصل کرنے میں خاصی جدوجہد اور کاوش کی ہے۔ اب یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ آثارالصنادید نے سرسید احمد مرحوم کو ایل۔ ایل کی ڈگری اور ایشیاٹک سوسائٹی کی آنریری فیلوشپ دلائی اور مرزا سنگین بیگ کو "سیرالمنازل" کی تصنیف پر صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت ہی مل سکی۔

"سیرالمنازل" سامنے آنے پر یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ کیا سرسید احمد خاں مرحوم نے بھی مرزا سنگین مرحوم کی اس کتاب سے استفادہ کیا تھا؟ کیا تعجب ہے کہ "آثارالصنادید" کی تصنیف سے قبل "سیرالمنازل" کا مخطوطہ سرسید مرحوم کے مطالعہ میں آیا ہو اور اسی سے ان کو اپنی تصنیف کے لیے تحریک ملی ہو۔!

بہرحال ڈاکٹر نعیم احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مرزا سنگین بیگ اور ان کے مخطوطہ کو اُردو دنیا میں پہلی بار روشناس کرایا۔ تاریخ کی دنیا میں ان کی یہ خدمت بے شبہ قابل قدر مانی جائے گی۔ کاش جس پایہ کی یہ چیز تھی، اس کا ظاہر بھی اسی درجہ کا ہوتا۔ اس اظہار حسرت کے ساتھ قیمت کی زیادتی کا شکوہ بے جا نہ ہوگا۔

(رحمت عثمانی)

مئی ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ : بیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ - تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی) -

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سرایہ - تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل) تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد - اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے) - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد نمبر ۸۶ || رجب المرجب ۱۴۰۱ھ مطابق مئی ۱۹۸۱ء || شمارہ نمبر ۵

مقالات

نظرات

پچھلے دنوں اسلام آباد میں ۷ رسے ۱۰ر مارچ تک پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کے سلسلہ میں جو ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس "دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اسلام کا حصہ" کے موضوع پر ہوئی تھی اس کی تقریب سے راقم الحروف کا پاکستان میں قیام ۵ رمارچ سے ۴ر اپریل تک یعنی پورے ایک مہینہ رہا۔ اس مدت میں اسلام آباد کے علاوہ کراچی اور لاہور بھی جانا ہوا۔ ہر جگہ اعزا واقربا اور دوستوں سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوئیں۔ علمی ادبی اور دینی ادارے دیکھے، تقریریں بھی ہوئیں، پاکستان کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی زندگی اور سیاسی مدوجزر کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اس سفر سے پہلے ۱۹۷۶ء میں بھی پہلی عالمی سیرت کانفرنس کے سلسلہ میں پاکستان جانا ہوا تھا جس کو اب پانچ برس ہوتے ہیں لیکن آج کا پاکستان مختلف اعتبارات سے اُس پاکستان سے مختلف ہے جو ۱۹۷۶ء میں بھٹو گورنمنٹ کے زیر سایہ تھا۔ پاکستان ہندوستان کا پڑوسی ملک ہے اور پڑوسی بھی وہ جس کو قرآن مجید میں جارِ ذی القربیٰ فرمایا گیا ہے یعنی ایسا پڑوسی جس سے تعلق صرف قرب مکانی کا نہیں، بلکہ عزیزداری اور قرابت کا رشتہ بھی ہے۔ اس بنا پر دونوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا اور ایک دوسرے کے احوال وکوائف سے باخبر رہنے کا جذبہ اور خواہش ایک امر طبعی اور ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اپنے بعض خاص حالات و کوائف کے باعث میرا موڈ لکھنے کا نہیں تھا، متعدد احباب اور ارباب علم کے اصرار پر کانفرنس

کی روئداد اور پاکستان کے اپنے مشاہدات وتاثرات کو قلمبند کرکے قسط وار بعنوان "پاکستان امروز" شائع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ والاتمام من اللہ۔

سردست ان سطور کا مقصد اُن جذباتِ تشکر وامتنان کا اظہار ہے جو انڈین ڈیلی گیشن کے ساتھ پاکستان گورنمنٹ کے غیر معمولی اعزاز واکرام کا معاملہ کرنے سے متعلق ہیں، بھٹو گورنمنٹ کے عہد میں بھی اگرچہ اندرون ملک ہندوستانی مندوبین کی بڑی خاطر تواضع ہوئی تھی لیکن پاکستان کی آمدورفت کے اخراجات ان کو خود برداشت کرنے پڑے تھے، پھر پاکستان پہنچکر پولیس میں رپورٹ کرنے کا جو عام قانون ہے اس سے بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا لیکن اس مرتبہ دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ انڈین ڈیلی گیشن گیارہ افراد پر مشتمل تھا وراس میں بمبئی، احمد آباد اور پٹنہ تک کے حضرات تھے، گورنمنٹ نے ان سب کے لیے روانگی کے مقام سے اسلام آباد تک آمدورفت کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کا انتظام کیا اور ہوائی جہاز کے سفر میں ایرپورٹ میں داخل ہونے اور جہاز میں بیٹھنے کے جو انتظامات ہوتے ہیں ان کا تکفل بھی خود کیا۔ کوئی شخص اپنے ساتھ خواہ کتنا ہی سامان لے جائے اس کو بھی فری آف چارج کردیا گیا، پھر اگرچہ کانفرنس اسلام آباد میں چار دن کی تھی، لیکن جس شخص نے لاہور، کراچی وغیرہ جہاں کہیں جانا چاہا اس کے ویزا میں ایک مہینہ کی توسیع کرکے اس کو وہاں کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ دے کر ریزرویشن بھی کرادیا گیا، علاوہ ازیں پولیس میں رپورٹ کرنے کی زحمت بھی نہیں ہوئی۔

۷ر مارچ کی صبح کو عظیم الشان نیشنل اسمبلی ہال میں صدر مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب نے اردو زبان میں اپنی تقریر دلپذیر سے کانفرنس کا افتتاح کیا اور پھر سیمینار کی غرض سے موضوعات بحث و نظر کے مطابق مندوبین دو کمیٹیوں میں بٹ گئے، راقم الحروف اور ہندوستانی وفد کے اکثر اراکین کے نام کمیٹی نمبر ایک میں تھے، یہی بڑی کمیٹی تھی اور اس کے اجلاس نیشنل اسمبلی ہال میں ہوتے رہے، ۸ر مارچ کی صبح کو ایک امریکن اور بڑی لائق وفاضل خاتون کی صدارت میں کمیٹی نمبر ایک کا جلسہ شروع ہوا

پہلا مقالہ میرا ہی "اسلام میں علم کا تصور اور اس کی اہمیت" تھا۔ مقالات سب چھپے ہوئے تھے اور حسب قاعدہ مندوبین میں پہلے ہی تقسیم کر دیے گئے تھے، مقالات کا پورا پڑھنا ناممکن تھا اس لیے ہر مقالہ نگار کے لیے دس منٹ مقرر کر دیے گئے کہ اس میں مقالہ کا خلاصہ بیان کر دے، لیکن اس ضابطہ کے ماتحت جب دس منٹ گذر جانے پر میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا تو جناب صدر نے ادب کے فرمایا: آپ کے لیے پانچ منٹ مزید ہیں" میں نے اس خصوصی مراعات پر صدر کا شکریہ ادا کیا اور پندرہ منٹ تقریر کی۔

کافی اور چائے کے وقفہ کے بعد ۱۱ بجے دوسرا اجلاس شروع ہوا تو پہلے سے چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق اس اجلاس کی صدارت میں نے کی جس پر انڈین ڈیلیگیشن نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا، پروگرام میں ایک جلسہ کی صدارت کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی میاں کا نام بھی چھپا ہوا تھا لیکن وہ تو اسلام آباد پہنچے ہی نہ تھے، پھر ۱۶ مارچ کو کانفرنس کے اختتامیہ اجلاس میں تمام مندوبین میں سے جن پانچ حضرات کا انتخاب کیا گیا تھا ان میں ایک نام خاکسار راقم الحروف کا بھی تھا۔ چنانچہ عجیب اتفاق ہے جس طرح کمیٹی نمبر ایک کے ماتحت سیمینار کا آغاز میری تقریر سے ہوا تھا کانفرنس کا اختتام بھی راقم الحروف کی تقریر پر ہوا، انڈین ڈیلیگیشن اس لطف و کرم اور عزت افزائی پر پاکستان گورنمنٹ اور ارباب کانفرنس کا تہ دل سے شکرگذار ہے، جیسا کہ سب کو معلوم ہے پاکستان سے جو ارباب علم و ادب وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں وغیرہ میں شرکت کے لیے آتے ہیں ان کے ساتھ بھی گورنمنٹ آف انڈیا اور عوام و خواص کا معاملہ ایسا ہی یگانگت اور احترام و تکریم کا ہوتا ہے، بے شبہ یہ صورت حال دونوں قریبی ہمسایہ ملکوں میں خوشگوار تر تعلقات کے لیے ایک فال نیک ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر یہ گذارش بھی کی جائے کہ ان دونوں ہمسایہ ملکوں میں باہم طلبا اور اساتذہ کے تبادلہ کا قانون نہیں ہے، حالانکہ دور دراز کے دوسرے ملکوں کے ساتھ ان کے تعلقات اس قسم کے ہیں اور ان پر عمل ہو رہا ہے، اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور خوف سے خوف، اگر ان دونوں ملکوں میں بھی اس قسم کا ربط پیدا ہو جائے جس کی تجویز بارہا ہو چکی ہے تو تعلیمی اعتبار سے ہر ایک کے لیے مفید ہونے کے علاوہ سیاسی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے میں بھی ان سے مدد مل سکتی ہے، یہ وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے، اس پر خاطر خواہ توجہ ہونی چاہیے۔

خلافتِ ارض کیلئے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت

قرآن حکیم کی نظر میں

خلافت ارض اور علم اسماء

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی، (بنگلور)

(قسط سوم)

۱۸۔ علم مقادیر اور عصر جدید میں اس کی اہمیت | اوپر کی تفصیل سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ یہ عالم آب و گل اضداد اور مقادیر کا مجموعہ ہے۔ ہر چیز میں مخصوص اثرات اور مخصوص مقداریں ہوتی ہیں جو دوسری چیز میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر ان چیزوں کے تقابل سے ایک دوسرے کی تاثیرات کا ازالہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے خواص ایک دوسرے پر غالب آتے رہتے ہیں۔ جب دو چیزیں باہم ملتی ہیں تو ان کے خواص طبعی میں ایک کش مکش شروع ہو جاتی ہے اور یہ اجزاء و عناصر ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کش مکش میں جیت اس جزو یا عنصر کی ہوتی ہے جس کے خواص طبعی زیادہ مؤثر اور طاقتور ہوتے ہیں[1] مگر اس باہمی کش مکش کی بنیادی صفت کے باوجود

---

[1] مثلاً دودھ اور پانی جب باہم ملتے ہیں تو دودھ کا رنگ پانی پر غالب آجاتا ہے۔ اگر دودھ میں تھوڑی سی شکر ڈال دی جائے تو اس کے اجزاء گھل کر دودھ کے تمام اجزاء (سالمات) کے ساتھ مل جاتے اور انھیں میٹھا کر دیتے ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اشیاء کا بھی ہے۔

ان اجزاء و عناصر کا باہمی اتحاد اور تال میل کی کیفیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جب یہ اجزاء و عناصر باہم ملتے ہیں تو وقتی کش مکش (کیمیاوی تعامل اور ردِّ عمل) کے بعد حیرت انگیز طور پر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کو مختلف قسم کے سالمات (مالیکیولس) اور کیمیاوی مرکّبات (کامپاؤنڈس) کی شکل میں نظر آتا ہے۔ گویا کہ ان کے درمیان کسی قسم کا "جھگڑا" ہی نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب دنیا کی مختلف اشیاء کا جائزہ لیا جائے تو اس سے مختلف علوم کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ غذا اور جڑی بوٹیوں کے طبّی (Medicinal) خواص و فوائد کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علم المفردات اور علم الادویہ وجود میں آتا ہے۔

۲۔ دنیا کی تمام چیزیں جن بنیادی اجزاء و عناصر سے مرکّب ہیں اگر اُن اجزاء و عناصر کے خواص و تاثیرات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علم کیمیا (Chemistry) کی بنیاد پڑتی ہے۔

۳۔ اشیائے عالم میں جو قوتیں (حرکات و سکنات کے اعتبار سے) کارفرما ہیں اگر ان کا منظم مطالعہ کیا جائے تو یہ علم طبیعیات (Physics) کہلائے گا۔

اس طرح مظاہرِ عالم کے خواص و تاثیرات کا دائرہ بہت وسیع اور آفاقی ہے۔ انہی تمام چیزوں کا علم حضرت آدمؑ کو دیا گیا تھا، جن کا علم اولادِ آدم بتدریج حاصل کر رہے ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور کائنات کا ایک ایک مظہر ایک خاص مقدار میں اور بالکل نپا تُلا ظہور پذیر ہوا ہے، خواہ وہ عالم حیوانات کی قبیل سے ہو یا عالم نباتات سے، جمادات سے ہو یا افلاک سے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝ اور اُس کے ہاں ہر چیز ایک متعیّن مقدار کے ساتھ ہے۔ (رعد - ۸)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ○ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کو باضابطہ بنایا (فرقان - ۲)

وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ○ اور ہم نے زمین میں ہر چیز نپی تُلی پیدا کی ہے۔ (حجر - ۱۹)

موجودہ دور سے پہلے ہم "مقدار" "تقدیر" اور "موزون" اشیاء کی اصل حقیقت سے ناواقف تھے مگر آج ان چیزوں کی حقیقت اور ربّانی کلمات کی قدر و قیمت، علم المفردات، علم الادویہ اور حیاتیاتی علوم[1] کی تحقیق و تدوین کے باعث پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ جو لوگ ان علوم سے ناواقف ہیں وہ ان آیات کریمہ کا صحیح مفہوم اور ان کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ مثلاً یہ علم کہ مختلف غذائی اشیاء میں مواد لحمیہ (Protiens)، مواد نشائیہ (Carbohydrates) مواد شحمیہ (Fats)، معدنی نمکیات (Mineral Salts) اور حیاتین (Vitamins) وغیرہ کا تناسب کیا ہے اور ان کے فوائد و خصوصیات اور تاثیرات کیا ہیں؟ اور بنیادی طور پر یہ غذائی مادّے کن اجزا و عناصر پر مشتمل ہیں اور کس قدر حیرت انگیز تناسب کے ساتھ ان مادّوں کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، تفصیلات کا

---

[1] خصوصیت کے ساتھ حیاتیات (Biology) کی وہ شاخیں جو انواع حیات کے کیمیاوی تجزیہ و تحلیل سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

حیاتیاتی کیمیا ———— Biochemistry

سالماتی حیاتیات ———— Moleculer Biology

کیمیاوی خوردبینی حیاتیات ———— Chemical Microbiology

∴ ∴ ∴ ∴

یہ موقع نہیں ہے۔[1] کارخانۂ قدرت میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ یہی علم ہے۔[2]
انسان کی صحت اور اس کے معاشی و اقتصادی فوائد اور دیگر بہت سے اغراض
و مقاصد کی رُو سے ان علوم کی تحصیل بے حد ضروری اور اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس

---

[1] اس موضوع پر حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا:

۱۔ ہماری غذا، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند

۲۔ دیہاتی معالج، مطبوعہ ہمدرد دواخانہ دہلی

۳۔ Encyclopedia of Medicinal Foods, London.

۴۔ Encyclopedia of Medicinal Herbs, London.

[2] مثلاً تمام غذائی مادّے اور دنیا کی اکثر و بیشتر چیزیں زیادہ تر چودہ عناصر (جو کثیر الاستعمال ہیں) سے مرکب ہیں۔ جیسے آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، کیلشیم، میگنیشیم۔ الخ مگر ذرا سے تناسب کے بدل جانے سے چیزیں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں بعض اوقات صرف ایک ایٹم کے اِدھر یا اُدھر ہونے سے بہت بڑا فرق ہو جاتا ہے۔

ایک دلچسپ مثال دیکھیے ہیرا اور کوئلہ سو فیصد کاربن کی بنی ہوئی چیزیں ہیں۔ مگر ایک انتہائی خوبصورت، چمکدار، قیمتی اور سخت ترین (دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ سخت) ہے، جبکہ دوسرا سیاہ فام، بدصورت، ارزاں اور بھُربھُرا ہے۔ کیا یہ ایک حیرت انگیز چیز نہیں ہے؟ اسی طرح آکسیجن عنصر کی بنیادی خصوصیت چیزوں کو جلنے اور جلانے میں مدد دینا ہے۔ اور ہائیڈروجن ایک جلنے والی گیس ہے۔ مگر ان دونوں کے کیمیاوی تعامل سے پانی وجود میں آتا ہے جو ان دونوں کی مفرد خصوصیات کے برعکس بالکل ایک نئی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے یعنی آگ کو بجھانے میں مدد دینا۔ انسان ان چیزوں کے اسرار و عجائب کی اصل کنہہ و حقیقت سمجھنے اور ان کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

کارزارِ حیات میں جدوجہد ہماری صحت پر موقوف ہے۔ پھر طبی علوم کی تعلیم وتدریس اور دواسازی وغیرہ کی معاشی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ آج کل تو مختلف طبی آلات اور نئی نئی مختلف قسم کی دواؤں کی اتنی صنعتیں اور فیکٹریاں قائم ہو گئی ہیں جن کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان علوم میں ریسرچ اور مختلف پودوں اور دواؤں پر تحقیقات کے الگ شعبے اور علمی ادارے اور اکیڈمیاں قائم ہیں۔ اس طرح "علم مقادیر" (مختلف اجزاء وعناصر اور ان کے درمیان تناسب کا علم) سے صحیح فائدہ عصر جدید کا انسان اٹھا رہا ہے۔ جو لوگ اس علم سے نابلد رہیں گے وہ نہ صرف مخلوقاتِ الٰہی اور موجوداتِ عالم کی حقیقت سے ناواقف رہیں گے بلکہ "علم مقادیر" میں پیچھے ہونے کے باعث اس علم سے حاصل ہونے والے مادّی فوائد سے بھی عاری رہیں گے۔ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اگرچہ اصولی اعتبار سے معاش نہیں بلکہ معاد ہے مگر معاش کے مسئلہ کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ درحقیقت معاد کی صلاح وفلاح بھی معاش ہی کی صلاح پر منحصر ہے۔ ان دونوں میں توازن قائم رکھنا چاہیے، ورنہ خلافتِ ارض کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

۱۹- صرف اسماء حقائق نہیں۔ (طبیعی وحیاتیاتی علوم کی نارسائی) اسماء اور علم اسماء کی یہ بحث اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک کہ اس کے ایجابی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے سلبی پہلوؤں پر بھی نظر نہ ڈالی جائے۔ فکر ونظر کے تزکیہ کے لیے تصویر کے یہ دونوں رُخ نظروں کے سامنے رہنے چاہئیں۔ اس بحث سے جہاں ایک طرف "علم آدم" کی صحیح نوعیت واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف قرآن حکیم کی عظمت وبرتری کا ایک نیا اور حیران کن پہلو سامنے آتا ہے اور چودہ سو سال قبل کے دعوے آج بھی اپنی جگہ پر اٹل اور ناقابلِ ترمیم وتغیر نظر آتے ہیں۔

چنانچہ عصر جدید کی بے مثال علمی ترقی، جدید سے جدید تر بے شمار علوم وفنون کی

تحقیق و تدوین اور مادّی اشیاء کے ہزاروں جزئیات و خصوصیات اور ان کی باریکیوں کا علم حاصل کر لینے کے باوجود انسان اب تک ان چیزوں کی اصل حقیقت و ماہیت یا اُن کے باطنی اسرار و احوال کا ادراک نہیں کر سکا ہے؛ بلکہ اس کا علم محض ان چیزوں کے "ظاہری آثار و خواص" ہی تک محدود ہے۔

چنانچہ علاّمہ سید سلیمان ندوی نے زیر بحث آیت کریمہ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" سے خوب استنباط فرمایا کہ آدمؑ کو صرف اسماء کا علم دیا گیا تھا، اصل حقائق کا نہیں۔ اور انسان کا علم آج بھی وہیں ہے جہاں وہ روز اوّل تھا[1]۔

مطلب یہ کہ انسان کو پہلے ہی دن جو نام بتا دیے گئے تھے (خواہ وہ مسمّیات سے متعلق ہوں یا آثار و خواص سے) آج کا انسان باوجود اپنی ہمہ جہتی علمی ترقی کے اس پر ایک تنکے برابر بھی اضافہ نہیں کر سکا ہے۔ انسان اشیائے عالم کا جس باریک بینی اور دقتِ نظر سے تجزیہ کرتا جا رہا ہے، نئی نئی چیزیں ـــــ مختلف اجزا و عناصر کے روپ میں ـــــ اس پر منکشف ہو رہی ہیں، جن کے ظاہری افعال و خواص سے تو وہ مستفیض ہو سکتا ہے مگر ان کی باطنی حقیقت و کیفیت سے وہ ناآشنائے محض ہے۔ بالفاظ صریح آج کا انسان طبیعی اور حیاتیاتی علوم کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر چکا ہے اور مختلف انواع حیات کی ساخت و پرداخت اور ان کے ترکیبی مادوں کا تفصیلی علم رکھتا ہے۔ علم کیمیا اور علم خلیات (citology) کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے۔ مظاہر حیات میں پائے جانے والے عناصر اور ان کی کارفرمائیوں کا علم "حیاتیاتی کیمیا" (Biochemistry) اور علم "کیمیائی خوردبینی حیاتیات" (Chemical Micro Biology) کے ذریعہ احاطہ کر رہا ہے مگر اس قدر تفصیلی علم اور گہری واقفیت حاصل کر چکنے کے باوجود اس بنیادی راز کی

---

[1] ماخوذ بتغیر قلیل از سیرت النبی، ۴/ ۹۰

پردہ دری نہ کر سکا کہ ان اجزاء و عناصر سے آخر جسموں کے اندر کونسی کیمیاوی تبدیلی کس طرح اور کیوں کر واقع ہو جاتی ہے؟ خلیوں (Cells) کے اندر کی پیچیدہ مشنری کیوں کر حرکت میں آتی ہے اور ان کے بنیادی مادہ (پروٹو پلازم) میں کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں؟[1] مختلف قسم کے ہزاروں لاکھوں خلیوں کے درمیان باہمی تعامل اور تبادلے کا سلسلہ ابتدائً کیونکر جاری ہوتا اور پھر ہمیشہ کیسے قائم رہتا ہے؟[2] ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے

---

[1] حیاتیات کے جہاں بہت سے مسلمات ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ اور ان حقائق کا اعتراف ہمیں درسی کتابوں تک میں نظر آتا ہے۔ مثلاً "علم نباتات" کا مشہور مصنف اے سی دتّا لکھتا ہے: "ہم جانتے ہیں کہ تخمایہ (پروٹو پلازم) بجائے خود ایک زندہ مادّہ ہے جو بہت زیادہ پیچیدہ پروٹینوں (مواد لحمیہ کے سالمات) کا مجموعہ ہے۔ اسی وجہ سے غذائی پروٹین (جو خارج سے جسم کے اندر داخل کیے جاتے ہیں) پیچیدہ پروٹو پلازمی پروٹینوں میں بدل جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر غذا بے جان شے سے جاندار شے یعنی پروٹو پلازم میں داخل ہوتی ہے۔ یہ نظام تغذیہ کا بنیادی ہدف ہے۔ یہ پُراسرار تغیر کس طرح واقع ہوتا ہے اس کو ہم نہیں جانتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ پروٹو پلازم (تمام زندہ اشیاء کا بنیادی مادہ) میں اس کی کوئی قوت پائی جاتی ہے۔"

A class Book of Botany, by A.C. Dutta, P. 277 oxford University Press, 1978.

Botanay For Degree Students, by A.C. Dutta P. 361, oxford University Press. 1979.

[2] ایک امریکی محقق کرک (F.H.C. crick) کے الفاظ میں: "ہماری ناواقفیت کا وسیع علاقہ یہ نہیں ہے کہ خلیہ کے اندر کیا ہو رہا ہے بلکہ یہ ہے کہ خلیوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے؟ اس بارے میں ہمارا علم محض جزئی ہے، کیونکہ ہمارا (موجودہ) علم ہمارے مشاہدات کی تشریح کے لیے

بقیہ حاشیہ صفحہ پر

(حاشیہ بقیہ صلا)
بالکل ناکافی ہے۔"

The Encyclopedia of Ignorance, P. 302 Oxford, 1978.

خلیہ کا جغرافیہ | " ہر خلیہ اپنی جگہ پر ایک کارخانہ ہے جس میں ہمیشہ مختلف قسم کا کیمیادی تعامل اور ردعمل ہوتا رہتا ہے۔" (انسائیکلو پیڈیا آف اگنورنس ص۱۳۳)

" ہر خلیہ اپنے اندر ایک عجیب وغریب دنیا رکھتا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے پہلے خلیہ کے اندرون کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ جب کہ طاقتور برقی خوردبین کے ذریعہ اس کے اسرار وانکشاف ہوئے، جو کسی چھوٹی چیز کو ایک لاکھ گنا زیادہ بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ اس طرح بصری طور پر اس کے اندر واقع ہونے والے کیمیادی تغیرات وغیرہ کا مشاہدہ ممکن ہو سکا۔"

The Chemistry of Life, P.17, Penguin Books, 1977.

ہر جاندار کی ابتداء ایک خلیہ سے ہوتی ہے۔ پھر خلیوں کی تعداد میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا ہے اُن کی پیچیدگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز چیز مختلف خلیوں (یا زندگی کی اکائیوں) کے درمیان اتحادِ عمل کا مظاہرہ ہے، جس پر تمام ماہرین سائنس حیران ہیں کہ ایک خالق وصانع اور نگران وناظم کے بغیر اس قدر منظم ومربوط مظاہرہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اسی اتحادِ عمل کی بدولت مختلف خلیے مل کر ایک عضو بناتے ہیں۔ پھر تمام اعضاء اتحادِ عمل ہی کے باعث ایک جسم کی تشکیل کرتے ہیں جو ربوبیت کا حیرت انگیز شاہکار ہوتا ہے —— خلیوں کا نشوونما نہایت درجہ منظم اور حیرت انگیز طور پر ہندسی اشکال میں ہوتا ہے۔ گویا کہ کوئی ماہر انجینئر ایک ایک خانے کو ناپ ناپ کر اور تراش تراش کر بنا رہا ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی خانہ چھوٹا یا بڑا ہو جائے، یا اس میں کوئی بدنظمی اور انتشار رُونما ہو جائے۔ (خلیوں کے یہ ہندسی اشکال شہد کی مکھیوں کے چھتوں سے بہت
(حاشیہ بقیہ ص۱۳ پر)

اب تک نامعلوم ہیں۔ خلیے کے پیچیدہ اور عارضی اعضاء کے بنانے کے لیے کس طرح کیمیاوی مادوں کے سالمے باہم مل جاتے ہیں؟[1] جینز (Genes) اور کروموسوم (Chromosome) کا حیرتناک عمل کس طرح ہوتا ہے؟ اور اس عجیب و غریب عمل کے ذریعہ نسلی و وراثتی خصوصیات کس قدر تنظیم و انضباط کے ساتھ پچھلی نسلوں سے اگلی نسلوں میں منتقل ہو رہی ہیں؟[2] تمام زندہ اجسام کا لازمی مادہ پروٹین ہے مگر پروٹین کے ایک سالمہ (Molecule) کی ساخت اور اس کی مشنری کو سمجھنے سے انسانی عقل عاجز اور بے بس نظر آتی ہے[3]

(بقیہ حاشیہ صلا)
مشابہت رکھتے ہیں)۔ ایک انسانی جسم میں تقریباً دو ہزار کروڑ خلیے ہوتے ہیں۔ گویا کہ ایک انسانی وجود دو ہزار کروڑ "زندہ اجسام" یا "کارخانوں" یا "زندگی کی بنیادی اینٹوں" کا مجموعہ ہے، جن میں ہر آن کچھ کیمیاوی تغیر ہوتا رہتا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی مشہور کتاب Man the Unknown کا اردو ترجمہ "نامعلوم انسان" ص۱۳۱، مطبوعہ مدراس یونیورسٹی۔

[2] ایک ماہر حیاتیات کہتا ہے: "یہ کہنا کہ جسم کی ساخت کو جینز (Genes) کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، سائنٹفک نقطۂ نظر سے اس کی تشریح کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے بہ نسبت یوں کہنے کے کہ اس کو خدا کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔"

The Encyclopedia of Ignorance. 252, 1978.

[3] "پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں (cells) کے لیے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر پر مشتمل ہیں: کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے ۴۰۰۰۰ ہزار دقیق ایٹم پر مشتمل ہوتا ہے۔" (خدا موجود ہے)
"پروٹین کے ایک سالمہ میں امینو ایسڈس (Amino Acids)
(حاشیہ بقیہ صلا پر)

(بقیہ حاشیہ ص۲۲۶)
کے سیکڑوں یا ہزاروں سالمے ہوتے ہیں۔" (ڈکشنری آف بیالوجی، مطبوعہ پینگوئن بکس لندن)۔

"پروٹین کے سالمہ (مالیکیول) میں امینو ایسڈ کی ترتیب کا مسئلہ دنیائے سائنس کو بدحواس کردینے والا ہے۔" (Asimov's Guid to Science. Vol 2, P. 80)

"پروٹین کا سالمہ (اپنی ساخت کے لحاظ سے) فن تعمیر کا ایک اعلیٰ اور عظیم الشان نمونہ ہے جس کو قدرت نے پیدا کیا ہے۔ لاتعداد گوناگوں اور پیچیدہ طریقوں سے اس میں جواہر (Atoms) اکٹھا ہو جاتے ہیں۔" (Outlines of Zoology, P. 16)

"اب تک دریافت شدہ پروٹینوں میں سب سے ہلکے پروٹین کا وزن ہائیڈروجن اٹم کے وزن سے گیارہ ہزار گنا ہے جبکہ سب سے بھاری پروٹین کا وزن دس ملین گنا (ہائیڈروجن کے ایک کروڑ ایٹموں کے وزن کے برابر) ہے۔" (ایضاً ص۱۶)

"پروٹین امینو ایسڈ کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔" (خدا موجود ہے)

"حیوانات کی ہر نوع میں سیکڑوں مختلف قسم کے خلیے ہوتے ہیں۔ اور حیوانات کی بے شمار انواع میں سے ہر نوع اپنے ایک مخصوص طرز کے پروٹین کی حامل ہوتی ہے۔ پروٹین کے اقسام حیرت انگیز طور پر عظیم ہیں۔" (آوٹ لائنس آف زوالوجی ص۱۶)

"پروٹین ایک نہایت ہی پیچیدہ مرکب ہے جو زندہ مادہ کا اہم ترین جز ہے۔ زندہ چیزوں کا جسم زیادہ تر پروٹین ہی سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ پروٹین اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں پروٹین کا موجود ہونا ضروری ہے۔ زندہ پروٹین کی خصوصیت اس کی از خود تحویل کی قوت ہے۔ از خود تحویل سے یہ مراد ہے کہ کوئی زندہ

(حاشیہ بقیہ ص۲۷۱ پر)

مادہ کے ساتھ حرکت یا زندگی کا کیا تعلق ہے ؟ اس کو سائنس اب تک دریافت نہیں کرسکی۔ ان اجزاء و عناصر کی حرکات اور کیمیاوی تغیرات ہی کا صحیح علم انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا تو ظاہر ہے کردہ حیات اور مظاہر حیات کا بھی صحیح علم و ادراک نہیں کرسکتا۔ چنانچہ احساس، ادراک، شعور اور تعقل وغیرہ کو ابھی رہنے دیجیے، جو زندگی کے اعلیٰ مظاہر ہیں، صرف اس کے ادنیٰ مظاہر تک کی بھی اس کو کوئی شدبد حاصل نہیں ہوسکی۔ چنانچہ "حیات" کی ان نارسائیوں کے باب میں ماہرین حیاتیات اپنے علوم کی ابتدا ہی اس نکتہ سے کرتے ہیں :

Life itself is mysterious, and its origin still remains shrouded in mystery.

ترجمہ : زندگی بجائے خود پُراسرار ہے اور اس کے مادہ کا راز بھی اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب : "بائنس فار ڈگری اسٹوڈنٹس" از اے سی دتّا - (مقدمہ) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۹ء)

حیاتیات کا سب سے اہم ترین اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ "زندگی" کیا ہے اور مادۂ حیات (پروٹو پلازم) کیونکر وجود میں آیا ؟ مگر کوئی بھی ماہر اس مسئلہ کو ہاتھ نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

شے اپنی اصلی حالت پر زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں کیمیاوی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی تحلیل ہوتی رہتی ہے" (جدید معلومات سائنس، حصہ اول، ص ۱۳۶)

" تمام زندہ چیزوں میں مخصوص قسم کے مادے پائے جاتے ہیں جو اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ سالہا سال کے تجربوں کے بعد بھی کیمیاداں یہ دریافت نہیں کرسکے ہیں کہ ان کی اندرونی ساخت کیسی ہے۔ یہ پیچیدہ مادے صرف جاندار دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان کی کوئی مثال بے جان دنیا میں نہیں ملتی" (ایضاً، ص ۱۵۱)

لگا سکتا اور اس پر کسی قسم کا اظہار رائے یا لب کشائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق نیچر یا علوم طبیعی سے نہیں بلکہ براہ راست سُوپر نیچر یا عالم فوق الطبیعی سے ہے[1] تمام سائنس داں پھر بلب ہیں اور اس بنیادی مسئلہ کو نظر انداز کر کے دیگر ادنیٰ درجہ کے مسائل و مباحث سے تعرض کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اب بھی ایک موہوم سی امید ہے کہ سائنسداں رفتہ رفتہ تمام معموں کو حل کر لیں گے اور کل اسرار سے واقف ہو جائیں گے۔

کتاب The Chemistry of Life کا مصنف اسٹیون روز (Steven Rose) حیاتیات کی ایک شاخ "حیاتیاتی کیمیا" کے بعض پیچیدہ اور ناحل مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"حیاتیاتی کیمیا ابھی ایک جدید علم ہے اور بہت سی چیزوں کا صرف 'نصف ادراک' ہی کیا جا سکتا ہے' یا غلطی سے یہ بات آج مان لی گئی ہے کہ ان کے مکمل ادراک کے لیے ہم کو محققین کی دوسری یا تیسری نسل کا انتظار کرنا چاہیے"

(ملاحظہ ہو کتاب مذکور، مطبوعہ پینگوئن بکس لندن، ص ۲۵۳، ۱۹۷۵ء)

یہ حیاتیات کے باب میں علم انسانی کی نارسائیوں کی محض ایک جھلک تھی۔ طبیعی علوم (Physical Sciences) جن کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ طبیعیات اور علم کیمیا پر ہوتا ہے، میں اس کی ناواقفیتوں کا بھی یہی حال ہے اس موقع پر چونکہ تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے (کیونکہ یہ موضوع بجائے خود

---

[1] ڈاکٹر الکسس کیرل نے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا ہے: "اور یہ دنیا نامعلوم اور پوشیدہ قوتوں کا مجموعہ ہے ...... اس کی تخلیق طبیعیات اور ہیئت کی فنی مہارتوں کے ذریعہ ایک نامعلوم مادہ سے ہوئی ہے"۔ (نامعلوم انسان ص۲۶، ترجمہ از افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے، مدراس)

ایک مستقل مضمون کا طالب ہے)، لہٰذا یہاں پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

انسان، مادہ کی سب سے چھوٹی اکائی جوہر (ایٹم) اور اس کے اجزاء (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران) اور مختلف ایٹمی مرکزوں سے خارج ہونے والی شعاعیں: الفا شعاعیں (Alfa Rays)، بیٹا شعاعیں (Beta Rays) اور گاما شعاعیں (Gama Rays) وغیرہ سب کا علم نہایت درجہ مشقت اور باریک بینی کے ساتھ حاصل کرچکا ہے۔ اور اس حقیقت کا بھی پتہ لگا چکا ہے کہ الکٹران میں منفی برقی چارج اور پروٹان میں مثبت برقی چارج ہوتا ہے۔ مگر وہ اس راز پر سے پردہ نہ اٹھا سکا کہ یہ برقی چارج بذات خود ہے کیا اور وہ کس طرح کام کرتا ہے؟ مثبت اور منفی چارج کی کیا خصوصیات ہیں؟ اور ان کی تعریف کیا ہے؟ واضح رہے کہ مثبت (Positive) اور منفی (Negative) کے "نام" محض ان کے باہمی کشش و دفع کرنے کی ایک "ظاہری خاصیت" کی بنا پر رکھا گیا ہے ورنہ ان کی صحیح منطقی تعریف ممکن نہیں۔ اور نہ خود ان برق پاروں ہی کی حقیقت و اصلیت معلوم ہے۔

یہ تو اُن برق پاروں کا حال تھا جن سے دنیا کے تمام عناصر (Elements) کی تشکیل ہوئی ہے۔ اب خود ان عناصر اور ان کے "کیمیاوی تغیرات" کو دیکھیے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ عناصر کی دنیا "طلسم ہوشربا" سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ غرض اب تک جتنے بھی عناصر اور ان کے اندرونی اجزاء دریافت ہو چکے ہیں وہ سب کے سب محض "نام ہی نام" (اسماء) ہیں۔[1] اس عالم آب و گل میں جتنی بھی چیزیں اور جتنے بھی "کیمیاوی تغیرات"

---

[1] مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، کلورین، سلفر، فاسفورس، سلیکون، کیلشیم، میگنیشیم، پوٹاشیم، لوہا اور سوڈیم وغیرہ۔ ان عناصر کی خصوصیات منفرد طور پر کچھ ہوتی ہے تو مرکب ہونے کے بعد کچھ اور ہو جاتی ہے۔ (جیسے پچھلے صفحات میں پانی کی مثال دی جا چکی ہے) اور انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

(مختلف عناصر کے باہمی ملاپ اور تعامل سے وجود میں آنے والے سالمات اور مرکبات) پائے جاتے ہیں ان کی صحیح توجیہہ و تعلیل نہیں ہوسکتی اور کوئی قطعی و یقینی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت عظمیٰ کا اظہار قرآن حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے:

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (اسراء ۸۵)

جن چیزوں کو ہم سائنسی ادب یا اپنی بول چال میں "حقائق اشیاء" یا "اسرار سربستہ کی راز جوئی" وغیرہ کہتے ہیں، وہ دراصل مادی اشیاء کے محض چند ظاہری پہلو ہوتے ہیں، جن کو دریافت کرکے انسان خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے "حقائق" پر سے پردہ اٹھا دیا ہے، حالانکہ اصل حقائق کے مقابلے میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسی کو قرآن حکیم اپنے بلیغ اسلوب میں "علم قلیل" سے تعبیر کرتا ہے[۱] یہ بھی محض انسان کا دل رکھنے

---

[۱] ایک مغربی فاضل نے اس ابدی صداقت کا بہت خوبی کے ساتھ اعتراف کرکے اس ربانی اصول پر مہر تصدیق اس طرح ثبت کی ہے:

"سائنس کے لئے اکتشافات" "نامعلوم" میں غوطے نہیں لگاتے، بلکہ وہ اُن مشاہدین کے ذریعہ جن کی آنکھیں تاریکی میں بہ نسبت دوسروں کے زیادہ گہرائی کے ساتھ حقیقت تک پہنچ سکتی ہیں، "معلوم" کے چند دھندلے سے حاشیے بناتے ہیں لیکن یہ سوال کہ سائنس میں "معلوم" کیا ہے؟ اس کا فلسفیانہ جواب ہوگا "کچھ بھی نہیں۔ جب کوئی ماہر سائنس یہ کہتا ہے کہ "کچھ معلوم ہے"، تو اس کی مراد محض یہ ہوتی ہے کہ وہ (طبیعی) واقعات کے سلسلے میں ایسی چند یکسانیتوں کو جانتا ہے جو اس تصور کو بظاہر معقولیت بخشتی ہیں کہ یہاں پر (علت و معلول کی بنا پر) چند اسباب کارفرما ہیں۔ اور مشاہدہ میں آئی ہوئی یہ یکسانیتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ مظاہر چند قوانین کے تابع ہیں۔"

The Encyclopedia of Ignorance, P. 252.

اعلاس کی ہمت افزائی کے طور پر ہے کہ کہیں وہ اپنی تحقیق و تفتیش سے بد دل نہ ہو جائے۔
حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف اشیاء کے "ناموں" (الاسماء) اور ان کی ظاہری کارکردگیوں" (علم قلیل) ہی سے واقف ہے، اُن کی اصل حقیقت و ماہیت (وہ باطنی اسرار جو امور غیب میں داخل ہیں) سے واقف نہیں[1] اور اس میں راز یہ ہے کہ کہیں یہ ذرۂ خاک تمام چیزوں کی حقیقت سے واقف ہو کر اس کائنات میں "خود مختار" اور خودسر نہ ہو جائے یا خدا کی برابری کا دعویٰ کرنے نہ لگ جائے، بلکہ اس کو اپنی کمزوری اور بے بسی کا شدید احساس ہوتا رہے۔ اور دوسری حیثیت سے وہ یہ محسوس کرے کہ وہ کسی اور کی مملکت اور قلمرو میں رہتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے سے ایک برتر اور ہمہ داں و ہمہ بیں ہستی کے وجود کا اعتراف کر کے (جس کا مشاہدہ اس عالم مادی میں قدم قدم پہ ہو رہا ہے) اُس کے حضور میں سجدہ ریز ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "مادہ" میں ودلیعت شدہ فوائد سے تو مستفید ہو سکتا ہے مگر وہ کسی بھی طرح مادہ کی "آخری حقیقت" معلوم نہیں کر سکتا۔ یہ علم اصلی و حقیقی صرف اس کے خالق و مالک (جل جلالہ) کو ہی ہو سکتا ہے۔
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط اور اُسی کے پاس ہیں مخفی چیزوں کی (تمام) کنجیاں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (انعام ۵۹)
یہ عالم مادّی کی ایک عظیم ترین حقیقت اور سرّ الٰہی ہے۔ جس کے اقرار و اعتراف سے کسی بھی وسیع النظر عالم اور محقق کو چارۂ کار نہیں ہے۔ پچھلے صفحات میں آپ چند

---

[1] اللہ تعالیٰ نے اظہار ربوبیت کے طور پر اس مادی کائنات میں دو طرح کے قوانین جاری کیے ہیں: (۱) ظاہری (۲) اور باطنی۔ انسان محض ظاہری قوانین ہی کو معلوم کر سکتا ہے۔ باطنی یا خفیہ قوانین کا پتہ چلانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ باطنی قوانین کی راز جوئی خدا کی خدائی میں دخل دینے کے مترادف ہے اور انسان کبھی اس پوزیشن میں آ ہی نہیں سکتا۔

ماہرین سائنس کے بیانات ملاحظہ کر چکے ہیں، اب اس موقع پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی چند اعترافات ملاحظہ ہوں : دورِ جدید کا مشہور فلسفی اور عالم فطرت ہربٹ اسپنسر کہتا ہے :

"علم طبیعی ہم کو ایک محدود دائرہ تک لے جاتا ہے، جس سے آگے ہم جا نہیں سکتے اور سبب اوّل اور اس کی حقیقت کا ادراک کر نہیں سکتے ہیں۔"[1]

عہدِ حاضر کے سب سے بڑے فلسفی اور مادہ پرست (Materialist) برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) تک کو اقرار و اعتراف ہے کہ مادی علوم کی ترقی جس رفتار سے ہو رہی ہے اسی نسبت سے جہل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے :

"سائنس کی حالیہ ترقیوں نے ایک بہت بڑی تکلیف دہ صورت حال سے دوچار کر دیا ہے کہ ہر ترقی ہمارے علم کو اس سے کم کر دیتی ہے جتنا ہم پہلے حاصل سمجھتے تھے۔"[2]

مختصر تاریخ سائنس کا مؤلف سرڈبلیوسی ڈامپیرس لکھتا ہے :

"علم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی عدم علم یا نامعلوم کا رقبہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور جتنا زیادہ ہم نامعلوم میں گھستے ہیں اتنا ہی جو کچھ ہم کو وہاں ملتا ہے اس کو صاف و سادہ قابلِ فہم الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے۔"[3]

حاصل یہ کہ انسان کا علم روزِ اوّل ہی سے "علم الاسماء" تک محدود تھا اور "حقیقۃ الاسماء"

---

[1] منقول از تفسیر الجواہر، ۱/۳۵۔

[2] Will to Doubt، بحوالہ مذہب اور سائنس، ص ۱۴۶۔

[3] A Short History of Science, by W.C. Dampier. بحوالہ مذہب اور سائنس، از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۱۴۶

تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف انسان ایٹم کا سینہ چیر کر اس کے اندر ودیعت شدہ توانائیوں (ایٹمی قوت) سے مستفید ہو رہا ہے اور عناصر کے باہمی آمیزہ سے طرح طرح کے عجائبات کا اظہار کر رہا ہے (ملاحظہ ہو دوسرا اور تیسرا باب) مگر دوسری طرف حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے وہ ان عناصر کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہے۔ یعنی "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" اس عالم رنگ و بو میں نہ صرف زندگی اور اس کے مظاہر پراسرار ہیں بلکہ خود مادہ اور اس کے ظواہر بھی پراسرار اور حیرت انگیز ہیں۔

نظریۂ میکانیت (Machanism) کی ناکامی | ان ٹھوس اور ناقابل تردید حقائق کے ملاحظہ سے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ان تمام مادیین (Materialists) کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور میکانیت پسندوں کا سر غرور نیچا ہو جاتا ہے جن کا دعویٰ اور عقیدہ تھا کہ اس جہانِ آب و خاک کی کل مشنری اور اس کے تمام کل پرزوں کی مادی و میکانکی نقطۂ نظر سے توجیہہ و تعلیل کی جا سکتی ہے اور ہمیں اس آب و رنگ میں کسی فوق الطبیعی قوت کے تسلیم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اس نظریہ کی تشریح بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے:

" دنیائے مادّیات میں نیوٹن اور تاریخ فطرت میں ڈاروِن کے اکتشافات کی انتہاء بالآخر میکانیت پر ہوئی۔ اور پھر یہاں تک کہا گیا کہ ہمارے سب مسائل دراصل طبیعیات ہی کے مسائل ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ حیات، فکر، ارادہ، احساس غرض یہ کہ ہر شے کی توجیہہ جواہر اور ان کی خواص کی بنا پر جو گویا بالذات ان میں موجود ہیں ہو جائے گی۔ یوں میکانیت کا تصور جو سرتاسر ایک طبیعی تصور ہے ہمہ گیر اصول بن گیا اور فطرت کے ہر پہلو کی تشریح اس کے ماتحت ہونے لگی۔" [۵]

---

[۵] تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۹۳

بیسویں صدی کی تحقیقات نے اس باطل عقیدے کی کمر توڑ کر رکھ دی یعنی وہ نظریہ جو قانونِ علیت (Causation) کے میکانکی تصور کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، جدید طبیعی تصورات مثلاً نظریۂ اضافیت اور کوانٹم تھیوری وغیرہ کے منظر عام پر آنے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔

"علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا: مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکاں اور علت و معلول جیسے بنیادی تصور جڑ سے بدل گئے۔ اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔"[۱]

ڈاکٹر الکسس کیرل نظریۂ میکانیت کے علمبرداروں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نفسیاتی مظاہر کو خلیوں کی فعلیات یا حرارتی میکانکس کی اصطلاحات میں بیان کرنا محض الفاظ سے کھیلنے کے مترادف ہو گا۔ تاہم انیسویں صدی کے میکانکی ماہرین فعلیات اور ان کے چیلے جن کا وجود اب تک چلا آرہا ہے، اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ انسان کو طبیعیات اور کیمیا کے اندر محصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحیح تجربات سے اس قسم کے غیر منصفانہ نتائج اخذ کرنا درحقیقت خاص خاص فنون میں غلو کا نتیجہ ہے۔"[۲]

۱۔ مذہب اور سائنس، مقدمہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ص ۳۶ - ۳۷

۲۔ نامعلوم انسان، ص ۵۴

ایک دوسری جگہ بیان کرتا ہے:

"یہ کہنا کہ دماغی خلیے دماغی افعال کا مرکز ہیں، ایک فضول ادعا ہوگا کیونکہ دماغ کے خلیوں میں دماغی افعال کا مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے" ۵۱

یہ ہے نظریۂ میکانیت اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر کے عروج وزوال کی داستان جو اپنے اندر بہت سی عبرتیں اور بصیرتیں رکھتی ہے۔ ایک حیثیت سے دیکھیے تو انسان مادہ کے بنیادی اجزاء و عناصر کے اسرار اور اس کی باریکیوں کا دقتِ نظر سے جائزہ لے رہا ہے، علم کیمیا کے میدان میں حیرت انگیز کرشمے دکھا رہا ہے، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہا ہے (جو انہی عناصر کے دقیق علم کا نتیجہ ہے)، افلاک پر ڈورے ڈال رہا ہے اور چاند ستاروں کی تسخیر کر رہا ہے مگر دوسری حیثیت سے دیکھیے تو وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کو ایک ذرہ کی بھی اصل حقیقت و ماہیت کا کوئی علم نہیں ہے۔ موجوداتِ عالم کی صحیح کنہ و حقیقت کو وہ نہیں جانتا اور زندگی کے مبادی سے بھی وہ واقفیت نہیں رکھتا بلکہ ہر چیز کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتا اور تحیر و درماندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انسانی دائرۂ کار کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت درجہ عجیب و غریب، متضاد اور بصیرت افروز ہیں، جو دراصل اس احساس کو شدید سے شدید تر کر دیتے ہیں کہ انسان دراصل اس کائنات میں بالکل آزاد اور خود مختار نہیں ہے بلکہ کسی اور کی سلطنت اور قلمرو میں رہتا ہے۔ فکر و عمل میں آزاد ہونے کے باوجود وہ خود کو اکثر پابہ جولاں اور سلاسلِ عبدیت میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ انسان کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ دونوں ہی پہلو مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور ضروری ہیں۔ ۵۲

---

۵۱ نامعلوم انسان، ص ۴۳۔

۵۲ ان مباحث کے نتیجے میں ایک اور حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ (باقی صفحہ ۲۴ پر)

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝
اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں؟ (ذاریات: ۲۰ — ۲۱)

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنكِرُونَ ۝ اور وہ تم کو اپنے نشانات ودلائل دکھادے گا۔ پھر تم اللہ کے کن کن نشانات ودلائل کا انکار کرتے پھروگے؟ [1]
(مومن — ۸۱)

(بقیہ صفحہ ۲۳) انسان جب طبیعی اور حیاتیاتی نقطۂ نظر سے اپنی اصلیت وماہیت دریافت نہیں کرسکتا تو وہ اپنی زندگی کے ضوابط بھی خود وضع نہیں کرسکتا۔ کیونکہ طبیعی وحیاتیاتی علوم کے مقابلے میں سماجی اور اقتصادی علوم محض قیاسی اور ناقابل ثبوت ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر سائنسی علوم کے یقینی اور قطعی مسائل میں جب کسی کلی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا تو پھر محض قیاسی اور غیر یقینی علوم میں قطعی بات اور حتمی صداقت کا فیصلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے جبکہ انسانی تعلقات کے قوانین ہی اب تک پوری طرح معلوم نہیں ہوسکے ہیں؟ لہٰذا وہ اپنے ضوابط زندگی کے لیے مافوق الطبیعی ہستی کے احکام وہدایات کا محتاج ہے۔

[1] لفظ 'آیات' آیۃ کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی نشانی یا ظاہری علامت کے ہیں۔ یہ بذات خود دلیل نہیں ہوتی بلکہ منطقی دلیل کی طرف نشاندہی کرنے والی ہوتی ہے۔ مثلاً دھواں اس بات کی علامت ہوگا کہ متعلقہ مقام پر آگ موجود ہے۔ اس لحاظ سے ہماری یہ طبیعی اور نیچرل کائنات — اپنے تمام مظاہر اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ — اپنے حقائق ونشانات سے بھری ہوئی ہے جو منطقی دلائل کے مقدمات بن سکتے ہیں اور استقرائی طور پر انھیں ترتیب دے کر ان سے وہ تمام مابعد الطبیعی حقائق ثابت کیے جاسکتے ہیں جن کا ادعا قرآن اور اسلام کرتے ہیں۔　　(باقی صفحہ ۲۵ پر)

یہ قرآن عظیم کا عجیب و غریب اعجاز ہے کہ چودہ سو سال قبل اس نے جو دعوے کیے تھے وہ اپنی جگہ پتھر کی لکیر بنے ہوئے ہیں اور پیہم و لگاتار ان کی تصدیق و تائید کا سلسلہ جاری ہے۔ کیا انسانی لٹریچر میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود ہے؟۔

۲۰ — وارثین علم آدم کا فریضہ | ان آیات کریمہ (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) کا منشا اور تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم خصوصاً "وارثین علم آدم" دنیا کی تمام چیزوں اور کل موجودات عالم کا علم حاصل کریں اور عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق دینی و دنیوی ہر حیثیت سے عالم انسانی کی رہنمائی کریں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط اور تم اپنے رب کے راستے کی طرف دانش مندی اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔ (نحل۔ ۱۲۵)

حیرت کی بات ہے کہ جب ہم قرآن کریم میں ان آیات کو پڑھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے "باپ" نے فرشتوں کے سامنے تمام اسماء گنا کر اپنی برتری ظاہر کر دی اور اپنی فضیلت کا سکہ بٹھا دیا۔ مگر وہ کبھی کوشش نہیں کرتے کہ اپنے باپ کا یہ علم حاصل کر کے صحیح معنی میں اس کے "وارث" بنیں اور اقوام عالم پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کریں جبکہ دوسری قومیں یہ علم صحیح طور پر حاصل

(بقیہ صفحہ ۲۴۲) اب یہ علمائے اسلام کا کام ہے کہ طبیعی و حیاتیاتی تمام سائنسی علوم کا جائزہ لیکر قرآن کے اس عظیم منشا و مقصد کے مطابق دلائل آفاق و انفس کی تدوین کریں۔ یہ ایک فرض کفایہ ہے جس سے آج بہت غفلت برتی جا رہی ہے۔ اس کار عظیم کے بغیر عصر جدید میں قرآن کی حقانیت واضح نہیں ہو سکتی اور اس کا اصل کارنامہ ظاہر نہیں ہو سکتا بلکہ جدید انسان پر حجت بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

کر کے نہ صرف آفاق عالم پر اپنی برتری کا جھنڈا لہرائے ہوئے ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ہم کو نیچا دکھا رہی ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے کہا گیا کہ "تم ان کو تمام موجودات عالم کے نام بتا دو" تو آپ نے یہ تمام نام فرفر سنا دیئے۔ مگر آج "وارثین علم آدم" کے سامنے جب "چیزوں کے نام" آتے ہیں تو وہ یا تو وحشت زدہ ہو جاتے ہیں یا ان کو "غیر اسلامی" یا "علم غیر" کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ (محنت و مشقت اور فکری و اجتہادی قوتوں کے ذریعہ ان اشیاء کے آثار و خواص کو خود سے دریافت کرنا اور علم کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لینا تو بہت دور کی بات ہے۔) حالانکہ ان تمام اشیاء، اُن کے خواص، ان کے اعمال اور ان کی کارکردگیاں سب انھیں ازبر ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے مترشح ہو رہا ہے:

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

ارشاد ہوا کہ اے آدم! تم ان کو تمام چیزوں کے نام بتا دو تو انھوں نے (فرفر) اُن کے تمام نام فرشتوں کو بتا دیے۔ (بقرہ — ۳۳)

اس "علم آدم" سے منہ موڑنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم دنیوی حیثیت سے کمزور اور زوال و انحطاط کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور زندگی کے ہر میدان میں دوسروں کے دست نگر بن کر گویا اقوام عالم کے محتاج اور غلام بنے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ روئے زمین پر "خلیفہ" وہی ہو سکتا ہے جو "علم اسماء" یا "علم آدم" (تمام سائنسی و صنعتی علوم) کا صحیح معنی میں وارث ہو۔ یہ ان آیات کریمہ کا عقلی و منطقی نتیجہ ہے۔ اب مسلمان غور کریں کہ وہ اپنے باپ کے علم سے کہاں تک بہرہ ور ہیں اور خلافت ارض کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کر رہے ہیں؟

"تسخیر فطرت آدم کی صفت، اس کا وظیفۂ حیات اور اس کا مقصودِ زندگی ہے۔

تسخیر فطرت سے مغرب نے غیر معمولی قوت حاصل کرلی ہے جن قوموں نے اس میں حصہ نہیں لیا وہ مغلوب اور مفکر، ورہو گئی ہیں۔ علوم و فنون کی ترقی اور تسخیر فطرت نے زندگی کے متعلق نئے زاویائے نگاہ پیدا کردیے ہیں؛ مسائل حیات کی صورت بدل گئی؛ قدیم تصورات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا لازمی ہوگیا ہے[۱]

۲۱ — کیا حضرت آدم سائنٹسٹ تھے
ایک اعتراض اور اس کا جواب -

میرے ان خیالات سے واقف ہو کر بعض دوستوں نے سوال کیا کہ کیا حضرت آدمؑ بھی کوئی سائنٹسٹ یا ماہر سائنس تھے جو تمام جزئیات و کلیات پر حاوی ہو گئے تھے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ قرآن کریم کی نص قطعی (واضح اور صریح ارشاد) کی موجودگی میں یہ سوال غیر ضروری ہے۔ تفصیلات کا علم ہم کو نہیں دیا گیا؛ بلکہ اجمالاً صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ "اللہ نے آدم کو تمام اشیاء و خواص کے نام بتا دیے" اس علم کی اہمیت حضرت آدمؑ سے بڑھ کر اولاد آدم کے لیے ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ حضرت آدم کو اگرچہ تمام علوم (فکری و نظری طور پر) سکھا دیے گئے تھے، مگر عملاً عہد آدم میں ان کا ظہور نہیں ہوا بلکہ تبدریج اور بالفعل عصر بہ عصر تحقیق و تفتیش کے ذریعہ ان کا ظہور ہو رہا ہے۔

اور اس کی ایک توجیہ یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ بیان دراصل قرآن حکیم کی اعجازی حکمت و رہنمائی کے تقاضے کے تحت موجودہ دور کے کاہل "اتفاقی النسل" مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے تن مردہ میں نئی روح اور نیا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ایک تنبیہ الٰہی ہے "کہ وہ مایوسی اور احساس کمتری کے موجودہ جال سے باہر نکل کر

---

[۱] فکر اقبال ص ۴۵۸ — ۴۵۹

زندگی کے میدان میں نئے جوش اور نئے عزم کے ساتھ جدوجہد کرنے اور اقوام عالم کے درمیان موجودہ مسابقت کے دور میں بازی جیتنے پر آمادہ ہو سکیں۔ قوم مسلم کو آمادۂ جدوجہد کرنا اور زندگی کے میدان میں دوبارہ سرگرم عمل کرنا موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت اور خلافت ارضی کی تکمیل یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہے۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم کی یہ اعجازی رہنمائی، خاص کر موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے جو انھیں ان تمام علوم و فنون کو — جن کے ذریعہ خلافتِ ارض کی تکمیل ہو سکتی ہو — نہ صرف ضروری بلکہ درحقیقت آدم کی میراث اور اس کی کھوئی ہوئی متاع قرار دیتا (وہ متاع بے بہا اور شے گراں بہا، جس کی تحصیل ہماری عزت و سربلندی کا مدار ہے) قرآن عظیم جیسے ابدی اور لافانی کلام ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی یہ کوئی معمولی اور سرسری خصوصیت یا سرسری بیان نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے یا حقیر سمجھ کر فراموش کر دیا جائے۔ یہ قرآن حکیم کے عظیم الشان کارنامے، بے مثال رہنمائی اور اس کی لاثانی حکمت کا محض ایک نمونہ اور اس کی ایک چھوٹی سی آیت کا اعجاز ہے۔ (وعلم آدم الاسماء کلہا)۔ مگر کون ہے جو اس چھوٹے سے ربانی فقرہ کی صحیح حکمتوں اور بصیرتوں کا احاطہ اور اس کی مکمل تشریح و تفسیر کر سکے![1]

قرآن حکیم ایک زندہ اور ابدی صحیفہ ہے۔ اس کے دامن میں ایسے جواہر پارے موجود ہیں جو رہتی دنیا تک اپنے سب سے بڑے وصف "ہدایت و رہنمائی" کے مطابق زندگی کے ہر میدان میں امت مسلمہ کی — خصوصیت کے ساتھ — رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس کی اعجازی زبان اور اس کے اعجازی اسلوب کو سمجھنے کی ہے اور اس بحر حکمت کے آبدار موتیوں سے اقوام عالم کی نگاہیں خیرہ ہو سکتی ہیں۔ ضرورت صرف ذہنی

---

[1] یہی وجہ ہے کہ اس جیسا بے مثال اور لاثانی کلام پیش کرنے سے تمام جن و انسان عاجز ہیں۔

کرنے اور ضرب کلیمی سے اس کے سینے کو چیرنے کی ہے۔ اوپر ہی اوپر تیرتے رہنے سے "اندر" کا حال معلوم نہیں ہو سکتا اور اس "قلزم خاموش" کے اسرار فاش نہیں ہو سکتے۔

غرض یہ تمام تفصیلات اس لیے بیان کی گئیں کہ خلافت ارض کی تکمیل کے لیے ان علوم کے ساتھ ساتھ متعلقہ مسائل کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، جدید علوم و افکار کا ایک مکمل تجزیہ ہو جائے، قرآن حکیم کا صحیح تعارف اور عصر جدید میں اس کی رہنمائی کا اعجازی پہلو کھل کر سامنے آجائے اور اس سلسلے کے تمام شکوک و شبہات بھی رفع ہو جائیں۔ کوئی بھی بات بلا دلیل اور بلا سند نہ بیان کی جائے۔ اور حتی الامکان تمام دلائل قرآن سے لائے جائیں۔ اس مقصد عظیم کے لیے میں نے صرف ایک آیت کریمہ کو منتخب کر کے اپنی اس پوری کتاب کا مرکز بحث قرار دیا ہے۔ تمام مباحث کا دائرہ اسی ایک مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔

بہرحال ان علوم کی اہمیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اگلے باب میں ان علوم کی عملی حیثیت سے اہمیت و افادیت کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

علوم عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سری نگر (کشمیر)

علوم عقلیہ میں علامہ انور شاہ کی بصیرت علامہ انور شاہ کشمیری نقلی علوم میں فاضل جلیل تو تھے ہی، مگر بہت کم اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ انھیں عقلی علوم جیسے فلسفہ، منطق اور کلام پر بھی وسیع اور گہری نظر تھی۔ انھوں نے ان علوم پر نہ صرف تقریریں اور بحثیں کی ہیں بلکہ فلسفہ اور کلام کے کچھ اہم مسائل پر دو رسالے لکھے ہیں۔ ان کے عہد میں طبیعیات اور ہیئت پر بہت سی ایسی باتیں منظر عام پر آرہی تھیں جنھوں نے قدیم طبیعیاتی اور ریاضیاتی تصورات میں بڑا انقلاب رونما کیا، علامہ کشمیری اپنے وفور مطالعہ سے ان علمی تحقیقات سے بھی باخبر تھے، پھر انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں معقولات کی کتابیں نہ صرف یہ کہ درس میں باضابطہ پڑھی تھیں بلکہ درس کے علاوہ بھی وہ معقولات کی کتابوں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے قاضی مبارک، شرح چغمنی صدرا، شمس بازغہ، نفیسی وغیرہ کتابیں درس میں پڑھی تھیں۔ یہ کتابیں اس زمانے میں اونچے درجوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ دیوبند کی مدرسی اور صدر مدرسی کے زمانے میں اگرچہ وہ استاد حدیث کی حیثیت سے مشہور رہے مگر یہاں بھی وہ فارغ اوقات میں چند خاص شاگردوں کو جدید سائنس کی تعلیم دیتے تھے۔ دیوبند میں آپ کے قیام کے ساتویں سال یعنی [illegible] کے روئداد دارالعلوم میں یہ الفاظ درج ہیں:

"مولانا سات سال سے دارالعلوم میں مقیم ہیں اور طلبہ کو علوم حدیث کا مستقلاً درس دیتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر فنون کی ہر قسم کی کتابوں کا وقتاً فوقتاً داخلی اور خارجی اوقات میں درس دیتے رہتے ہیں۔ طلبہ رات دن ہر قسم کے استفادے آپ سے کرتے ہیں"[۱]

علامہ کشمیری کے ایک اور سوانح نگار لکھتے ہیں:

"فلسفۂ جدید اور ہیئتِ جدید کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی ایک کتاب بھی پڑھائی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت بھی حاصل کرنا چاہیے"[۲]

پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اس کا شاید کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزیکس، کمسٹری اور بیالوجی کا بھی بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ان علوم میں بھی ان کی نظر مبصرانہ تھی"[۳]

مولانا اکبرآبادی نے ان مخصوص طلبہ میں، جنھیں علامہ کشمیریؒ عقلی علوم کا درس دیتے تھے، حضرت مولانا بدرعالم صاحب میرٹھیؒ کا نام بھی ذکر کیا ہے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ علامہ کشمیری انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے اور علوم عصریہ سے باخبر اور واقف ہونے کے لیے یہ زبان کلیدی حیثیت رکھتی ہے، مگر انگریزی زبان سے عدم واقفیت سائنس اور سائنسی معلومات کے حصول میں علامہ کشمیری کے لیے مانع ثابت نہیں

---

[۱] بحوالہ فرنگیوں کا جال: امداد صابری: ص ۱۴۹، صابری پبلشرز دہلی ۱۹۴۹ء

[۲] بحوالہ: موج کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام: ص ۲۱۰، فیروز سنز پاکستان ۱۹۶۸ء

[۳] حیات انور مولانا ازہر شاہ قیصر: حصہ دوم، ص ۴

ہوئی کیونکہ اس زمانے میں عرب ممالک میں یورپی تصانیف اور تالیفات کا بڑے زور شور سے عربی میں ترجمہ ہو رہا تھا اور یہ عربی مطبوعات ہندوستان بھی پہنچتی تھیں۔ علامہ کشمیری انہی کے توسط سے جدید تحقیقات کا مطالعہ کرتے تھے۔ بالخصوص (دو دائرۃ المعارف (بستانی اور فرید وجدی کی) اُن کی آنکھوں کے سامنے بالفاظ مولانا بنوری رحمہ گویا کاغذ کا ایک ورق تھیں:

فهذا كتاب دائرة المعارف للوجدی او للبستانی كانما صفحة واحدة بين عينيه [1]

فرید وجدی یا پطرس بستانی کی دائرۃ المعارف ان کے دماغ میں اس طرح نقش ہیں گویا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے کاغذ کا ایک ورق ہیں۔

ایک مرتبہ علامہ اقبال نے علامہ کشمیری سے پوچھا کہ کیا آپ نے نیوٹن کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے نیوٹن کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور زمان و مکان سے متعلق ان کی تحقیقات وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے عراقی فلسفی نے اپنے رسالے میں پیش کی ہیں۔" اگرچہ علامہ کشمیری کے فلسفہ پر لکھے ہوئے دو رسالے ان کی علمی بصیرت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ثبوت ہیں تاہم عصری علوم سے متعلق بہت سی تحقیقات وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح آنے والی نسل کو محروم رکھا۔ ان کے دو رسالوں اور دوسرے منتشر افادات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ اور کلام میں بھی دوسرے ماہرین فن کی طرح اپنا علیحدہ مقام رکھتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل کا آخری سال یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! وہ ڈابھیل کا آخری سال، استادِ زماں کی پڑھائی، معقولات کے فاضل طلبہ وہاں پہنچے اور ہر ایک اپنے آپ کو ابن سینا سمجھتا تھا۔

---

[1] عقیدۃ الاسلام، علامہ محمد انور شاہ کشمیری: مقدمہ: مولانا محمد یوسف بنوری، ص ۱۴، کراچی

مگر ساری کروفر اس وقت ختم ہوگئی جب حضرت شاہ صاحب نے اپنے معصومانہ انداز میں سفید مونچھوں اور ڈاڑھی کے درمیان عنابی ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا: عالمِ مثال کے متعلق ابن سینا نے یہ کہا، غزالی کا نظریہ یہ ہے، ابن عربی یہ کہتے ہیں، رازی کا خیال یہ ہے اور میں یہ کہتا ہوں[1]"

علامہ مصطفیٰ صبری اور ڈاکٹر اقبال کا اعتراف جوہر کی قدر جوہری ہی سمجھ سکتا ہے جس طرح علامہ کشمیری کی فقہی بصیرت اور تخصصِ علم حدیث کے آگے وقت کے سربرآوردہ فقہاء اور محدثین نے سرخم کیا اسی طرح عقلی علوم میں ان کی مہارتِ کاملہ کا اعتراف وقت کے مسلم الثبوت علمائے معقولات نے بھی کیا ہے جس میں سرفہرست علامہ مصطفیٰ صبری (سابق شیخ الاسلام ترکی) اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اسمائے گرامی ہیں۔

علامہ صبری کے بارے میں علامہ محمد یوسف صاحب بنوری محدثؒ لکھتے ہیں کہ جب میں نے علامہ کشمیری کا رسالہ "مرقاۃ الطارم علی حدوث العالم" انھیں پیش کیا تو اس کا مطالعہ کرکے انھوں نے کہا کہ میں اس چند اوراق پر مشتمل رسالے کو صدر شیرازی کی بسیط وضخیم تصنیف "اسفار اربعہ" پر ترجیح دیتا ہوں[2] کاتب الحروف کو علامہ صبری کے اس رسالے سے متاثر ہونے کا عملی ثبوت اس وقت ملا جب علامہ صبری کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب میں علامہ کشمیری کے اس رسالے کے کئی جگہوں پر حوالے پائے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

بعد ما ان کتبت ھذا رأیت "مرقاۃ الطارم" لعالم الھند الکبیر

---

[1] حیاتِ انور: حصہ دوم: ص ۳۴۔

[2] حیاتِ انور۔

محمد انور شاہ الکشمیری ص ۳۷ " والمحوج الی العلة لیس هو الامکان کالذی یکون فی ممکن بقی فی العدم ولا حدوث فی اول آن، بل وجود یکون من الغیر، فالعلة هی الموجدیة الحادثة وکان المراد بالحدوث الوجود فی مقابلة العدم .... " فسرّنی ان اتفقنا فی الرای[1]

یعنی اثنا ریں جب کہ میں اس موضوع (حدوث و قدم عالم) پر کچھ لکھ رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے ایک بڑے عالم محمد انور شاہ الکشمیری کا رسالہ مرقاۃ الطارم ملاحظہ کیا وہ اس رسالے میں صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں ..... میں خوش ہوا کہ ہم اس رائے میں متفق ہیں۔

ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری | جہاں تک ڈاکٹر محمد اقبال اور علامہ کشمیری کے باہمی تعلقات کا تعلق ہے تو یہ ایک مستقل موضوع تحقیق ہے۔ اگرچہ اس پر کچھ لکھا بھی گیا ہے مگر ابھی تشنگی باقی ہے اور پھر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بہت کچھ بے اصل ہے۔ وقت کے ان دو نامور فضلاء نے ایک دوسرے سے کون سے فوائد حاصل کئے اس کے لیے پہلے دونوں کی تصانیف کا بغائر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے معتقدین کی اس جماعت نے بھی آنے والے محققین کو سخت مشکلات میں ڈال دیا جو جماعت اقبال کی عقیدتمند بن کر ان کے فکر و فلسفہ کو مشق ستم بنائے ہوئے ہے۔ انھوں نے اپنے من پسند افکار کو تقویت پہنچانے کی غرض سے نہ صرف اقبال کے افکار و خیالات کی تنسیخ و تحریف کی بلکہ مسلمہ تاریخی حقائق سے بھی آنکھ چرانے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں کی کتابیں نہایت احتیاط سے پڑھنے کی مستحق ہیں اور وقت بھی آہستہ آہستہ ان کی تحریفی کوششوں کو مسترد کر رہا ہے بلکہ کر بھی چکا ہے۔

علامہ محمد انور شاہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کو آپس میں قریبی تعلق تھا، اور ڈاکٹر صاحب عملی طور

---

[1] موقف العقل والعلم والعالم من رب العالمین وعباده المرسلین، ج ۳ ص ۳۲۷۔

علامہ کشمیری سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

ولم یزل یستفید فعلاً من العلّامۃ الکبیر انور شاہ الکشمیری والاستاذ الکبیر العلّامۃ السید سلیمان الندوی[1]	وہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری اور علامہ سید سلیمان ندوی سے عملاً استفادہ کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کے قریبی ساتھی اور مخلص دوست نیز ان کی تصانیف کے مشہور روزگار شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

"اقبال نے اپنے کلام میں ملّائیت کی ضرور تردید کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ملّاؤں سے ناراض تھے۔ ملا اور ملائیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اقبالؔ ملّائیت سے بے شک بیزار تھے لیکن ملا یعنی عالم دین کے عاشق زار تھے۔ چنانچہ آخری دور میں انھوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ملا یعنے امام العصر علامۃ الدہر حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور کسی طرح لاہور میں مستقل طور سے اقامت گزیں ہو جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کریں[2]۔"

یہی حقیقت ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور حلقۂ اقبال سے منسلک دوسرے اعتدال پسند اور غیر متعصب اہل قلم نے بھی بیان کی ہے[3]۔

---

[1] روائع اقبال: مولانا سید ابوالحسن علی الندوی: ص ۱۲ (حاشیہ)، دارالفکر العربی، دمشق سنہ ۱۹۶۰ء

[2] ارمغان حجاز: شرح: پروفیسر یوسف سلیم چشتی: ص ۱۷۱-۱۷۲، دہلی۔

[3] علامہ اقبال کی مشہور نظم "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری"، جو ارمغان حجاز کے اردو حصے میں شامل ہے، کے بارے میں بعض اہل علم دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا براہِ راست تعلق علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ ہی کے ساتھ ہے۔ اگرچہ نظم میں "انور شاہ" کا نام کسی جگہ نہیں آتا ہے مگر نظم کا عنوان پھر بھی اس قدر واضح ہے کہ اس سے علامہ کشمیری کے بغیر کوئی اور ذات مراد نہیں لی جا سکتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جہاں تک علامہ کشمیری رح کے حلقے کا تعلق ہے تو اس سے بھی ان دو شخصیتوں کے باہمی علمی رشتوں کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب، جو گویا علامہ کشمیری کے صاحب البیت رہ چکے ہیں، انھوں نے بھی اپنے ایک مبسوط مضمون میں لکھا ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵) وادئ لولاب میں حضرت شاہ صاحب کے مرتبے کا کوئی اور عالم پیدا نہیں ہوا ہے "ضیغم لولاب" کہلانے کے مستحق صرف حضرت مولانا انور شاہ رح ہی ہیں۔ جو یقیناً ملازادہ ہی تھے۔ اقبال رح کے دل میں ملا کی جو قدر و منزلت تھی پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے وہ اچھی طرح واضح کی ہے۔ مزید برآں نظم کا یہ آخری بند بھی علامہ کشمیری ہی کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے — اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اے وادئ لولاب

علامہ اقبال کی کئی نظمیں علمی اور ادبی نیز سیاسی و روحانی دنیا کی بعض سربرآوردہ شخصیتوں کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ مگر اگر ان کے عنوان پر تھوڑی دیر کے لیے انگلی رکھی جائے گی تو ان کی حقیقت تک پہنچنے میں بڑی دقت پیش آئے گی جیسے مسولینی، حکیم نطشہ، شیکسپیئر، بلال وغیرہ

جہاں تک زیر بحث نظم کے بارے میں شارحینِ اقبال کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض حضرات نے سکوت اختیار کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالسلام ندوی انہی میں شامل ہیں۔ (ملاحظہ ہو شرح ارمغانِ حجاز، از مولانا مہر و اقبال کامل، از مولانا ندوی) پروفیسر چشتی کو بھی انہی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

"میری رائے میں لولاب کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ شاہ صاحب یعنی امام العصر رئیس المحدثین حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ صاحب مرحوم جیسا یگانۂ روزگار وہاں پیدا ہوا تھا۔ ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ میں بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ

(بقیہ حاشیہ ص۳۶) تھا یا۔[۱]

بعض حضرات کے نزدیک اس نظم سے تو اہل کشمیر ہی مراد ہیں جن میں علامہ محمد انور شاہ صاحب بھی نہ صرف شامل ہیں بلکہ ان کے نزدیک نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں شاہ صاحب کا موجود ہونا بعید از عقل نہیں ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد انہی میں شامل ہیں۔ بعض اہل قلم نے اس نظم کو عجیب چکر دے کر دعویٰ کیا ہے کہ یہ نظم اقبال کی اپنی بیاض ہے۔ کوئی دوسری شخصیت اس سے مراد نہیں ہے، اس گروہ کے سرخیل پروفیسر خلیفہ عبدالکریم مرحوم ہیں (ملاحظہ ہو: فکرِ اقبال) مگر حق بات یہ ہے کہ خلیفہ صاحب اور ان کے پیروکار، اپنے علم و فضل کے باوجود، اس قابل نہیں ہیں کہ ایسی تاریخی باتوں میں ان پر کلی اعتماد کیا جائے، انھوں نے نہ صرف بہت سے حقائق مسخ کیے ہیں بلکہ اقبال کے فکر و فلسفہ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ چنانچہ بہت سے ماہرین اقبالیات نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی جن میں آغا شورش کشمیری مرحوم بھی شامل ہیں۔ فکر اقبال کے علاوہ جنھوں نے خلیفہ صاحب مرحوم کا ایک اور کتابچہ "اقبال اور ملّا" ملاحظہ کیا ہو وہ بھی ہماری رائے کی تائید کرے گا۔ ان کتابوں میں تحقیقی خلش کے بجائے سیاسی تپش نظر آتی ہے۔ مشہور ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی افتاد طبع کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تحریروں کا افراط و تفریط سے محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ (ملاحظہ ہو: مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں: ص ۱۶۷)۔ پھر یہ بات بھی صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ علامہ اقبال کے ارد گرد بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اقبال اور علمائے دیوبند میں مضبوط تعلق قائم نہیں کرنے دیتے تھے۔ ان لوگوں میں "بیرسٹر ... حضرات ہی نہیں بلکہ حید علماء ندوہ بھی داخل تھے۔

---

[۱] اقبال کا جہاد یا شرح: ص ۱۷۱-۱۷۲، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار دہلی ۱۹۷۲ء

• علامہ اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرتؒ ان کے شافی جوابات لکھتے "۔ (حیاتِ انور: ص ۲۵۱)

اسی طرح پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے اپنے ایک مضمون زیر عنوان " اے کہ تو مجموعۂ خوبی" میں علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات پر کچھ واقعات ومشاہدات درج کیے ہیں۔ مزید برآں مولانا اکبر آبادی نے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے علامہ کشمیریؒ کے نام وقتاً فوقتاً اتنے خطوط بھیجے تھے کہ اگر وہ آج محفوظ ہوتے تو جس طرح علامہ اقبال اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی باہمی مراسلت مستقل کتابی صورت میں وجود میں آئی اسی طرح علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کی خط وکتابت ایک اچھی ضخامت کی کتابی شکل میں وجود میں آسکتی مگر علامہ کشمیری کی یہ عادت تھی کہ وہ خطوط پڑھ کر انھیں چاک کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اس طرح کا ایک خط بھی نہیں ملتا ہے۔

غرض علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کا علمی تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اقبال کے بعض مکتوبات اور خطبات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ اگر ہم کہیں کہ علامہ اقبال کی مذہبی شخصیت اور دینی ذہن کی اصلاح وتعمیر میں علامہ انور شاہ کشمیری کا ہاتھ بھی تھا، بلکہ سب سے بڑھ کر تھا، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر ہم علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں ان کی ابتدائی اور آخری زندگی میں نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلب وذہن کے پیچھے کسی مردِ مومن کا اصلاحی ہاتھ کام کر رہا تھا۔

عارف عراقی ۹| علامہ انور شاہ کے تلامذہ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اسلامی فلسفہ میں زمان ومکان کی حقیقت وحیثیت سمجھنے کے لیے علامہ انور شاہ کشمیری کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس پر علامہ انور شاہؒ نے ڈاکٹر صاحب کے نام بہت سے خطوط بھیجے

بلکہ علامہ کشمیری نے عراقی کا ایک رسالہ انھیں ارسال کیا تھا۔ یہ رسالہ زمان ومکان کی حقیقت ہی سے بحث کرتا ہے اور اقبال اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے مشہور زمان انگریزی خطبات میں علامہ کشمیری کا کہیں بھی نام نظر نہیں آتا ہے مگر عراقی نام کے ایک صوفی کا کئی مقامات پر نام مذکور ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مسئلۂ زمان ومکان کی تحقیق میں عارف عراقی کی تحقیقات سے متاثر ہیں دوسری طرف علامہ کشمیری کے دو رسائل "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" اور "مرقاۃ الطارم لحدوث العالم" میں عراقی کا حوالہ ملتا ہے۔ اس طرح ماخذ کی یکسانیت سے مذکورہ بالا روایت کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

اول، یہ کہ کیا اقبال کا عراقی وہی ہے جس کا علامہ کشمیری کے رسالوں میں حوالہ ملتا ہے۔؟

دوم، یہ عراقی کون ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اگرچہ اقبال کے شارحین نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مگر خوش قسمتی سے علامہ اقبالؒ ایک خط میں اعتراف کرتے ہیں کہ عراقی کا رسالہ انھیں علامہ کشمیری نے عنایت فرمایا ہے۔ وہ مولانا سید مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شیخ اکبر نے زمان ومکان کے مسئلے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور متکلمین اسلام کی جن آراء سے اختلاف کیا ہے اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیں، کیونکہ بقول ڈاکٹر اقبال انھیں یورپ جاکر شیخ اکبر پر لیکچر دینا تھا۔ آگے اسی مکتوب میں ڈاکٹر صاحب یہ الفاظ بھی لکھتے ہیں:

"حضرات صوفیاء میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہے تو ان بزرگ کے ارشادات بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ

ومغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اس کا نام تھا فی درایۃ الزمان، جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا، میں نے رسالہ دیکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔"[1]

اس سے زیادہ تفصیل علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں بھی فرمائی - ۱۹۲۸ء میں انھیں اورنٹل کانفرنس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی فرائض سونپے گئے۔ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

"جدید ریاضیات کے اہم ترین تصوّرات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبوا الدھر لان اللہ ھو اللہ میں دھر بمعنی ٹائم time کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب سے، جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں ہیں ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے

---

[1] اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اول ص ۴۳ - ۴۴ : اس خط میں علامہ اقبالؒ مولانا مہر علی شاہ کو یہ بھی لکھتے ہیں:

"اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے" مگر اسی مضمون کا ایک اور خط علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی بھیج دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس خط کی تاریخ بھی وہی ہے جو مہر علی شاہ صاحب کے مکتوب پر درج ہے: اقبال نامہ ص ۱۶۴ - ۱۶۵ - علامہ ندوی نے انھیں اس موضوع پر دو رسالے بھیجے تھے ایک مولانا برکات احمد ٹونکی کا اتقان فی ماھیۃ الزمان اور دوسرا مولانا نور الاسلام کا "تحقیق المکان" مگر یہ دونوں رسالے علامہ اقبال کے لیے غیر تسلی بخش ثابت ہوئے تھے۔

مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر مجھے اس کی نقل ارسال کی۔[۱]

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو یہاں عراقی کی تعیین میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال ہر دو فضلا اپنی تصانیف میں عراقی نام لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، علامہ کشمیری "کما قال العارف العراقی" فرماتے ہیں[۲] جب کہ

---

[۱] علامہ اقبال کا یہ خطبہ انگریزی زبان میں زیرِ عنوان A Plea for Deeper Study of the Muslim Scientists. اسے بعد میں جناب اسرائیل احمد خان صاحب (بی۔ اے۔ جامعہ) نے اردو میں منتقل کر کے رسالہ "صوفی" منڈی بہاء الدین پنجاب بابت مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اب یہ علمی مضمون نایاب ہو گیا تھا اور حال ہی میں اسے جناب عبد الغفار صاحب شکیل نے "اقبال کے نثری افکار" مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی میں دوبارہ شائع کر لیا۔ اردو میں اس کا عنوان "حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت" ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ اقبال اس حدیث مبارک سے مسحور کی حد تک متاثر تھے۔ ان کے منظوم کلام میں بھی اس حدیث پاک کی طرف اشارے ملتے ہیں، اور وہ یورپ کے سر برآوردہ فلاسفر کو بھی یہ حدیث پاک سناتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسین خان صاحب اپنے ایک قابلِ قدر مضمون "اقبال کی دو طویل نظموں کی باز آفرینی" میں لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ اقبال نے برگساں "Bergson" کو جب لاتسبوا الدہر کی حدیث شریف کا ترجمہ سنایا تو وہ اپنی پہیوں والی کرسی پر، جس پر وہ علالت کے باعث بیٹھا تھا اچھل پڑا اور پوچھنے لگا: یہ کس کا قول ہے؟"

اقبال: جامعہ کے مصنفوں کی نظر میں: مرتبہ گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۹ء: ص ۱۷۸۔

[۲] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۴۳ (حاشیہ) مطبوعہ ڈابھیل

ڈاکٹر محمد اقبال نمبر ۳۰ نام لکھتے ہیں، مولانا مہر علی صاحب کے نام علامہ اقبال کا جو مکتوب ملتا ہے اس میں رسالے کا نام فی درایۃ الزمان ہے جو ظاہر ہے عربی ذوق کے مطابق پورا نام نہیں ہے۔ البتہ محوّلہ بالا خطبۂ صدارت (لاہور) میں غایۃ الامکان فی درایۃ المکان درج ہے۔ ادھر علامہ کشمیری کے ایک مشہور شاگرد (مولانا محمد انوری لائلپوری) نے اپنے استاد اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے عراقی اور اس کے رسالے کا بھی ذکر کیا ہے بقول ان کے رسالے کا نام غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان ہے[1] اس کے علاوہ علامہ محمد انور شاہ کے شہرۂ آفاق امالی فیض الباری علیٰ صحیح البخاری میں بھی اس رسالے کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں اس کا نام التبیان فی حقیقۃ الزمان والمکان ملتا ہے اور صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ رسالہ شیخ فخر الدین عراقی نے لکھا ہے[2] فیض الباری میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی کا تذکرہ نفحات الانس میں موجود ہے[3] مگر مشکل یہ ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی نے جو بلا شبہ اسلامی تصوف کی تاریخ میں ممتاز صوفی اور شاعر گزرے ہیں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں لکھا ہے۔ نفحات الانس میں شیخ فخر الدین ابراہیم المشتہر بالعراقی کا تذکرہ چار صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ان کی تصانیف میں صرف لمعات اور دیوان شعر کا ذکر ہے[4] مولانا شبیر احمد خاں غوری نے اپنے ایک مضمون میں اس رسالے کو میر سید علی ہمدانی کی تصانیف میں گنا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سید علی ہمدانی کی تصانیف میں غایۃ المکان فی درایۃ الزمان

---

[1] انوار انوری؛ بحوالہ حیاتِ انور۔

[2] فیض الباری علیٰ صحیح البخاری: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ج ۲ ص ۲۷۰۔ [3] ایضاً۔

[4] نفحات الانس من حضرات القدس: مولانا عبد الرحمن جامی، کتاب فروشی سعدی طہران ص ۶۰۱۔

بھی ہے جس میں انھوں نے زمان اور مکان کا ایک نرالا تصور پیش کیا ہے۔
اس تصور کو علامہ اقبال نے الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیل جدید میں عراقی کی طرف
منسوب کیا ہے۔[۵]"

مگر جہاں تک میر سید علی ہمدانی کی تصانیف کا تعلق ہے بلاشبہ ان کی ساری کتابیں آج موجود نہیں ہیں مگر ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی جن تصانیف کا نام محفوظ رکھا ہے جن کی تعداد چالیس سے تجاوز کرتی ہے ان میں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں ملتا ہے۔ میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا چرچا ہند اور ہمدان سے زیادہ کشمیر میں رہا ہے، مگر یہاں کے تذکرہ نگاروں نے بھی اس رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ گزشتہ سطور کی روشنی میں رسالے کا صحیح نام غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان نظر آتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی رسالہ ہو جس کا مصنف مشتبہ ہے اور عموماً شیخ تاج الدین بتلائے جاتے ہیں۔

ایران کے محقق محمد تقی دانش پژوہ نے شیخ روزبہان بقلی (جو شیخ نجم الدین کبریٰ رح کے شیخ طریقت تھے) کے معاصرین میں ابوالرضی صدرالدین محمد فیلسوف واعظ کو بھی گنا ہے۔ شیخ تاج الدین انہی امام ابو رضی کے والد بزرگوار تھے۔ امام ابو رضی بڑے فلسفی عالم تھے۔ اسی فلسفہ دانی کے جرم میں اتابک ابوبکر سعد بن زنگی (۶۲۳ھ — ۶۵۸ھ) نے انھیں شیراز سے بدر کیا تھا۔ ان کے والد شیخ تاج الدین بھی بلند مرتبہ عالم اور فلسفی تھے اور انھوں نے ہی غایۃ الامکان فی درایۃ الزّمان والمکان نام کا رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں طہران سے شائع ہوا ہے۔ اس زمانے میں علامہ محمد انور شاہ دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے اور ۱۳۲۰ھ تک کشمیر سے باہر دیوبند اور دہلی میں حصولِ علم اور خدمتِ علم میں منہمک تھے، اور وہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ معقولات کی کتابوں کا بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ

---

[۵] مجلہ علوم الاسلامیہ: علی گڑھ؛ جون — دسمبر ۱۹۶۹ء: ص ۸۱۔

کرتے تھے اور نادر قلمی کتابوں کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے[۵] غرض یہی رسالہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ہاتھ آیا تھا اور بعد میں علامہ اقبال سے تعلقات قائم ہونے پر انھیں اس کی نقل بھیج دی تھی۔

اگرچہ رسالہ شیخ تاج الدین ہی کے نام پر چھپ چکا ہے مگر بعض اہلِ علم اسے شیخ تاج الدین کے استاد ابو ثابت شمس الدین محمد بن عبدالملک دیلمی اور بعض محمود شبستری کی طرف منسوب کرتے ہیں[۶]

(باقی آئندہ)

---

۵ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی زمانے میں علامہ کشمیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک اور رسالہ حاصل کیا تھا جس کا تعلق "اسطرلاب" کے اعمال اور وظائف سے ہے۔ مولانا بنوریؒ نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے بھی معقولات کی کتابوں کے ساتھ علامہ انور شاہؒ کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیکھیے

بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب : مولانا بنوری

طبع اول قاہرہ ۱۹۳۹ء : ص ۴۴

۶ روز بہان نامہ: انتشارات انجمن آثار ملی ۱۳۴۷ھ: ص ۱۵ = اب جب کہ میں یہ سطور ختم کرنے کے قریب تھا کہ "نقوش" لاہور کے اقبال نمبر" ۱۹۷۷ء میں جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی کا محققانہ مضمون "اقبال اور عراقی" نظر سے گزرا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ خلاصۂ بحث میں ہم متفق ہیں۔ مولانا عرشی نے بعد میں اسی مضمون کے عنوان کو زیادہ مناسب بنا کر سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں بھی شائع فرمایا۔ دیکھیے "تصورِ زمان و مکان کے متعلق اقبال کے ایک ماخذ کی تعیین"

بابت اکتوبر ۱۹۷۷ء

افلاطون، عینیت اور اقبال

ح۔ عامر ریسرچ اسکالر شعبۂ فلسفہ علی گڈھ یونیورسٹی

(قسط دوم)

افلاطون تجربے کی دنیا سے اوپر اٹھ کر ایک "غیر متغیر" نقطے پہ جا پہنچا ہے۔ جہاں عام تصورکی دنیا آباد ہے۔ ہم ایک چیز کو دیکھتے ہیں مثلاً مچھلی۔ دنیا میں جتنی مچھلیاں ہیں ان کا ایک تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ایسے ہی تمام اشیاء کے متعلق۔ ہم تصورات سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اُن کے متعلق باتیں ہوتی ہیں لیکن بجائے خود ان تصورات کا وجود کہاں ہے ہم دکھانے سے قاصر ہیں۔ کیا ہم عام اشیاء کے متعلق ایسا سوچتے ہیں ؟ —— اور سوچا بھی نہیں جا سکتا —— کیونکہ قدم قدم پہ وقت اور تبدیلی کا احساس پھنکارتے ہوئے ناگ کی طرح موجود ہے۔ افلاطون عقل کے سہارے ان "تصورات" تک جا پہنچتا ہے۔ کیونکہ یہ عقل کی ہی تخلیق ہیں۔ یہ تصورات تبدیلی change اور وقت Time سے ماوراء ہیں اور ایک خاص دنیا میں ہیں۔ یہ تصورات نہ صرف عام چیزوں بلکہ علم تک کے تخلیق کار ہیں۔ اس دنیا میں قدم قدم پہ تبدیلی اور اس دنیا (تصورات) میں سکون اور ٹھہراؤ، نظریۂ اعیان کو سمجھنے کے لیے لائبنز اور برکلے کی آراء کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ لائبنز کا اگرچہ کم و بیش وہی نقطۂ نگاہ ہے جو افلاطون کا ہے لیکن برکلے ان دونوں سے الگ اپنی راہ تعین کرتا ہے۔

برکلے کا خیال ہے کہ کسی بھی شے کا وجود ذہن سے باہر نہیں۔ لیکن ایک نکتہ یہاں ذرا اہم ہے، برکلے پھر بھی اپنے آپ کو 'عینی' نہیں بلکہ 'غیر مادی' کہتا ہے۔ اور مادہ کا انکار اس کے ہاں صرف اس لیے ہے کہ "تصور اور ذہن" کو اصل تصور کیا جائے۔" اور تمام چیزیں ان کیفیات کی ایک زنجیر سی ہے جو ہمارے ذہن میں ایک ایسی وجہ سے جنم لیتی ہے جو سراسر غیر مادی ہے[1]" یہ شے کیا ہے۔ یہ خدا کا تصور ہے۔

افلاطون نے تصور کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے سقراط کے Dialectical method کا استعمال کیا ہے جو بحث برائے بحث نہیں بلکہ عام 'حس' سے اوپر اٹھ کر شے کے تصور کو پاتا / پایا / پاتا ہے[2]

افلاطون نے نظریۂ اعیان کو واضح کرنے کے لیے تاریک گپھا کی تمثیل کا بہترین استعمال کیا ہے۔ اس تاریک غار میں کچھ آدمی رسیوں سے بندھے پڑے سامنے دیوار پر لگے پردے پر ابھرتی ہوئی پرچھائیوں کو حقیقت سمجھتے ہیں، جو غار کے دہانے پہ جلائی ہوئی آگ سے منعکس ہوتی ہیں، ابھرتی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک آدمی باہر آ جائے، یہاں کے ماحول سے مطابقت پیدا کر کے اشیاء کو دیکھے (اور آخر میں سورج کو) تو اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا کا تصور آئے گا۔ افلاطون نے اچھائی (good) کو تصورات کی زنجیر کی آخری کڑی کے طور پہ لیا ہے جو سب سے اعلیٰ علم بھی ہے اور خوبصورتی کے مماثل بھی —

ہیگل کا Dialectical method ایک نیا موڑ ہے۔ اس کا خیال ہے

"The human mind is but one Particular aspect of a cosmic process, a world Embracing system which has a logical and rational

---

۵ Ibid (حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

Structure, in its own right." [1] ہیگل اگرچہ مادہ کے وجود کا منکر نہیں۔ لیکن اسے روح کے مقابلے میں کمتر تصور کرتے ہوئے حدود میں مقید کر دیتا ہے۔

آگہی ذات ہیگل کے ہاں تمام حدود کی تخلیق کرتا ہے۔ ہیگل کے خیال میں یہ دنیا غیر محدود آگہی ذات کی طرف ارتقاء پذیر ہے جسے وہ حقیقت اولیٰ قرار دیتا ہے۔

افلاطون نے نظریۂ اعیان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر ایک تصور کا اپنا ایک نقطہ بنتا ہے، اور وہاں پہ وہ ایک سچا اور غیر فانی وجود بن جاتا ہے۔

فلسفۂ عینیت فطرت پرستی Naturalism اور وجودیت یا شیئیت پسندی Realism دونوں کا رد ہے۔ فطرت پرستوں کا خیال ہے کہ ذہنی اور روحانی قدریں مادہ کے حدود میں سمٹی ہوئی ہیں یعنی وہیں سے ابھری ہیں اور وہیں پہنچ کے یہ ختم ہو جاتی ہیں۔ شیئیت پسندوں کا خیال ہے کہ اشیاء بجائے خود اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہیں۔ چاہے ہم انھیں دیکھیں "Perciеve" یا نہ دیکھیں۔ اور فلسفۂ عینیت ان دونوں کو رد کرتے ہوئے اس رائے کا حامل ہے کہ "Mind and Spirituale Values are fundamental in the world as whole" یعنی فلسفۂ روح کو اور فلسفۂ مادیت، مادہ کو بنیادی حقیقت "world as whole" تصور کرتا ہے۔ اسی بنا پر اشتراکی مفکرین کا خیال ہے کہ فلسفہ کے دو ہی اسکول ہیں ۱۔ عینی ۲۔ مادی۔

ہر بڑے مفکر نے اپنے سماج کو متاثر کیا اور کرتا ہے۔ سماج میں موجود تصورات 'Existing' کو تبدیل کرنے میں ہی نہیں بلکہ ان کی تشکیل نو reconstruction

---

[1] (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) Greek thought. A Hist. of Muslim phil M. M. Sharif 93.94

[2] J. G. Brenan.

میں بھی اسے خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سماج اور مفکر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ علم انسانی کبھی بھی تنہائی (Solitude) کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انسان کا بحیثیت انسان، ایک دوسرے کو سمجھنا، سماج اور سماجی میل ملاپ، ماحول اور حالات، علم کو جنم دیتے ہیں۔ اگر ہم ایک مفکر کو اس کے سماجی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی اور فکری پس منظر سے الگ کریں تو اس کے تصورات واحساسات کو سمجھنا درکنار، محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ ہر ایک مفکر کے تصورات واحساسات کو اس کے دور کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی رکھنا ضروری ہے کہ اس کے پیش روؤں کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ کہنا بے معنی سی بات ہو گی کہ کوئی بھی مفکر absolutely original ہے کیونکہ

"No thinker can be said to be absolutely original, he is bound to construct his own system on the basis of what his Predecessors might have done or attempted to have done.[1]"

اقبال نے مشرقی اور مغربی فکر کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی فکر کا ڈھانچہ ترتیب دیا۔ اس کی فکر میں کئی نقوش ہیں۔ وہ یک رنگ نہیں۔ اس کی فکر کو کسی خاص ازم کے ڈھانچے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔

"You could call him a spiritaalist, because he held the spirit to be the basic reality or

---

[1] A Study in Iqbals Philosophy. B.A. DAR.

you could call him an Idealist. with greater definiteness one could hold him to be a creative evolutionist. As a stonch believer in a Personal god, he was also a theist. Believing that all existence is Constituted of ego's or Selves one could class him with Rumi and Bergson as a monadologist:" [1]

اس کی فکر میں کئی مختلف تصورات کا سنگم ہے۔ اس کی فکر کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ جاننا ذرا بھی مشکل نہیں — مثلاً: اس کی فکر میں 'وقت' بھی ہے اور 'خودی' بھی، 'عشق' بھی ہے اور 'عقل' بھی۔ 'انا' بھی ہے، اور 'انائے مطلق' بھی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

"Iqbal Succeeded in removing the fragmantriness of differient systems of thought and beliefs, dissolving the half-truths into the ~~unity~~ one great truth" [2]

مختلف اور منتشر اجزائے فکر کو یکجا کرنے کا ایک خاص مقصد علامہ اقبال کے ذہن میں یہ تھا کہ پریشان حال مسلمان اور منتشر اسلامی قوتوں کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل رکھ سکیں جو ایک تو انھیں راس آئے، ان کے حالات سے مطابقت پیدا کرے اور اس گول کی طرف ان میں حرکت پیدا کرے (جو اقبال کے ذہن میں تھا)

Renaissonce in indo Pakistan (cont)
Iqbal, Khalifa Abdul Hakim.

اقبال کا انداز فکر حرکی ہے، جمود کے نشانات کا دور دور تک اس میں کہیں پتہ ہی نہیں ملتا۔ اس نے مختلف تصورات کو لے کر اسی نقطۂ نگاہ سے ان کی تشکیل نو کی۔ اقبال کا نثری شاہکار "Reconstruction of Religions thought in Islam" اس بات پہ گواہ ہے کہ اقبال بدلتے ہوئے حالات میں (زمانۂ جدید) مسلمان کو اس جگہ دیکھنے کا متمنی ہے جہاں اس کے ہاتھ میں دنیا کی تقدیر ہو۔ یعنی وہ اسے ایک فعال قوت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایس کا ظاہری اور داخلی نتیجہ (دونوں صورتوں میں) یہی ہے کہ اس نے چند تصورات کو بہت اہمیت دی۔ مثلاً حقیقت اور وقت کا خلاقی تصورانہ، انسانی خودی، انا، انائے مطلق، آزادی، عشق وغیرہ۔ اس کی فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں انہی افکار نے نشو ونما پائی۔ فکر اقبال میں تبدیلی اور وقت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی فکر کے یہ دو جز سمجھنے میں اگر ذرا سی چوک ہو جائے تو عمارت کا نقشہ ہی عجیب وغریب ہو گا۔ اقبال نے ان فلاسفہ کی شدید تنقید کی جو وقت کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ اس نے افلاطون کے فلسفہ اعیان پہ (جو بنیادی حقیقت بن جاتے ہیں) اس لیے تنقید کی کہ وہ جمود اور ٹھہراؤ کی نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے۔ افلاطون تصور کو ایک ایسی شے مانتا ہے جو تبدیل نہ ہو، جس میں تغیر نہ ہو، بلکہ ٹھہراؤ اور جمود ہو، اس دنیا کی تمام چیزیں ان تصورات کی مبہم پرچھائیاں ہیں۔

دنیا کی ہر شے میں "مکمل ہونے" کا جذبہ ہے۔ ہر شے چاہتی ہے کہ وہ مکمل بنے اور یہی جذبہ تبدیلی کی بنیادی وجہ ہے۔ اور تبدیلی کا احساس وقت سے الگ ہو ہی نہیں سکتا۔ جہاں تبدیلی change ہے وہاں وقت Time بھی ہے۔ اس مقام پہ چیزیں ثانوی حیثیت میں رہ جاتی ہیں، نہ کہ بنیادی۔ صرف وہی چیزیں حقیقی real ہیں جو تبدیل نہ ہوں اس لیے افلاطون کا خیال ہے کہ "تصوراتی جہان" میں تبدیلی

نہیں۔ تصورات وقت میں مقید نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ حقیقی نہ ہوتے۔ اس لیے افلاطون وقت اور تبدیلی دونوں کی نفی کرتا ہے۔

اسرارِ خودی اور دوسری کتابوں میں اقبال نے افلاطون کو خلافِ حقیقت اور خلافِ اسلام قرار دیا ہے۔ وہ اسے "بے حرکت" اور "مردہ" ہی قرار نہیں دیتے، بلکہ "انسانیت کو گمراہ کرنے والا" کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ ۵

بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ اُو وارفتۂ محروم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

افلاطونی عینیت، حقیقت کو وہم اور خیال کو حقیقت بنا دیتی ہے۔ ۵

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت حکمتِ او بود را نابود گفت
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم در کہستانِ وجود افگندہ سُم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد اعتبار از دست و چشم و گوش برد

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اس بات کی سعی کی ہے کہ افلاطونی فلسفہ کو 'مردہ'، انسانیت کو گمراہ کرنے والا اور خلافِ اسلام نہ سمجھا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ افلاطون کا نظریۂ اعیان غیر اسلامی نہیں۔

" اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ ظاہر ہے کہ امرِ کن کی مخاطب شے ہے تو کیا شے خارج میں موجود تھی؟ اور اس کو "ہو جا" سے خطاب کیا گیا۔ موجود شے کو موجود ہو جاتا کہنا کیا معنی ہے، تحصیل حاصل ہے تو پھر کیا شے معلوم تھی لیکن معلوم محض مخاطب کیسے بن سکتی ہے۔ اس وجہ سے معلوم ہوا کہ شے نہ موجود تھی اور نہ معدوم، تو پھر خطاب کس کو ہوا تھا۔ مخاطب کون تھا؟ اس گتھی کا حل صاف ہے۔ وہ شے جس کو ارادہ الٰہی خارجاً موجود کرنا چاہتا ہے، جو امرِ کن کی مخاطب ہے وہ شے کا تصور ہے جو حق تعالیٰ کے علم میں پایا جاتا ہے۔ جو اس طرح علماً ثابت ہے بوجود ذہنی یا علمی اور خارجاً موجود ہے بوجود واقعی۔"

اوراس آیت کو تائید میں پیش کرتے ہیں " وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا۔ ہر شے قبل تخلیق اللہ تعالیٰ کی معلوم ہے، ان کا تصور ہے بالفاظ دیگر اس کا ثبوت علمی ذات حق میں محقق ہے بصور علمیہ حق میں اور یہی مرتبہ علم (باطن) ہے مرتبہ عین (ظاہر) میں آنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جب امر کن سے اپنی اقتضا کے مطابق ظاہر ہوتی ہے تو مخلوق کہلاتی ہے " ۱۲

لیکن ڈاکٹر میر ولی الدین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اقبال پہلے ہی اس قسم کی عینیت کو رد کر چکے ہیں کیونکہ یہ انسان کو کاہل، خوابوں کی دنیا میں رہنے والا، اور حرکت سے دور کر دیتا ہے۔ اقبال حرکت اور تبدیلی میں یقین رکھتے ہیں۔ خواب اور کاہلیت میں نہیں۔ اس کے لیے زندگی ایک حقیقت ہے جو ہر لحظہ نئی شان اور آن لیے ہوتی ہے۔ زندگی اقبال کے لیے انقلابات اور تبدیلی کا نام ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں تڑپ اور حرکت ہے، اور ٹھہراؤ کا دور تک نام نہیں ہے۔

دمادم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے میں پیدا دم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

اقبال افلاطون اور یونانی تہذیب کو یک لحظہ رد کرنے اور اسلامی تہذیب کو اس سے قطعاً مختلف تصور کرنے کے بعد بھی اس حسن سے آنکھیں نہیں چراتے، اس سچائی سے انکار نہیں کرتے جو افلاطون اور یونانی تہذیب میں ہے۔

زمانے با ارسطو آشنا باش دمے با ساز بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقام شان گذر کن مشو گم اندریں منزل سفر کن

میر ولی الدین — اقبال کے فلسفۂ خودی کے مقدمات، عالم اور معلوم ص ۱۲۰؛
Iqbal review Lahore.

التقریظ والانتقاد

تاریخ مشائخ چشت جلد اول از پروفیسر خلیق احمد نظامی، تقطیع متوسط، ضخامت ۵۱۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت مجلد 120/- روپے، پتہ: ادارہ ادبیات، بلیماران، دہلی - ۶ -

پروفیسر خلیق احمد نظامی بین الاقوامی شہرت کے مؤرخ اور مصنف ہیں اور خاص طور پر برصغیر میں اسلامی تصوف کی تاریخ پر سند تسلیم کیے جاتے ہیں، موصوف نے تاریخ مشائخ چشت پر ایک ضخیم جلد اب سے کم و بیش ایک ربع صدی پہلے مرتب کی تھی جو اسی زمانہ میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے بڑی آب و تاب اور اہتمام سے شائع ہوئی تھی اور اگرچہ یہ مصنف کا نقش اول تھی تاہم اس کے شائع ہوتے ہی ارباب علم وتحقیق کے حلقوں میں دھوم مچ گئی اس کتاب میں وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ سلسلہ تاریخ مشائخ چشت کی پہلی جلد ہے اس کے بعد ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کی پانچ جلدیں اور آئیں گی، لیکن ایک چوتھائی صدی کی طویل مدت گزر گئی، ارباب ذوق اضطراب شوق سے ایفائے عہد کا انتظار کرتے رہے مگر بے سود اور لاحاصل! اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ فاضل مصنف بڑی تیز رفتاری سے اپنے عہدہ و منصب میں ترقی کرتے رہے اور اس لیے درس و تدریس کے ساتھ بعض سخت اور نازک قسم کی انتظامی ذمہ داریوں کا بارگراں بھی ان کے سر پر آپڑا، اسکے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان شدید مصروفیتوں میں بھی، ضبط اوقات کے باعث وہ مطالعہ

اور تصنیف و تالیف سے بے تعلق نہیں رہے لیکن اب اُن کے اشہب قلم نے اپنی جولانی کے لیے قرون وسطیٰ کی تاریخ و سیاست کا ایک اور میدان منتخب کرلیا چنانچہ اس وقفہ میں ان کے قلم سے متعدد اہم اور وقیع کتابیں اور مقالات انگریزی میں شائع ہوئے، بایں ہمہ خوشی کی بات ہے کہ تاریخ مشائخ چشت کا جو پروجیکٹ انھوں نے بنایا تھا اس عالم میں بھی وہ اس سے غافل نہیں رہے، اس سلسلہ میں ان کا مطالعہ برابر جاری رہا اور وہ ترتیب و جمع مواد کا کام دل کی لگن اور پابندی سے کرتے رہے، آخر وہ وقت آگیا کہ وہ یہ کہہ سکیں

عمر یست کہ آوازۂ منصور کہن گشت
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

اب انھوں نے اپنے قدیم منصوبہ پر بھی نظر ثانی کی اور فیصلہ یہ کیا کہ پوری تاریخ سات جلدوں میں مرتب کی جائے، جن میں سے پہلی جلد بطور مقدمہ کے صرف "تاریخ تصوف اسلام پر اجمالی نظر" کے لیے مخصوص ہو اور باقی پانچ جلدوں میں ترتیب زمانی کے اعتبار سے حضرت خواجہ غریب نواز سے لے کر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تک کے بزرگان و مشائخ عظام کے مفصل حالات لکھے جائیں، اور آخر میں ساتویں جلد چشتیہ سلسلہ کے لٹریچر کا جائزہ لینے کے لیے وقف ہو، چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے اور جیسا کہ فاضل مصنف نے دیباچہ میں بتایا ہے، باقی جلدوں کا تمام مواد موجود ہے اور بعض جلدوں کی ترتیب بھی ہو چکی ہے، اس لیے امید ہے کہ اب یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوگا۔

یہ کتاب اولاً پانچ حصوں پر تقسیم ہے، پھر ہر حصہ کے ماتحت متعدد ابواب ہیں، حصۂ اول کا عنوان "مقصد اور منہاج" ہے، اس میں چھ ابواب ہیں جن میں مجموعی طور پر تصوف کی حقیقت اور اس کی ضرورت و اہمیت پر گفتگو کرنے کے بعد لفظ صوفی کی تحقیق

تصوف کے ماخذ، تصوف کتاب وسنت کی روشنی میں، صوفیہ کا مقصد حیات اور صوفیہ اور تعلیم اخلاق، ان پر الگ الگ باب وار اس درجہ محققانہ اور ساتھ ہی نہایت مؤثر و دلنشین کلام کیا گیا ہے کہ دل پر بیساختہ زاری و تضرع کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور اسلامی تصوف کی بالکل صحیح عکاسی کے ساتھ ان اعتراضات کی بھی قطعی تردید ہو جاتی ہے، جو تصوف پر مستشرقین یا منکرین تصوف نے کیے ہیں، حصہ دوم جو چار ابواب پر مشتمل ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ تصوف اسلام کا ایک جزء ہے اور اس لیے جب سے اسلام ہے تصوف بھی ہے لیکن باضابطہ بحیثیت ایک مکتبۂ فکر کے تصوف کی تدوین کن اسباب و وجوہ کے ماتحت ہوئی، پھر اس کا ارتقاء کیوں کر ہوا، اس سلسلہ میں صوفیہ کے جو طبقات بنے ان میں نامی گرامی اکابر صوفیہ کون تھے اور طبقہ وار ان کی خصوصیات کیا تھیں، یہ بحث بھی بڑی بصیرت افروز اور فاضل مصنف کی وسعت و دقت نظر کی دلیل ہے، اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ایک تاریخ تصوف کے مصنف کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ فقہا اور صوفیہ میں اختلافات کن وجوہ سے پیدا ہوئے، اور اس سلسلہ میں دونوں طرف سے جو کتابیں لکھی گئیں ان کی نوعیت کیا تھی؟ پھر امام غزالی نے دونوں میں مصالحت کس طرح کرائی، عجمی اثرات نے کیا کیا گل کھلائے اور اکابر صوفیہ نے ان کا تدارک کس طرح کیا، پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تصوف کا ٹکنک کیا ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً کیا کیا تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے، ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ تاریخ مشائخ چشت کی باقی جلدوں میں اصلاً یا ضمناً ان مباحث پر جستہ جستہ گفتگو آئے گی، لیکن پروفیسر نظامی نے اس جلد میں ان مباحث کو قصداً نظر انداز اس لیے کر دیا ہے کہ ان کا اصل مقصد مشائخ چشت کی تاریخ لکھنا اور اس جلد میں بطور پس منظر کے تصوف کے نشو و نما اور اس کے عہد بعہد ارتقاء کا محض اجمالی طور پر ایک جائزہ لینا ہے، جیسا کہ دیباچہ میں انھوں نے اس کا ذکر کیا بھی ہے، چنانچہ ان دو حصوں کے بعد وہ چشتیہ سلسلہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

در باقی تین حصے اسی سلسلہ کے مباحث و مسائل کے لیے وقف ہیں، حصہ سوئم میں چشتیہ سلسلہ کا نشو و نما، عہد بعہد اس کا ارتقا۔ اس سلسلہ کے اکابر متقدمین مشائخ، ہندوستان میں اس کا اجرا، اس کی مختلف شاخیں، اور ان کی خانقاہیں، پھر اس سلسلہ کا زوال، یہ پوری داستان بسط و تفصیل سے بیان کی گئی ہے، حصہ چہارم اور حصہ پنجم ہمارے نزدیک اس کتاب کی جان ہیں اور اس لیے نہایت اہم ہیں کیونکہ اول الذکر میں مشائخ چشت کے نظام اصلاح و تربیت اور مؤخر الذکر حصہ میں چشتیہ سلسلہ کی اساسِ فکر پر بڑی جامع اور دیدہ ورانہ بحث کی گئی ہے، اور اس طرح گویا اسلامی تصوف کے حقیقی خدو خال (مشائخ چشت کے نقطۂ نظر سے) ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس میں کون سی بات قرآن و سنت اور اسوۂ رسول سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی نہیں مثلاً صلوٰۃ معکوس پڑھنا اور پھر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا سرتاسر لغو اور شریعت پر بہتان ہے، اسی طرح وحدت الوجود کا عقیدہ متکلم فیہ ہے، آخر میں مآخذ کی طویل فہرست اور اشاریہ ہیں، کتاب میں بعض ایسی چیزیں نظر سے گزریں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان سے استفادہ کیا جا سکے، وہ چیزیں یہ ہیں:

(۱) صفحہ ۱۰۲ پر جن صوفیا کے نام آئے ہیں ان میں سے بعض کے نام کے ساتھ تاریخ وفات لکھی ہے اور بعض کے ساتھ نہیں۔

ایسا دوسرے صفحات پر بھی ہے، پھر تاریخ میں یکسانیت نہیں ہے، کہیں تاریخ ہجری اور عیسوی دونوں ہیں، کہیں فقط ہجری اور کہیں صرف عیسوی۔ یہی حال حوالوں کا ہے، بعض مقامات پر حوالے مکمل نہیں ہیں، مثلاً صفحہ ۹۸ سطر ۸ میں صرف اصابۃ کا نام لینا کافی نہیں ہے، اسی طرح جو روایت حدیث کی عام متداول کتابوں میں موجود ہے اس کو سیرت النبی شبلی کے حوالہ سے نقل کرنا کتاب کا علمی وقار کم کر دیتا ہے۔

(۲) صفحہ ۱۰۴ پر حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد اور حضرت سفیان ثوری کی تفسیر قرآن کا ذکر ہے، ساتھ ہی یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ ان دونوں کتابوں کو علی الترتیب مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی اڈیٹ کرکے شائع کرچکے ہیں۔

(۳) صفحہ ۱۱۱ سطر ۸: امام احمد بن حنبل کی قید سے رہائی کی تاریخ ۲۲۴ھ لکھی ہے، غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ اگرچہ امام عالی مقام پر جور و ستم کرنے کا سلسلہ ۲۳۲ھ تک رہا جب کہ واثق باللہ کا انتقال ہوا ہے، لیکن وہ قید میں ڈیڑھ دو برس سے زیادہ نہیں رہے؛

(۴) ص ۱۰۵ س ۱۹: صحیح لفظ اجحفنا ہے نہ کہ اجحفنا، یہ بھی کتابت کی غلطی ہے، پھر اس لفظ کا صحیح ترجمہ ہوگا: ہم نے کنگال بنادیا ہے؛

(۵) ص ۲۰۷ س ۱۱: "اتلفا" کے بعد "فی" سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔

(۶) قرآن مجید کی آیات کا حوالہ دینے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا،

(۷) ص ۱۰۲ س ۱۷: حضرت ربیع بن خیثم عہد تابعین کے نہایت بلند مرتبہ صوفی ہیں، ان کے والد کا نام غلطی سے "خیثام" لکھا گیا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا کوتاہیاں معمولی قسم کی ہیں لیکن پروفیسر نظامی کی کتاب اور وہ بھی اس درجہ اہم اور بلند پایہ! اس کے صاف و شفاف چہرہ پر یہ چھائیاں بری لگتی ہیں۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا یہ کارنامہ علمی و تحقیقی اعتبار سے اور اخلاقی اور سماجی حیثیت سے بھی نہایت شاندار اور لائق صد تحسین و آفرین ہے، علمی اور تحقیقی اعتبار سے اس لیے کہ تصوف سے متعلق بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو اور اس موضوع پر قدیم و جدید، مطبوعہ و غیر مطبوعہ کوئی ماخذ ایسا نہیں ہے جس سے انھوں نے سیر حاصل استفادہ نہ کیا ہو، پھر سب سے

بڑی بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ نگارش دلآویز و دلکش ہونے کے ساتھ معروضی اور سائنٹفک بھی ہے، صوفیہ کے قدیم تذکروں کی طرح خوابوں اور کشف و کرامات کی کھتونی نہیں، اس بنا پر فلسفہ اور سائنس کا ایک طالب علم بھی اسے پڑھے گا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا، اور اس کارنامہ کی اخلاقی اور سماجی افادیت اور اہمیت یہ ہے کہ یہ جن مردانِ حق شناس و حق آگاہ کی داستانِ حیات ہے درحقیقت یہی وہ نفوسِ قدسیہ تھے جنھوں نے جلوہ زارِ نورِ محمدی کی تابانیوں کو اپنے سینوں میں جذب کیا اور پھر اپنے نَفَسِ گرم کی ضیاء باریوں سے ظلمت کدۂ قلب و روح کو چراغاں زارِ امید و آرزو بنادیا، اس بنا پر اس کتاب کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم ہر شخص کے لیے اصلاحِ نفس اور اخلاقی تربیت و تعلیم کا ذریعہ ہوگا۔ (ایڈیٹر)

امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق:

تالیف: سید حسین قادری شوکتؔ ایم۔ اے، عثمانیہ یونیورسٹی۔

مشہور و معروف محقق اور صوفی و فلسفی حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی شخصیت نہ صرف مسلمانوں اور ایشیا میں بلکہ غیر مسلموں اور یورپ میں بھی مسلم ہے۔ زیر نظر تالیف اپنے مضامین و مباحث کی جامعیت اور حسنِ ترتیب اور عام معلومات کے اعتبار سے ایک بہترین کتاب ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنے زمانے کے علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی حالات کا جس گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کتاب کے پہلے حصہ میں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے فلسفۂ مذہب پر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے اور تیسرے حصے میں فلسفۂ اخلاق پر چوتھے حصے میں ان کے فلسفۂ مذہب و اخلاق پر ایک جامع اور بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ صفحات ۵۰۰ تقطیع متوسط ۲۰×۲۶ قیمت سلہ ۲۵ روپے مجلد -/۲۹ روپے

تبصرے

مقدمات وبیانات اکابر از مولانا عبدالرشید ارشد، تقطیع متوسط، ضخامت ۳۴۶۔ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد -/25، پتہ: مکتبۂ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور۔

تحریک خلافت و آزادئ وطن کے زمانہ کا مشہور مقدمۂ کراچی (۱۹۲۱ء) جس میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی، شوکت علی اور تین اور مسلمان لیڈر، حکومتِ وقت کی افواج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں ماخوذ تھے اور جس میں ان حضرات کو دو دو برس قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی، اس مقدمہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی نے جو نہایت اہم اور ولولہ انگیز طویل اور مفصل بیانات دیے تھے اور اسی طرح ۱۹۲۲ء میں حکومتِ وقت کے خلاف نفرت وعداوت پھیلانے کے جرم میں جب مولانا ابوالکلام آزاد پر کلکتہ کی چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس میں مولانا نے اپنا ایک طویل تحریری بیان "قول فیصل" کے نام سے داخل عدالت کیا تھا، درحقیقت یہ تینوں بیانات برصغیر کی جنگ آزادی کی تاریخ خوں چکاں کے وہ روشن وتابناک ابواب ہیں جن کی تابانی مرورِ ایام سے کم نہیں ہوسکتی۔ یہ بیانات تاریخ عالم میں انسانی حریت و آزادی، جمہوریت، شرف ومجد بنی نوع انسان اور اعلان حق وصداقت سے متعلق اسلام کی عالمگیر تعلیمات اور اس کی ابدی سچائیوں کی وہ اہم دستاویزات ہیں جن کو نہ صرف برصغیر کی آئندہ نسلیں افتخار واعتبار کی نگاہ سے

پڑھیں گی، بلکہ سقراط نے زہر کا پیالہ نوش کرتے ہوئے اور گلیلیو نے دار کا حکم سن کر جو کچھ کہا تھا اس کی طرح یہ بیانات بھی حریت انسانی کے عالمی ادب میں ضرب المثل بن کر زندہ رہیں گے، پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے حسن انشاء اور زور بیان وخطابت نے تو اس مئے دو آتشہ کو سہ آتشہ بنا دیا اور اس کی تاثیر کو دوبالا کر دیا تھا کہ پڑھتے جائیے اور جھومتے جائیے" یہ سب بیانات اور مقدمات کی تفصیلی روئداد اسی زمانہ میں اخبارات میں اور کتابی صورت میں خوب خوب شائع ہوئے تھے اور ملک میں ان کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ آوازۂ منصور، دیرینہ وکہن ہو گیا ہے نئی نسلوں میں ایمان ویقین کی حرارت پیدا کرنے کی غرض سے "حکایت دار ورسن" کو پھر سنانے کی ضرورت تھی، لائق مرتب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی اور اس کتاب میں وہ سب بیانات، مقدمات کی پوری کارروائی اور عدالتوں کے فیصلوں اور اس سلسلہ کی چند اور مفید معلومات کے ساتھ خوش سلیقگی سے شائع کر دیے ہیں، نئی نسل کو بزرگوں کے مجاہدانہ کارناموں سے باخبر کرنا اور ان کی یاد کو تازہ کرنا ملک اور قوم کی بڑی خدمت ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ لائق مرتب ایک منصوبہ کے ماتحت اس کام کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ اب تک وہ ایک ضخیم کتاب "برصغیر کے بیس علماء" اور "الرشید" کے تین ضخیم خاص نمبر "دارالعلوم دیوبند نمبر" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اور اب وہ مولانا آزاد کے الہلال کی مکمل جلدوں کو عکسی تصویر کے ذریعہ عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی ان کوششوں کو خاطر خواہ کامیابی عطا فرمائے۔

مولانا آزاد اور ان کے ناقد، از جناب ایم۔ اے شاہد، تقطیع متوسط ضخامت ۱۹۰ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۲۰/- روپے۔ پتہ: ماڈرن پبلشرز گول ایمپریس مارکیٹ، صدر کراچی۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی نہایت محترم اور باوقار شخصیت تھے، لیکن دنیا کے ہر بڑے انسان کی طرح مولانا جتنے بڑے تھے اتنے ہی وہ نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ہدفِ طعن و تشنیع بنے اور بعض مخالفوں نے تو اپنی کم ظرفی کا ثبوت اس طرح دیا کہ دہن کے ساتھ اپنی زبان بھی بگاڑ لی، مولانا پر جن اعتراضات کی بوچھار کی گئی ان کی نوعیت دو قسم کی ہے یعنی مولانا بحیثیت ایک عالم دین کے اور مولانا بحیثیت ایک سیاسی لیڈر کے، لائق مرتب نے اس کتاب میں مولانا پر ان تنقیدوں کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ خود انھوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ مولانا آزاد کے متعلق برصغیر کے اکابر علم و ادب کی مطبوعہ تحریروں اور ان کے خطوط کے اقتباسات مع حوالوں کے یکجا کر دیے ہیں۔ یہ اقتباسات گنتی میں ۳۶ ہیں جن میں سے تین ایڈیٹر برہان کے مقالات کے بھی ہیں، پھر مختلف اخبارات و رسائل نے مولانا کے دفاع اور ان پر اعتراضات کے جواب میں جو اداریے سپردِ قلم کیے تھے ان کے اقتباسات الگ ہیں، علاوہ ازیں ثناء اللہ مجاہد صاحب نے ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری سے ایک انٹرویو کی شکل میں مولانا آزاد کے خلاف سازشوں کے تاریخی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غرض کہ مولانا آزاد پر جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں یہ کتاب ایک بڑا اچھا اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

<u>کتابتِ حدیث عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں</u>، از مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت مجلد درج نہیں۔
پتہ: ادارۃ المعارف کراچی ۔ ۱۴۔

منکرینِ حدیث کا ایک بڑا استدلال یہ ہے کہ حدیث کی کتابت عہدِ نبوی سے سو ڈیڑھ سو برس کے بعد ہوئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں احادیث کو قلمبند کرنے کی ممانعت فرما دی تھی، اس مفروضہ کے جواب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مستقل موضوع بحث کی حیثیت سے عربی میں ایک بہترین

محققانہ کتاب جو ہماری نظر سے گذری ہے وہ محمد عجاج الخطیب کی "السنۃ قبل التدوین" ہے، زیر تبصرہ کتاب بھی اردو میں اسی موضوع پر ہے اور بڑی تحقیق سے شستہ و شگفتہ اور منضبط انداز تحریر میں لکھی گئی ہے، اس میں اولاً حدیث کی اہمیت، اس کی حفاظت، عربوں میں تحریر و کتابت کا رواج اور اس کے تاریخی شواہد پر گفتگو کرنے کے بعد عہد نبوت اور پھر عہد صحابہ میں کتابت کا جو کام انجام پذیر ہوا اور احادیث کے جو صحیفے اور مجموعے مرتب ہوئے ان سب کا ذکر کاتبین کے اسماء گرامی اور سنین کتابت کے ساتھ بسط و تفصیل سے مع حوالوں کے کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں منکرین حدیث کے دلائل کا جواب اور خود بعض مستشرقین کی عہد نبوی و عہد صحابہ میں کتابت حدیث سے متعلق شہادتیں بھی فراہم کی گئی ہیں، آخر میں عہد صحابہ میں جن تابعین نے حدیث کی تدوین و ترتیب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ کتاب اصل موضوع بحث پر بڑی جامع اور محققانہ کتاب ہے۔ مآخذ کی طویل فہرست جو ۶۸ کتابوں پر مشتمل ہے لائق مصنف کی محنت و کاوش اور تحقیق و تلاش کی شاہد عدل ہے۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

بینات کراچی کی اشاعت خاص تقطیع کلاں، ضخامت ۷۱۸ کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ جلد دیدہ زیب اور مضبوط، قیمت درج نہیں۔ پتہ: جامعۃ العلوم الاسلامیہ، نیو ٹاؤن۔ کراچی ۔۔۔ ۵۔

مولانا سید محمد یوسف بنوری المتوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء عصر حاضر کے نہایت بلند پایہ اور جامع العلوم والفنون شخصیت تھے۔ حدیث ان کا خاص فن تھا۔ لیکن دوسرے علوم و فنون میں بھی محققانہ بصیرت اور درک رکھتے تھے، عربی زبان کے ادیب اور شاعر تھے، عربی اور اردو میں ان کی گرانمایہ تصنیفات و تالیفات اور مقالات و مضامین کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے ان کی عبقریت فی العلم والادب کی روشن دلیلیں

ہیں۔ علم وفضل میں نابغۂ روزگار ہونے کے ساتھ سراپا جذبۂ عمل، تقویٰ و طہارت کے پیکر اور داعی الی الحق بھی تھے، اس حیثیت سے ان کا سب سے بڑا عملی کارنامہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کا قیام ہے جس کے وہ بانی اور موسس تھے اور جو اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے پاکستان کے مدارس عربیہ میں ممتاز و نمایاں مرتبہ رکھتا ہے، مولانا کی وفات کے بعد جامعہ کے ماہنامہ بینات کی یہ اشاعت خاص مولانا کی یاد میں بڑی آب و تاب اور غایت درجہ اہتمام و انتظام سے شائع کی گئی ہے، اس میں مولانا کا خاندان، تعلیم و تربیت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف۔ تحریر و تقریر۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی اداروں سے تعلق، شعر و شاعری، سفر و حضر، دعوت و تبلیغ، مکاتیب و خطوط، ذاتی اخلاق و عادات، معمولات و مشاغل، اساتذہ، علمی اسناد، علمی خدمات، آل و اولاد، ارباب علم کے تاثرات اور ان کا ماتم، غرض کہ وہ سب کچھ ہے، مولانا سے متعلق جس کی جستجو کسی کو ہو سکتی ہے، یہ نمبر مولانا سے متعلق ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے"

تیسری اسلامی چوٹی کانفرنس اور عالم اسلام سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۴۴، قیمت پندرہ روپے، پتہ: ۲۳۸۶، بلی ماران دہلی ۶

اپنے انداز اور اپنی نوعیت کا لاجواب مجموعہ جس کو "دارالعلم بلی ماران دہلی" نے دل آویز و دلکش طباعت کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع کیا ہے، اس مجموعے میں نہ صرف تیسری اسلامی چوٹی کانفرنس (مکہ و طائف) کے ولولہ انگیز حالات اور ایمان افروز قراردادیں اور اسکیمیں احتیاط اور انتہائی نفاست کے ساتھ درج کی گئی ہیں بلکہ مکہ کانفرنس ۱۹۶۴ء، اور پہلی اسلامی چوٹی کانفرنس (رباط) اور دوسری اسلامی چوٹی کانفرنس (لاہور) کے ضروری حالات و کوائف بھی سلیقے سے یکجا کیے گئے ہیں، مجموعے کا آخری باب "عالم اسلام ایک نظر میں" بجائے خود ایک نہایت مفید اور مطالعے کے لائق ہے، اس باب میں تمام اسلامی مملکتوں، اور مسلم ریاستوں کے رقبوں، آبادیوں

اور دیگر خصوصیات کا جامع خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس مجموعے کی بہترین خصوصیت جس کو بعض حیثیتوں سے عدیم المثال کہا جا سکتا ہے یہ بھی ہے کہ اس میں "اسلامی چوٹی کانفرنس" کو تصویروں کے آئینے میں بڑے چاؤ اور رچاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ابتدا میں مولانا عمید الزماں صاحب ڈائرکٹر ادارہ دار العلم کا مختصر اور جامع پیش لفظ ہے اور پھر رباط سے طائف تک (تجدید وفا) نہایت بصیرت افروز مضمون ہے جس میں دوسری باتوں کے علاوہ شاہ فیصل شہید کی تقریروں اور خطبوں کے ایسے اقتباسات دیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر حرارتِ ایمانی میں جوش و ولولے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ "دار العلم" نے یہ دل پسند اور گراں قدر تحفہ دے کر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ادارہ نے عربی زبان میں بھی اسی موضوع پر ایک مکمل کتاب بعنوان "مؤتمر القمۃ الاسلامی الثالث والعالم الاسلامی" شائع کی ہے۔ بعض مضامین جیسے "اعلان مکہ" اور "اختتامی اعلان و قرارداد یں" وغیرہ دونوں کتابوں میں مشترک ہیں۔ عربی زبان سے متوسط درجہ کی مناسبت رکھنے والے حضرات اردو اور عربی کتابوں کے مشترکہ مضامین کے تقابلی مطالعہ سے ترجمہ کا اسلوب سیکھنے کے علاوہ بہت سے عربی الفاظ و تعبیرات کے عصری مفاہیم و معانی کی تعیین میں بھی مدد لے سکتے ہیں۔ اس عربی مجموعہ کی قیمت دس روپے ہے۔ (ع)

جون ۱۹۸۱ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ : بیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد ۸۶	شعبان المعظم ۱۴۰۱ھ مطابق جون ۱۹۸۱ء	شمارہ ۶

مقالات

نظرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا المیہ

سخت افسوس اور رنج ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا مریض ناتواں جو دو ڈھائی برس سے چند در چند امراض مزمنہ کا شکار ہونے کے باعث عالم امید و یاس میں کشمکش موت و زیست سے دو چار تھا ۱۲ مئی کی سہ پہر کو اچانک دم توڑ گیا جب کہ ایک معصوم و بگناہ نوجوان طالب علم پولیس کی گولی کا نشانہ بنا، زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرا اور چند گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا، یونیورسٹی جو ایک ماہ تک بند رہنے کے بعد ابھی پچھلے دنوں کھلی تھی، پھر دوبارہ غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی، طلبا اور طالبات آگے پیچھے سب ہوسٹل خالی کر گئے، لڑکوں کا مطالبہ تو تھا ہی کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر استعفا دیں، ۱۲ مئی کے واقعہ کے بعد ملازمین یونیورسٹی کی یونین نے بھی ایک جلسہ کر کے اعلان کیا کہ وہ موجودہ وائس چانسلر کی موجودگی میں اپنے اپنے دفتر نہیں آئیں گے اور کام نہیں کریں گے ساتھ ہی اسٹاف ایسوسی ایشن نے جلسہ کر کے نہایت درشت لب و لہجہ میں ایک متفقہ تجویز کے ذریعہ وائس چانسلر اور ان کے رفیق سے مطالبہ کیا کہ "تاخیر مزید کے بغیر یونیورسٹی سے الگ ہو جائیں، ورنہ جب تک وہ رہیں گے ہم کام نہیں کریں گے" ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان سطور کے لکھے جانے تک یونیورسٹی کیمپس ایک شہر خموشاں اور ایک بلدۂ ویران و سنسان بنا ہوا ہے، ہر دفتر بند اور ہر ادارہ مقفل ہے۔ یہاں تک کہ لائبریریاں

شفاخانہ، میڈیکل کالج، رجسٹرار آفس جو تعطیلات کے دنوں میں کبھی بند نہیں ہوتے اب وہ بھی بند ہیں اور یونیورسٹی کی تمام عمارتوں پر حسرت و یاس برس رہی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا ایک اور نہایت افسوس ناک اور تشویش انگیز واقعہ ہے جس کی کوئی نظیر یونیورسٹی کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

جب کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے ہر فریق ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھار شروع کر دیتا ہے اور کوئی اپنی خطا یا غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، طلباء کا دعویٰ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمامتر وائس چانسلر کے سر ہے، اور وائس چانسلر اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک اس کے ذمہ دار طلباء اور اساتذہ کا ایک گروپ ہے، حالانکہ ایک یہ کیا دنیا کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں سب ارباب واقعہ کا، کسی کا کم کسی کا زیادہ، کچھ نہ کچھ حصہ نہ ہو، خلیل جبران نے ایک ناول میں خوب کہا ہے: "درخت کا ایک پتہ بھی اگر گرتا ہے تو پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر نہیں گرتا" اس بناء پر ہمارے نزدیک کسی ایک فریق کا دوسرے کو الزام دینا غلط ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری وائس چانسلر، اساتذہ اور طلباء سب پر عائد ہوتی ہے، اور اس لیے اگر اس یونیورسٹی کو زندہ رکھنا ہے تو یہ موقع ایک دوسرے پر الزام تراشی کا ہرگز نہیں ہے، بلکہ گریبان میں منہ ڈال کر احتساب نفس کرنے کا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آج کل ہمارا ملک تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے جس شدید اتھل پتھل کی حالت میں مبتلا ہے ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس سے متاثر نہ ہو، حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اور مذہبی درسگاہیں تک اس سے متاثر ہیں، اگرچہ تاثر کی صورتیں اور اس کے مظاہر مختلف ہیں، سخت افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اس عام

صورتِ حال سے ہماری علیگڈھ مسلم یونیورسٹی بھی مستثنیٰ نہیں ہے، اس بنا پر یونیورسٹی کے اعضاء وجوارح بھی خودغرضی اور مطلب پرستی کی اس رو میں بہنے لگے ہیں جس میں ملک کے دوسرے ادارے بہہ رہے ہیں اور وہ بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں اس حقیقت کو کہ ان کی یونیورسٹی ایک خاص کلچرل یونیورسٹی ہے، وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے اور اس حیثیت سے اس یونیورسٹی کی جو گذشتہ روایات اور تاریخ رہی ہیں وہ کس درجہ عظیم الشان اور نمایاں و ممتاز رہی ہیں، اب موجودہ نسل کو کون یاد دلائے کہ سرسید اور ان کے رفقاء نے محمڈن کالج کو جو بعد میں یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا ایک اقامتی تعلیمی ادارہ محض اس عزم اور جذبہ سے بنایا تھا کہ یہ ادارہ مثل ایک خاندان کے ہوگا جس میں اساتذہ اور طلباء اور ملازمین سب اسلامی روایات کے مطابق ایک خاندان کے چھوٹے بڑے افراد کی طرح مل جل کر محبت و شفقت اور ادب و احترام کے ساتھ رہیں گے اور سب مشترکہ طور پر عزم اور خلوص کے ساتھ اس عظیم مقصد کے لیے کام کریں گے جس کے لیے یہ کالج قائم کیا گیا تھا، یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے مسلمانوں کو جس قعر پستی و مذلت میں گرادیا تھا اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ مسلمانوں کو اس پستی سے نکال کر ملک میں ایک با عزت اور پروقار زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا۔ اس بنا پر یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہ تھا بلکہ ایک مرکز تہذیب و تربیت بھی تھا اور جو لوگ اس کالج سے فارغ ہو کر نکلتے تھے ان کا ایک کیرکٹر ہوتا تھا، زندگی اور اس کے مسائل کے بارہ میں وہ اپنا ایک مخصوص نقطۂ نگاہ رکھتے اور ان اوصاف و کمالات کے باعث ملک میں اور بیرون ملک وہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

پھر جب ۱۹۲۰ء میں کالج ترقی کر کے یونیورسٹی بنا تو دنیا نے دیکھا کہ یونیورسٹی کس عزم اور یقین کے ساتھ سرسید کے مشن اور ان کے نصب العین کی حفاظت کرتی اور سرسید کے

بتائے ہوئے لائحہ عمل پر چلتی رہی ایک خاندان ہونے کی اس کی روایت برقرار رہی، اساتذہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے لیکن، درس و تدریس اور طلبا کی تربیت کا کام ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے، ان میں حرص اور طمع نہیں تھی، انھیں جو تنخواہ ملتی تھی اس پر قناعت کر کے صاف ستھری مگر سادہ زندگی بسر کرتے تھے، انھیں اپنے مضمون سے عشق ہوتا تھا، مطالعہ کے ذریعہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے، طلبا کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اور ان کے دکھ درد میں ان کے شریک ہوتے تھے، وہ راست باز، محنتی اور مخلص ہوتے تھے، اسی طرح طلبا، اپنے والدین کی طرح ان سے محبت اور ادب و احترام کا معاملہ کرتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے، بچے بہرحال بچے ہوتے ہیں، کبھی حق یا ناحق مچل بھی جاتے ہیں، اس لیے اسٹرائکیں اس زمانہ میں بھی ہوتی تھیں لیکن کیا مجال کہ کوئی لڑکا کسی استاد کو گالی دے یا اس پر ہاتھ اٹھائے، جب لڑکوں کی طرف سے اس بات کا اطمینان تھا تو حکام یونیورسٹی کو کیا ضرورت تھی کہ وہ پولیس کو طلب کرے۔ وائس چانسلر جو اس خاندان کا سب سے بڑا ہوتا تھا وہ اور اساتذہ دونوں طلبا سے مفاہمت کر لیتے تھے اور معاملہ ختم ہو جاتا تھا۔ ہم نے یہ زمانہ خود نہیں دیکھا، سنا بہت کچھ ہے، البتہ کرنل بشیر حسین زیدی اور بدرالدین طیب جی کی وائس چانسلری کے عہد میں اس دورِ اولین کی ایک جھلک دیکھی ہے۔

غرض کہ جس دور کا یہ تذکرہ ہے وہ یونیورسٹی کا عہدِ زریں اور خیر القرون تھا جبکہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد، اساتذہ اور طلبا، تعمیر ملت و قوم کے مقصد کے پیش نظر ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ مل جل کر کام کرتے تھے، اختلافات کہاں نہیں ہوتے؟ وہاں بھی تھے، لیکن یہ اختلافات ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے، لیکن آج صورت حال بالکل برعکس ہے، یونیورسٹی کے لیے اقلیتی کردار کے مطالبہ سے

ملک کے بام ودر عرصہ سے گونج رہے ہیں لیکن اس بات کا احساس کسی کو نہیں ہے کہ ملک کی تقسیم نے پسماندگی اور زبوں حالی کے اعتبار سے مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر لا کھڑا کردیا ہے جہاں وہ ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں سرسید کے زمانہ میں تھے، اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ سرسید اور ان کے رفقاء نے اس زمانہ میں جس دل کی لگن اور مخلصانہ محنت ومشقت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ کام کیا تھا ہم بھی اسی جذبہ وولولہ اور ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانوں کی تعمیر نو کے لیے کام کرتے، آپس میں اگر کچھ تلخیاں اور ناگواریاں ہوتیں بھی تو مشہور مصرعہ: وعند الشدائد تذهب الاحقاد " جب مصیبتیں پڑتی ہیں تو آپس کی رنجشیں دور ہو جاتی ہیں' کے مطابق ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ان تلخیوں اور ناگواریوں کو پی جاتے اور ان کو اتنی اہمیت نہ دیتے کہ منزل مقصود ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ مسلمان بیشک اقلیت میں ہیں لیکن اگر اقلیت میں غیرت وحمیت قومی اور جذبۂ عمل ہو تو اقلیت میں ہونا خدا کی رحمت اور اس کا فضل وکرم خاص ہے۔ کیونکہ اکثریت اپنے احساس برتری کے گھمنڈ میں جمود وتعطل کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کے برخلاف اقلیت جہاد زندگی میں عزم و حوصلہ کے ساتھ مصروف عمل رہتی ہے تو آخر ایک وقت آتا ہے جب کہ اپنی مملکت کے نظم ونسق کے لیے خود اکثریت اقلیت سے مدد کی خواہاں اور طلبگار ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید میں وَكَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ وقت کا منادی چیخ چیخ کر پکار رہا ہے، حوادث ہیں کہ للکار رہے ہیں مگر صد افسوس! اس آواز کو کوئی نہیں سنتا، نہ اساتذہ سنتے ہیں اور نہ طلباء کیونکہ طلباء اساتذہ کی شفقت ومحبت اور ان کی توجہ ورہنمائی سے محروم ہونے کے باعث بے یقینی اور پراگندگیٔ فکر وخیال کا شکار ہیں اور اساتذہ راحت طلبی اور ہوس جلب زر کے صیدزبوں! نتیجہ یہ ہے کہ آج یونیورسٹی میں خاک اڑ رہی ہے، کرپشن عام ہے، ڈسپلن مفقود ہے اور تعلیم کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ ہزاروں طلباء

اور طالبات کی زندگی کے قیمتی لمحات برباد جا رہے ہیں، اور لاکھوں روپے ماہوار بے مصرف خرچ ہو رہے ہیں: وائے گردِ ہس امروز بود فردائے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے ۱۲ ارمئی کو جو حادثۂ فاجعہ پیش آیا یا اس سے پہلے اسی سلسلہ کے جو واقعات پیش آئے تھے ان کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر نہیں بلکہ سب پر عائد ہوتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو جس مرتبہ و مقام پر ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی حساب سے ہوگی۔

وائس چانسلر یونیورسٹی کا سربراہ اور صدر انتظامیہ ہوتا ہے اس لیے لازمی طور پر اس معاملہ میں بھی سب سے بڑی ذمہ داری اور مسئولیت صدر انتظامیہ کی ہی ہوگی۔ وائس چانسلر سید حامد صاحب بے شبہ ذاتی طور پر نہایت شریف اور بڑے فاضل و قابل انسان ہیں، ان کی دیانتداری اور خلوص پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن ان کی زندگی کا پہلا اور نیا تجربہ تھا، جون ۸۰ء میں اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد جب کہ یونیورسٹی بند تھی انھوں نے دفتروں کی اصلاح و ترقی اور ان میں حسنِ کارکردگی کی رفتار کو بڑھانے کے لیے جو اقدامات کیے وہ ضرور قابل تعریف تھے اور ان کی شہرت ہوئی بھی، لوگ اس زمانہ میں ان کی تعریف ہمارے سامنے کرتے تھے تو ہم کہتے تھے کہ ابھی کیا ہے؟ تیل دیکھیے، تیل کی دھار دیکھیے، وائس چانسلر کا اصل ٹسٹ یہ ہے کہ وہ طلباء اور اساتذہ کے معاملات سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔' چنانچہ یونیورسٹی کھلنے کے بعد جب طلبائ سے سابقہ ہوا تو ہمارے اندیشے غلط ثابت نہیں ہوئے۔ ایک وائس چانسلر جس کو اپنے عہدہ کا چارج لیے ہوئے ابھی پورا ایک برس بھی نہیں ہوا اگر اس کے اس مختصر عہد میں پولیس کو دو مرتبہ یونیورسٹی کیمپس میں ڈیرا ڈالنا پڑے اور اس کے نتیجہ میں یونیورسٹی دو مرتبہ بند ہو تو ایڈمنسٹریشن کو کامیاب نہیں کہا

جا سکتا۔

ایک کامیاب ایڈمنسٹریشن کے لیے ضروری ہے کہ (۱) جب کبھی کوئی اہم معاملہ پیش آئے اُس کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی اور ایمانداری سے غور و فکر کرے، ارباب دانش و تجربہ سے مشورہ کرے اور پھر فیصلہ جلد کرے، ٹال مٹول سے کام نہ لے اور (۲) پھر جب فیصلہ کرلے تو اسے پوری قوت سے نافذ کرے اور اس معاملہ میں کسی دباؤ اور سفارش کو قبول نہ کرے (۳) علاوہ ازیں کسی چیز کا فیصلہ کرتے وقت قانون کی اندھی پیروی نہ کرے بلکہ مصلحت شناسی اور بیدار مغزی سے بھی کام لے، حضرت عمر فاروق سے بڑا اور زبردست ایڈمنسٹریٹر کون ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ بھی مصلحت شناسی کے قائل تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو جو عشرۂ مبشرہ اور سابقین اولین میں سے ہیں کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا، کوفہ والے پہلے تو ان سے خوش رہے اور پھر حسب عادت ان کی الٹی سیدھی شکایتیں دربارِ خلافت میں پہنچانی شروع کردیں، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر نے ان کو معزول کردیا مگر ساتھ ہی فرمایا: میں جانتا ہوں کہ سعد بن ابی وقاص کے خلاف اہل کوفہ کی شکایتیں سرتاسر غلط اور بے بنیاد ہیں، لیکن اس کے باوجود انتظامی مصلحت کا تقاضہ تھا کہ سعد کو کوفہ سے ہٹادیا جائے، حضرت عمر کا یہ فیصلہ اس امر کی صاف دلیل ہے کہ ایک ایڈمنسٹریٹر کو صرف یہ دیکھنا نہیں ہے کہ قانون کیا ہے بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماحول کیا ہے؟ حالات کس قسم کے ہیں؟ اور قانون کے مطابق اس وقت اس کے فیصلہ کا ردعمل کیا ہوسکتا ہے؟۔

ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے مطابق سید حامد صاحب میں ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔ ہمیں ان کی کمزوری کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب کہ

عوں نے یونیورسٹی میں بڑے اہتمام وانتظام سے بین الاقوامی سطح پر پندرھویں صدی ہجری
تقریبات کو منانے کی غرض سے سابق وائس چانسلر پروفیسر خسرو کی مقرر کی ہوئی کمیٹی
ڑدی اور اس کی جگہ ایک اور وسیع ترکمیٹی کی تشکیل کی جس کے سکریٹری یونیورسٹی کے ایک
ینیئر پروفیسر مقرر کیے گئے، چند لوگوں کے کہنے سننے پر حامد صاحب جلد بازی میں
یک فیصلہ تو کر بیٹھے لیکن اس فیصلہ کو نافذ نہیں کرا سکے، اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ
ہلی کمیٹی تقریبات کے سلسلہ میں کافی کام کر چکی تھی۔ اس پر یونیورسٹی کا جو روپیہ خرچ
چکا تھا وہ سب برباد ہو گیا اور دنیا بھر میں یونیورسٹی کی بدنامی اور رسوائی الگ ہوئی، پھر طلبا
ایجی ٹیشن شروع ہوا تو پروفیسر عرفان حبیب کے معاملہ میں بھی انھوں نے اس کمزوری
مظاہرہ کیا، وہ قطعی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے، کبھی کچھ کہا اور کچھ کیا، ایک بات جم کے نہ
ہہ سکے اور نہ کر سکے، اس درمیان میں لڑکے گرفتار ہوئے، جیل میں رہے، پھر رہا بھی ہوئے،
نیورسٹی بند ہوئی اور پھر کھلی بھی، مگر جس بات پہ ہنگامہ ہوا تھا وہ پھر بھی وہیں کی وہیں رہی،
ے کون شخص اچھا ایڈمنسٹریشن کہہ سکتا ہے؟ اس کے بعد یونین کے ختم کرنے کے معاملہ
بھی ان سے یہ فروگذاشت ہوئی کہ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ دستور کیا ہے اور اس بات
لحاظ نہیں رکھا کہ یونیورسٹی کی موجودہ فضا میں اس کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے؟ ورنہ
نہیں اگر اس کا خیال ہوتا تو اس کی پیش بندی کے لیے وہ کوئی احتیاطی تدابیر اختیار
ر سکتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قانون پر عمل کرنے کے قائل ہیں مصلحت
شناسی کے نہیں، اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ چیز ایک ایڈمنسٹریٹر کا ہنر نہیں کمزوری ہے۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ——— اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت برا ہوا
س کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا ——— اب اگر یونیورسٹی کو بچانا ہے تو اس بات کی ضرورت
ہے کہ وائس چانسلر، اساتذہ اور طلباء سب ایک میز پر بیٹھیں، سخن سازی اور اپنے پر صحیح

کا خیال ترک کریں اور کھلے دل سے اپنی اپنی غلطی کا اقرار و اعتراف کریں اور آئندہ کے لیے اشتراک و تعاون باہمی سے کام کرنے کا عہد و پیمان کریں۔ علاوہ ازیں ہم گورنمنٹ سے درخواست کریں گے کہ وہ ایک اعلیٰ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے جو گذشتہ پانچ برس کے یونیورسٹی کے تعلیمی، انتظامی اور مالیاتی حالات کا دقت نظر اور تحقیق سے جائزہ لے کر ایک جامع اور مفصل رپورٹ پیش کرے، پھر اس رپورٹ کے مطابق جو لوگ، خواہ وہ کتنے ہی بڑے ہوں، کرپٹ، مفسد اور کام چور پائے جائیں انھیں فوراً اور بے تکلف یونیورسٹی سے خارج کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کا جسم اندر سے اس درجہ فاسد اور متعفن ہوگیا ہے کہ جب تک اس پر عمل جراحی نہ ہوگا وہ صحت مند اور درست نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کو اس سلسلہ میں جلد کوئی اقدام کرنا چاہیے۔

۲۔ تسخیر اشیاء اور نعمہائے الٰہیہ

خلافتِ ارض کے لیے سائنس وصنعت کی اہمیت

(آخری قسط)

علم اسماء کی تفصیل پچھلے باب میں علم اسماء کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس باب میں علم اسماء کی تفصیل اور عملاً ان سے استفادہ کی نوعیت و اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم کا انسان صرف زمین، آسمان، چاند سورج، ستارے، ہوا، پانی، حجر شجر، مٹی، حشرات، گائے، بیل، بکری، اونٹ، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، کتا، بلی، شیر، لومڑی، جنگل، پہاڑ، لوہا، تانبا، پیتل، سونا، چاندی، دریا، سمندر، مچھلی، پرندے، چاول، گیہوں، دال، سبزی، گوشت، انڈا، دودھ اور دہی وغیرہ وغیرہ ہی سے واقف تھا یا چند زراعتی، تمدنی اور جنگی آلات و اوزار وغیرہ سے۔

مگر آج کا انسان ایٹم، الکٹران، پروٹان، نیوٹران، پوزیٹران، ڈیوٹران، فوٹان، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، ہیلیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، ریڈیم، یورینیم (تمام ۱۰۴ عناصر) برق، بھاپ، ایٹمی قوت، ایٹمی شعاعیں، لاشعاعیں، کائناتی شعاعیں، پروٹو پلازم، امیبا، پروٹوزوا، جینز، کروموسوم، کلوروفل، کلوروپلاسٹ، انزائم، مائیٹو کانڈریا، ہیموگلوبین، ہارمون، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، وٹامن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، گلوکوز، پنسلین، مختلف قسم کے کیمیا دی ایسڈ اور ان کے بے شمار مرکبات،

ربر اور اس کی مصنوعات، پلاسٹک اور اس کی مصنوعات، مختلف کیمیاوی کھادیں اور ادویات نئی نئی دھاتوں کی دریافت اور ان کی مصنوعات، بے شمار قسم کی پیچیدہ مشینیں تھرامیٹر، بیرومیٹر، فلاسک، ریفریجیٹر، ٹرین، موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، برقی، وائرلیس تار، ٹیلکس، ٹیلی پرنٹر، راکٹ اور خلائی جہاز وغیرہ وغیرہ سے بھی واقف ہے۔

آج انسان روئے زمین پر سوا ملین (ساڑھے بارہ لاکھ) کے قریب حیوانات و نباتات کے وجود کا پتہ لگا کر ان کے آثار و خواص کا مطالعہ کر رہا ہے جو "حیاتیات" (Zoology) کے دائرہ میں آتے ہیں[1] اسی طرح آج کرۂ ارض پر پائے جانے والے دو لاکھ کے قریب "غیر نامیاتی مرکبات" (Inorganic Compounds) اور چالیس لاکھ کے لگ بھگ "نامیاتی مرکبات" (Organic compounds) سے واقفیت حاصل کر چکا ہے[2] جن کا مطالعہ علم کیمیا (Chemistry) کے تحت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سمائے دنیا میں پائے جانے والے لاتعداد ستارے اور سیارے اور اربوں کہکشاؤں کے نظاموں اور ان کی خصوصیات کا مطالعہ علم فلکیات (Astronomy) کے تحت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زیر زمین پائی جانے والی اشیا خصوصاً مٹی اور چٹانوں کی بناوٹ اور ان کی ساخت و پرداخت اور معدنیات وغیرہ کا مطالعہ علم ارضیات (Geology) کے تحت کیا جا رہا ہے۔

---

[1] Asimov's Guide to Science, Vol. 2, P. 304, 1978.

۱۸۰۰ء حیوانات و نباتات کی دریافت شدہ تعداد صرف ستر ہزار تھی، جب کہ یہ تعداد آج بارہ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ کھوج برابر جاری ہے اور دن بدن نئے نئے انواع حیات علم انسانی میں آ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مخلوقات الٰہی کی صحیح تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

[2] علم کیمیا، ۲/۱۵۸

اس لحاظ سے تحقیقات کا دائرہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے موجودات عالم یا خدا کی مخلوقات کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دوربین اور خوردبین کی ایجاد کے بعد تو ہمارے سامنے نئے نئے جہانوں کے ظہور کا ایک تانتا سا بندھ گیا ہے اور ایسے ایسے حقائق منظر عام پر آرہے ہیں جن کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ہے۔

جس طرح قدیم چیزوں سے واقفیت "علم اسماء" میں داخل تھی اسی طرح جدید سے جدید تمام چیزوں سے واقفیت بھی علم اسماء میں داخل ہے بلکہ قیامت تک جتنی بھی نئی نئی چیزیں اور ان کے خواص وتاثیرات دریافت ہوتے جائیں گے وہ سب کے سب مفسرین کی تصریحات کے مطابق۔ علم اسماء ہی کے دائرہ میں ہوں گے، جن کے دریافت کی صلاحیت خلاق فطرت نے روز ازل ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کے توسط سے بالقوۃ تمام انسانوں میں رکھ دی تھی۔

سائنسی علوم کا پھیلاؤ | ان اصطلاحات کی وسعت یا "ناموں کی کثرت" کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ سائنسی علوم کی بے انتہا ترقی اور پھیلاؤ کی بدولت خود ان علوم (طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور ارضیات وغیرہ) میں سے اب ہر علم وفن کی لغات (ڈکشنریاں) تک الگ الگ تیار ہونے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر ادارہ Penguin Books London کی تیار کردہ مختلف سائنسی لغات ملاحظہ ہوں، جن میں سے ہر ایک کئی کئی ہزار الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے[1]

---

[1] وہ یہ ہیں:

1. The Penguin Dictionary of Physics.
2. The Penguin Dictionary of Biology.
3. A Dictionary of Science
(یہ لغت خصوصیت کے ساتھ علم کیمیا کے لیے مخصوص ہے)
4. A Dictionary of Geology.
5. A Dictionary of Geography.
6. A Dictionary of Electronics.

پھر ان علوم میں سے ہر علم — کثرت مباحث کی بدولت — مزید شاخ در شاخ تقسیم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف "حیاتیات" ہی کو لے لیجیے جس کی اب تک بیسیوں شاخیں وجود میں آ چکی ہیں۔ جیسے:

علم عضویات ——— Morphology
نسیجیات ——— Histology
علم تشریح ——— Anotomy
فعلیات ——— Phisiology
علم طبیعی ماحول ——— Ecology
علم درجہ بندی (انواع حیات کے اقسام) ——— Taxonomy
علم توالد و تناسل ——— Genetics
معدوم شدہ جانوروں اور پودوں کا علم ——— Palaeontology
نباتاتی معاشیات ——— Economic Botany.

یہ وہ علوم ہیں جو عام طور پر درسی کتابوں کا جزو ہوتے ہیں۔ اور حیاتیات کی دو اصولی شاخوں: (۱) علم نباتات (Botany) اور (۲) علم حیوانات (Zoology) کی کسی بھی درسی کتاب کے عموماً لازمی اجزا کے طور پر یہ مباحث پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حیاتیات کی چند جدید شاخیں وہ ہیں جو فنی لحاظ سے مخصوص نوعیت کی حامل ہیں۔ ان کے بغیر حیاتیات کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ ہیں:

علم خلیات ——— Citology
حیاتیاتی کیمیا ——— Biochemistry
طبیعی حیاتیات ——— Physical Biology
بحری حیاتیات ——— Marine Biology.

تابکاری حیاتیات ———— *Radio Biology*

خوردبینی حیاتیات ———— *Micro Biology*

سالماتی حیاتیات ———— *Molecular Biology*

کیمیائی خوردبینی حیاتیات ———— *Chemical Micro Biology*

برقی فعلیات ———— *Electrophysiology*

حیاتی برقیات ———— *Bioelectricity*

انزائمیات ———— *Enzymology*

مائی ٹو کانڈریائی علم ———— *Mytocondriology.*

بطورمثال یہاں پر صرف ایک علم کی متعدد شاخیں بیان کی گئی ہیں. ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ علوم چھوٹ گئے ہوں۔ بہرحال اس سے موجودہ سائنسی علوم کی وسعت و اہمیت اور ان کی ہمہ گیری کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم اور یہ تمام مسائل و مباحث علم اسماء ہی کی تفصیلات ہیں. حقیقت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں (مادہ و توانائی کے آثار و خواص) کو مسلمان محقق اور سائنس داں دریافت کرتے تو ان کے نام بھی وہ اپنی زبان میں کچھ اور رکھتے، جس کی وجہ سے شاید وہ اجنبیت نہ ہوتی جو آج دکھائی دے رہی ہے[1] اور دوسری حیثیت سے وہ علوم وفنون کے میدان میں بھی اقوام عالم کی

---

[1] اگرچہ علوم وفنون کی اصطلاحوں کے مترادفات ہماری زبان میں بھی وضع کر لیے گئے ہیں مگر جس رفتار سے سائنس کی ترقی ہورہی ہے اس رفتار سے وضع اصطلاحات کا کام نہیں ہو پا رہا ہے اور پھر بہت سی اصطلاحیں فرسودہ اور ناکارہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اکثر انگریزی کی اصطلاحات کے استعمال ہی کو ترجیح دینا پڑتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اصل معاملہ محض اصطلاحات کا بھی نہیں ہے بلکہ صحیح معنی میں ان علوم کے غیر دینی اور غیر ضروری ہونے کا تصور ہے۔ جب تک "علم" کی تقسیم کا یہ غلط تصور نہیں بدلے گا کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی۔ (باقی صنا پر)

رہبری کر کے پوری دنیا کے امام بنتے۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ میں بغداد، سسلی اور اسپین وغیرہ نے علوم و فنون کی ترقی میں تاریخی رول ادا کیا تھا، جس کے باعث موجودہ یورپ کی ذہنی بیداری اور اس کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) عمل میں آسکی۔

قرآن کی بلاغت اور اس کے علمی اعجاز کا ایک نمونہ | ضمناً میں اس موقع پر ایک نکتہ یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سارے علوم اور یہ تمام مسائل و مباحث محض قرآن حکیم کے ایک لفظ "الاسماء" کی تفصیل ہیں۔ یہ قرآن حکیم کی بلاغت اور اس کا سب سے بڑا اعجاز ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں علوم و فنون کے سمندر کو نہیں بلکہ بلا مبالغہ "سمندروں" کو سمو دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم کو اس موقع پر صرف ایک لفظ "الاسماء" کی بلاغت اور اس کے حیرت انگیز مفہوم میں نظر آرہا ہے۔ اس ایک لفظ کی تشریح و تفسیر ـــــ مکمل طور پر ـــــ پوری نوع انسانی اپنے تمام علوم و فنون سمیت قیامت تک نہیں کرسکتی۔ علوم و فنون کی پوری پوری عظیم الشان لائبریریاں بھی اس ایک لفظ کی کامل توجیہہ و تشریح میں عاجز و بے بس رہیں گی یعنی موجودات عالم اور ان کے خواص و آثار سے متعلق جتنی بھی تفصیلات ـــــ مختلف علوم کے تحت ـــــ مدوّن کی جائیں گی وہ سب کی سب اس "ایک حرفی کوزے" میں سما جائیں گی بلکہ "ھل من مزید" کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ کہہ دو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کے (لکھے جانے) کے لیے، تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) نیز اس سلسلے میں ایک اور تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو والوں کو اب تک "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" ہی سے فرصت نہیں ملی کہ وہ ان حقیقی علوم و فنون کی طرف توجہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا دامن اب تک ان مفید تجربی علوم سے بالکل خالی نظر آتا ہے، خصوصاً وہ علوم جو اوپر گنائے گئے ہیں۔

سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے اُسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں (کہف ۱۰۹)
وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اور زمین میں جتنے بھی درخت ہیں سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر اپنے بعد مزید سات سمندروں کو لے آئے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ یقیناً اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ (لقمان ۲۷)

یہی وجہ ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی "حقائق و معارف سے لبریز" اس جیسا کلام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ عجمی لوگ قرآن حکیم کے ادبی اسلوب اور اس کی اصل معجزانہ بلاغت کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو کیا ہوا، اس کی حکمت و دانش، اس کے معجزنما بیانات اور اس کے اس حیرت انگیز پہلو سے اس کی عظمت و برتری کا کچھ تو اندازہ کر سکتے ہیں! قرآن کا اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر دور میں اس کے حالات و مقتضیات کے مطابق اس کا علمی اعجاز مختلف حیثیتوں سے کھل کر سامنے آتا رہتا ہے اور اس کے کلام برتر اور کلام الٰہی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قوم (اپنی زبان کی اجنبیت کی بنا پر) یا کوئی دور (اپنے زمانی تاخر کی بنا پر) اس کے کسی ایک پہلو کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کے اعجاز کا دوسرا پہلو اس کے سامنے آجاتا ہے۔ غرض آج کے جدید ترین علمی دور میں اس کا علمی اعجاز اہل دانش کو مبہوت و ششدر کر دینے کے لیے کافی ہے، جو عقل سلیم اور فکر سلیم رکھنے والوں اور حساس دل و دماغوں کو متاثر کرنے والے ایک اعلیٰ ترین کلام کے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا مشابہ نوع انسانی نے اب تک نہیں کیا ہے۔

خلافتِ ارض اور جہاد اس موقع پر بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کو علم اسماء دیے جانے کا مقصد و مدعا کیا ہے؟ تو اس کا جواب پچھلے صفحات میں دیا جا چکا ہے کہ اس سے خلافت ارض کے اغراض و مقاصد کی تکمیل مقصود ہے۔

خلافت ارض کا سب سے بڑا مقصد زمین میں — انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے عدل و انصاف قائم کرنا اور ظلم و زیادتی کو مٹانا ہے۔ تاکہ یہ دنیا امن و امان اور سکون و آشتی کا گہوارہ بن جائے (جو موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے) اور پروردگار عالم کی ربوبیت و رحمانیت جس طرح تمام مظاہر کائنات پر محیط نظر آرہی ہے اسی طرح اس کی رحمانیت کا بھرپور مظاہرہ خود انسانی زندگی کے مختلف مظاہر میں بھی نظر آئے۔ ورنہ تضاد اور ثنویت کی وجہ سے انسان اور کائنات کے درمیان تال میل اور مکمل ہم آہنگی نہیں رہے گی۔ لہٰذا انسانی کوشش — خصوصاً خدا کے مخلص اور زوبانبازو کی سعی — یہ ہونی چاہیے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس مقصد عظیم کی تکمیل کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر ڈالیں۔ اسی وجہ سے اہل اسلام کو دنیا کے باطل فلسفوں، باطل نظاموں اور طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے[1] جہاد کی دو قسمیں ہیں: (۱) علمی یا

---

[1] مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک متنبہ کرنے والے کو بھیج دیتے (مگر ایسا کرنے کے بجائے ہم نے ایک جامع اور مکمل کلام نازل کر دیا جو سب کے احوال و کوائف کے لیے کافی ہو) لہٰذا تم منکرین کا اتباع مت کرو (اور باطل نظاموں کو تسلیم نہ کرو) بلکہ اس (کلام) کے ذریعہ ان کا (اور ان کے فلسفوں کا) زور شور کے ساتھ مقابلہ کرو۔ (فرقان - ۵۱-۵۲)

یہاں پر دو حقیقتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ ہر ہر شہر و بستی یا ہر ہر قوم میں ایک ایک ہادی بھیجنے کے بجائے ایک ایسا جامع کلام بھیجا گیا جو سب کی ہدایت کے لیے کافی ہو۔ اس سے اس طرف بھی ہو گیا کہ مابعد کے ادوار کے لیے بھی علیحدہ علیحدہ رسول اور الگ الگ پیغامات بھیجے ضروری نہیں رہے، بلکہ یہی واحد کلام تاقیامت تمام اقوام عالم کے لیے متنبہ اور خبردار کرنے والا بن سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا صاف و صریح رہنما

قلمی جہاد (۲) جہاد بالسیف یا طاقت کا اظہار۔ قسم ثانی کا مظاہرہ خاص خاص حالات اور تقاضوں پر موقوف ہے۔ مگر قسم اول ہمیشہ جاری رہ سکتا ہے۔ یعنی دلیل واستدلال کے ذریعہ باطل نظاموں کا مقابلہ اور دینِ رحمت (دین اسلام) کی سربلندی اور عملاً اس کو غالب کرنے کے لیے راہیں ہموار کرنا۔ اسی وجہ سے انسان کو پیدا کرنے کے فوراً بعد قوت بیانیہ، دلیل واستدلال اور علم اسماء وغیرہ سب کچھ عطا کر دیا گیا ہے[۱] تاکہ بنی نوع

(بقیہ حاشیہ صلا) مطلب یہ ہوا کہ اس میں چونکہ علمی اعتبار سے باطل افکار ونظریات اور جدید سے جدید تر ہر قسم کے فلسفوں اور نظاموں سے نپٹنے کا سامان بھی رکھ دیا گیا ہے اس لیے ہم کو قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے یعنی اُس کے ابدی حقائق ومعارف کا استنباط کر کے عالم انسانی کی رہبری کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ موجودہ دور عقلیت (Rationalism) اور نظریاتی کشمکش کا دور ہے۔ اور آج وہی دین و مذہب کامیاب ہو سکتا ہے جو عقلی ونظریاتی اعتبار سے دوسرے تمام نظاموں کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قرآن حکیم اس حیثیت سے بھی ایک کامیاب اور بے مثال صحیفہ نظر آتا ہے۔

اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ "جہاد" کا مطلب لازماً "جنگ و قتال" یا تلوار اٹھانا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب "کوشش اور جدوجہد کرنا" ہے۔ یعنی دینِ حق کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا۔ اب رہا دین حق کی مدافعت میں جنگ و جدل کرنا، تو یہ محض اس کی ایک شکل ہے جو زبانی علمی اتمام حجت کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر روا رکھی گئی ہے۔ خود اس آیت کریمہ کو دیکھ لیجیے یہاں پر ہم کو بجائے تلوار کے محض قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یعنی علمی ونظریاتی اعتبار سے اقوام عالم کا مقابلہ کرنا۔ اسی وجہ سے اس میں تمام فلسفوں کا رد موجود ہے۔

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پچھلا باب۔

انسان کے درمیان نظریاتی کشمکش جاری رہے اور قوت استدلال کے ذریعہ سے وہ ایک دوسرے پر غالب آتے رہیں۔

مگر انسان کی فطرت میں دو قسم کی قوتیں کارفرما ہیں: (۱) ایک تو اس کا ضمیر یا نفس ناطقہ (Conscience) ہے جو اس کو ہمیشہ نیکی اور تعمیر سیرت پر ابھارتا رہتا ہے۔ (۲) اور دوسرے اس کا نفس امارہ یا حیوانی قوت ہے جو اس کو بدی اور تخریب کی طرف آمادہ کرتی رہتی ہے۔ ان دونوں میں برابر کشمکش اور آویزش برپا رہتی ہے۔ انسان کی آزمائش کے لیے یہ دونوں قوتیں اللہ نے ہر انسان میں برابر رکھ دی ہیں مگر جس وقت اجتماعی حیثیت سے کسی قوم کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس پر حیوانی قوت اور اس کے اثرات غالب آجاتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ کی زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے تو ایسے موقعوں پر بجائے جہاد بالقلم کے جہاد بالسیف ضروری ہو جاتا ہے تاکہ فتنوں کا استیصال ہو جائے اور زمین میں امن وامان برقرار رہے۔

یہ ہے خلافت ارض اور جہاد کا تعلق اور اس کی نوعیت۔ اب رہا تسخیر اشیاء کا معاملہ ——جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے—— تو یہ اصلاً جہاد کی تیاری کے لیے ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، بجائے خود مقصود و مطلوب نہیں۔ اس نکتہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

مسلمان اپنے دین وایمان پر ثابت رہتے ہوئے اگر دنیوی میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو شرعی حیثیت سے ان پر کوئی رکاوٹ اور پابندی عائد نہیں ہوتی، بلکہ ان کی یہ کوشش ہر حیثیت سے محمود و مستحسن سمجھی جائے گی، پھر ایسی صورت میں جب کہ آج دین کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے خود دنیوی حیثیت سے ہمارا مضبوط و مستحکم ہونا نہایت ضروری ہے۔

بعض لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ دنیوی علوم وفنون سے تعرض اور ان میں انہماک شاید اسلام کی قناعت پسندانہ قسم کی ہدایات کے خلاف ہو مگر یہ ایک منفی صورت حال ہے جو

بعض خاص احوال وکوائف کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اس سے میدان عمل میں مثبت طور پر جدوجہد کرنے کی ممانعت نہیں نکلتی؛ بلکہ قرآن حکیم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جو اس میدان میں آگے بڑھنے پر ابھارتی ہیں، خصوصًا وہ آیات جن میں مظاہر فطرت کی تسخیر کرنے اور ان کی قوتوں سے استفادہ کرنے کا حددرجہ مؤثر اور طاقتور اسلوب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز ایک موقع پر دنیا داروں اور دین داروں کا تذکرہ کرنے کے بعد بطور اصول یہ حتمی فیصلہ بھی سنا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مادی نعمتیں اور دنیوی بخششیں صرف دنیا داروں ہی کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دین داروں کا بھی ان میں حصّہ ہے :

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○ ہم تمہارے رب کی نوازش (دنیوی) سے اِن کو بھی نوازتے رہیں گے اور اُن کو بھی ۔ اور تمہارے رب کی عنایات (کسی کے لیے بھی) ممنوع نہیں ہیں۔

(بنی اسرائیل ــ ۲۰)

غرض خلافت ارض کا ایک اہم ترین مقصد "جہاد" ہے ۔ اور جہاد کی تیاری کے لیے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ہر قسم کے علوم وفنون سے آراستہ رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جہاد کوئی وقتی یا عارضی چیز نہیں، بلکہ ایک دائمی فریضہ ہے جو دین کے علمبرداروں پر مستقل طور پر عائد ہوتا رہتا ہے ۔ لہٰذا موجودہ دور میں صحیح معنی میں علمی وقلمی جہاد کے لیے سائنسی علوم سے واقفیت ضروری ہے ۔ اس کے بغیر اقوام عالم پر علمی اعتبار سے حجت پوری نہیں ہو سکتی ۔ اسی طرح آج "ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد" کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ صنعت اور ٹکنالوجی سے واقفیت اور اس میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے[1] تاکہ حالات کے مطابق اقوام عالم سے نبرد آزمائی کی جا سکے اور ان پر رعب داب

---

[1] کیونکہ آج تیر اور تلوار کا زمانہ نہیں بلکہ راکٹ اور ہوائیوں کا دور ہے ۔

قائم کر کے[1] عدل الٰہی کو دین رحمت کی شکل میں غالب کیا جا سکے۔ جہاد کی اس ہمہ جہتی تیاری سے جہاں ایک طرف امت اسلامیہ کو فوجی و سیاسی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے بہت سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف خود معاشی و اجتماعی حیثیت سے بھی ملت اسلامیہ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور اتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔ یہ ہے علم اسمار کا صحیح مقصد و منشا اور اس کی اصلی غرض و غایت۔ اب اگلے صفحات میں اسی کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

تسخیر اشیاء اور باطنی نعمتیں | غرض انسان کو علم اسمار دیے جانے کا بنیادی مقصد جیسا کہ تفصیل گزر چکی ـــــ مظاہر کائنات سے تعارف حاصل کر کے ان میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونا اور خلافتِ ارض کے میدان کو سر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مظاہر و موجودات میں انسان کے لیے بے شمار فوائد اور عجیب و غریب نعمتیں ودیعت کر دی ہیں جو اس کی ربوبیت و رحمانیت کا حیرت انگیز مظہر ہیں۔ قرآن حکیم میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ط کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لیے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں مسخر کر دیں اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں

---

[1] بمطابق آیۂ کریمہ:
وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ الخ
اور تم اُن سے لڑائی کے لیے اتنی قوت اور زور آور گھوڑے تیار کرو جتنے تم کر سکتے ہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو۔ (انفال ـ ۶۰)
اس آیت پر تفصیلی بحث اگلے ابواب میں آ رہی ہے۔

پوری کر دیں۔! (لقمان ۲۰)

یہاں پر "ظاہری اور باطنی نعمتیں" خاص طور پر قابل غور ہیں۔ کتب تفسیر میں ان کے مختلف مفہوم و مصداق بیان کیے گئے ہیں۔ جن کو مختصر طور پر نمبر وار بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ بعض کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے ظہور اسلام اور دشمنوں پر فتح اور باطنی نعمتوں سے مراد فرشتوں کے ذریعہ امداد ہے۔

۲۔ ظاہری نعمتوں سے مراد شکل و صورت کا حسن اور اعضاء کی درستی ہے اور باطنی نعمتوں سے مراد معرفت ہے۔

۳۔ ظاہری نعمتوں سے مراد حواس ظاہری اور باطنی سے مراد عقل اور دماغ ہیں[1]

۴۔ امام رازی کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے مراد جسمانی اعضاء کی درستی اور باطنی نعمتوں سے مراد ان اعضاء میں کار فرما پوشیدہ قوتیں ہیں[2]

۵۔ علامہ زمخشری نے نسبتاً ایک زیادہ بہتر اور فکر انگیز مفہوم بیان کیا ہے جو خود ان کا اپنا قول ہے[3] فرماتے ہیں:

---

[1] یہ تینوں اقوال تفسیر کشاف سے ماخوذ ہیں۔　　　[2] تفسیر کبیر۔

[3] واضح رہے کہ شرعی احکام کے برعکس تکوینی امور سے تعلق رکھنے والی آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان کافی اختلاف ہے اور اس قسم کی آیات کی تفسیر کبھی مکمل اور "حرف آخر" نہیں ہو سکتی، علوم سائنسی علوم کی جیسے جیسے ترقی ہوتی جائے گی ان آیات کریمہ کا بہتر مفہوم اور ان کے حیرت انگیز اعجازی پہلو خود بخود واضح ہوتے جائیں گے، جو در اصل نوع انسانی کی فکری و اعتقادی اور تہذیبی و تمدنی اعتبار سے رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں قرآن عظیم کا یہ سب سے بڑا اعجاز اور اس کا حیرت انگیز "ذاتی" پہلو ہے، جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

الظاهرة كل يعلم بالمشاهدة، والباطنة مالا يعلم الا بدليل اولا يعلم اصلاً۔ فكم في بدن الانسان من نعمة لا يعلمها ولا يهتدى الى علم بها۔ ظاہری سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو مشاہدہ میں آسکے۔ اور باطنی سے مراد وہ نعمت ہے جو کسی دلیل سے معلوم ہو سکے یا بالکل ہی معلوم نہ ہو سکے، اس لحاظ سے انسان کے بدن میں کتنی ہی ایسی (پوشیدہ) نعمتیں ہیں جن کو انسان نہیں جانتا اور ان کی طرف راہ یاب نہیں ہوتا[۵۱]

میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نوازشات الٰہیہ ہیں جو آفرینش آدمؑ سے لے کر عصر حاضر تک برابر معلوم و متعارف چلی آرہی ہیں یعنی وہ لوازم حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا انسان بخوبی واقف رہا ہے اور باطنی نعمتوں سے مراد خاص کر مادہ (Matter) اور توانائی (Energy) کے وہ پوشیدہ اسرار و حقائق ہیں جو علوم سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ہیں۔ جن کو موجودہ انسان مسخر کر کے بخوبی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مثلاً برق، بھاپ، جوہری توانائی،[۵۲] جوہری آئی سوٹوپ اور بے شمار قسم کے کیمیاوی مرکبات۔ (Chemical Compounds) جو مصنوعی غذاؤں، ادویہ، کھادوں اور دیگر بے شمار مصنوعات سے متعلق ہیں۔ اور اسی طرح مختلف قسم کے ترشے (Acids) وغیرہ جن کا استعمال جدید صنعتوں (Industries) میں بہت عام اور اہم ہے۔

یہ تمام نعمتیں روز اول ہی سے کائنات میں موجود تھیں جن سے انسان علم اسماء کی ترقی اور علم تسخیر (ٹکنالوجی) کی قوت کی بدولت صحیح فائدہ اب اٹھا رہا ہے۔

---

۵۱ تفسیر کشاف ۳/۲۳۵

۵۲ جوہری توانائی کے مضر پہلوؤں پر بحث اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے نکالے۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلتی رہیں، (تاکہ تم جہاں چاہو بآسانی سفر کرسکو) اور دریاؤں کو مسخر کیا (کہ حسب منشا ان پہ بند باندھو اور ان کا رُخ موڑ لو) اور تمہارے لیے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم حسب خاطر مستفید ہوسکو) اور تمہارے لیے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات متعین ہوسکیں) اور اس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دیے۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کرسکو گے۔ انسان بڑا ہی ستم گار اور ناشکرا ہے (وہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے) (ابراہیم ۳۲-۳۴)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ اور اس نے زمین اور اجرام سماوی کی تمام چیزیں تمہارے کام میں لگا دی ہیں۔ یقیناً اس باب میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ ۱۳)

ان تمام آیات میں غور کیجیے۔ ان آیات کا منشا و مقصد کیا ہے اور یہ حکم کس کو

دیا جا رہا ہے؟ تسخیر اشیاء کس چیز کا نام ہے[1]؟ باطنی نعمتیں کس طرح وجود میں آتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ حکم "خلیفۃ الارض" کو دیا جا رہا ہے کہ وہ علم اسماء کے "منتر" اور "دست تسخیر"[2]

---

[1] تسخیر کے لغوی معنی ہیں: کسی کو جبراً کام میں لگانا، رام کرنا، قابو میں کرنا وغیرہ۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ کسی خاص مقصد کے لیے کسی کو زبردستی لے جانا تسخیر کہلاتا ہے۔ اور "مسخر" وہ ہے جس کو کسی کام پر (جبراً) لگایا گیا ہو" (مفردات القرآن) اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم ازلی اور قوت قاہرہ سے تمام موجودات عالم کو انسان کے خادم اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے مختلف کاموں پر مامور اور تیار کر رکھا ہے اور ان میں مخفی طور پر بے شمار فوائد ودیعت کر دیے ہیں۔ اب انسان کا کام ـــ اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ـــ یہ ہے کہ وہ ان "خدّام" سے (نہ کہ دیوی دیوتاؤں سے) اپنی عقل و دانش اور ضرورت کے مطابق خدمت لے اور ان مخفی فوائد کا پتہ لگا کر اور اپنے تمدنی مسائل و مشکلات حل کر کے دنیائے انسانیت کے گیسو سنوارے۔ چنانچہ اس ارشاد باری "وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ۔ (اور اس نے تمہارے تمام فطری مطالبات پورے کر دیے) کے مطابق انسان کی کوئی مشکل اور اس کی کوئی فطری و تمدنی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کا حل "ضروریات سے بھرپور" اس کائنات ارضی میں موجود نہ ہو۔ ان صاف و صریح ارشادات کے باوجود ان نعمتوں سے مستفید نہ ہونا، یا اشیائے عالم کی تسخیر کو ایک کار عبث تصور کرنا محرومی نہیں تو پھر کیا ہے!

[2] اشیائے عالم کا اصل مسخر (تسخیر کرنے والا) جیسا کہ سابقہ حاشیہ میں صراحت کی جا چکی، خالق کائنات جل شانہٗ ہے۔ تمام موجودات پر اسی کا حکم اور اسی کی فرمانروائی چل رہی ہے۔ اس کے حکم سے ایک ذرہ بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس حیثیت سے سب اس کی قوت قاہرہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں (وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔ مگر چونکہ انسان بھی علمائے اسلام کی تصریح کے مطابق صفات خداوندی کا (بقیہ صلا پر)

کی قوت سے "باطنی نعمتوں" کو منظر عام پر لائے۔ یہ باطنی نعمتوں یا مادہ اور انرجی کے پوشیدہ حقائق کو منکشف کرنے کا "فارمولا" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مادہ کی توڑ پھوڑ" اور "انرجی" کے اصولوں کو کام میں لانے سے مختلف ایجادات و اکتشافات کی شکل میں "نعمتوں" کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جیسے بجلی اور بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر وغیرہ بہت سی تمدنی ضروریات۔ اسی طرح فن زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشینیں اور کیمیاوی کھادیں۔ طب جدید میں استعمال ہونے والے آلات، مشینیں اور ادویات[1] اور سب سے زیادہ مفید

(بقیہ حاشیہ صـ۲) مظہر ہے، اس لیے وہ بھی ایک خاص دائرہ میں حاکم و مختار ہے جس طرح کہ سمیع و بصیر ہونا صفات الٰہی ہیں، مگر انسان بھی ایک خاص حد کے اندر سمیع و بصیر ہے جیسا کہ قرآن کریم کے بے شمار مقامات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا موجودات عالم کا اصل مسخر باری تعالیٰ جل شانہ، ہے مگر مجازاً انسان کو بھی مسخرِ موجودات کہا جا سکتا ہے اور ان دونوں میں کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔

مگر میں نے اس موقع پر "علم تسخیر" کو ٹکنالوجی کے معنی میں بطور ایک نئی اصطلاح استعمال کیا ہے۔ تاکہ جدید علوم و فنون اور موجودہ پسماندہ مسلمانوں کے درمیان حائل شدہ خلیجوں کو پاٹا جا سکے اور ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے انھیں جدید علوم و فنون سے قریب کر کے انھیں وسیع تر کار خلافت کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس سے بہتر قرآنی اصطلاح موجود نہیں ہے۔

[1] زراعت کی ترقی سے ہماری غذائی ضروریات — ہمارے جسمانی نشوونما کے لیے — پوری ہوتی ہیں تو فن طب کی ترقی سے ہماری جسمانی صحت درست ہوتی ہے اور نقل و حرکت کی سہولتوں سے ہمارے جسم کو راحت پہنچتی ہے اور مشقتوں کا احساس کم سے کم ہونے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے آج یہ تمام چیزیں ہماری بنیادی تمدنی ضروریات میں شمار ہونے لگی ہیں اور ان کے بغیر زندگی کا تصور ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اور حیرت انگیز ترقی شاید طبیعیات اور علم کیمیا کی ترقی کی بدولت عمل میں آسکی ہے۔
اس وقت دنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں، چاہے وہ مشینوں کی تیاری سے متعلق
ہوں یا ادویات کی کھادوں کی تیاری سے متعلق ہوں یا دیگر مصنوعات کی، سب میں
بنیادی طور پر ان دونوں کا اصل دخل ہے۔ صرف اکیلے پٹرولیم ہی سے اس وقت دنیا میں
ہزاروں کیمیاوی صنعتیں چل رہی ہیں جیسے موم، مصنوعی ربڑ، وارنش، الکوحل، پلاسٹک،
خوشبویات، مصنوعی ریشے اور دھماکہ خیز مادے وغیرہ[1] اسی طرح لوہے اور فولاد کی
ہزاروں صنعتیں، الکٹرانکس آلات کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں اور ربڑ کی
ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ یہی حال دیگر چیزوں کا بھی ہے کہ ہر ایک مادہ یا چیز (اسم)
سے سیکڑوں ہزاروں چیزیں تیار ہو رہی ہیں۔ تمدن جدید میں لوہے کی مصنوعات اور الکٹرانک
آلات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ اگر موجودہ تمدن سے صرف دو چیزوں کو
ہٹا دیا جائے تو شاید اس کے ڈانڈے قدیم تمدن سے مل جائیں۔

صنعت و ٹکنالوجی اور قوموں کا عروج و زوال

ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشیاتی نقطۂ نظر سے غور کیجئے کہ یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں! قوموں کی ترقی اور ان کی
خوشحالی کا دار و مدار ان صنعتوں پر کتنا ہے! اس وقت روئے زمین پر ہزاروں نہیں
لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دنیا کی قوموں میں ان کے درمیان سخت مقابلہ چل رہا ہے۔
کروڑوں آدمی مختلف مصنوعات کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور انسانی تمدن دن بدن
ترقی کرتا جا رہا ہے[2] آج قوموں کی زندگی صنعتوں سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اور جو قوم

---

[1] عربوں سے سستا تیل حاصل کر کے مغربی قومیں محض اپنی فنی جانکاری ـــــ علم اسماء اور علم تسخیر میں مہارت ـــــ کی بدولت اس سستے تیل سے مختلف کیمیاوی مصنوعات تیار کرتی اور خوب نفع کماتی ہیں۔

[2] اور دوسری حیثیت سے فوجی و عسکری میدان میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہو رہی ہے اور سخت مقابلہ چل رہا ہے۔

"بے صنعت ہے وہ گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو دنیا کے اسٹیج پر زیادہ دنوں تک ٹھہر نہیں سکتی[1] کیونکہ یہ سرزمین "زور آوروں" کا مسکن و ماویٰ ہے۔ یہاں جو کمزوری دکھائے گا وہ قانون قدرت کے مطابق پیس کر رکھ دیا جائے گا۔ جیسا کہ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

خلاقِ فطرت نے یوم ازل ہی میں تمام مظاہر کائنات کے چند قوانین وضوابط مقرر کیے پھر ان مظاہر کا علم انسان کو عطا فرمایا کہ وہ ان مادی قوانین وضوابط سے آگاہی حاصل کر کے موجودات عالم سے فائدہ اٹھائے جس کے باعث "نئی نئی نعمتیں" ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جن کا تذکرہ " وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً " (اور اس نے تم پر اپنی کھلی و پوشیدہ تمام نعمتیں پوری کر دیں) نیز وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا" (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے) میں کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو قوم ان علوم سے واقف ہو گی اور منشائے خداوندی کے مطابق موجودات عالم کی تسخیر کرے گی وہی خلافت ارض کی اصل مستحق بنے گی۔ حصول خلافت کے لیے تسخیر موجودات ضروری ہے۔ اور تسخیر موجودات کی کنجی علم اسماء ہے۔ لہٰذا علم اسماء (سائنسی علوم) خلافت ارض کا پہلا باب اور اس کا اولین زینہ ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو قوم اس باب میں پیچھے رہ جائے وہ "منصب امامت" سے بطور سزا معزول کر دی جاتی ہے یعنی دوسروں کی غلام یا دست نگر اور حاشیہ بردار بنا دی جاتی ہے کیونکہ قانون فطرت اور قانون خداوندی کے مطابق اس دنیا میں کاہلوں کا کوئی کام نہیں رہتا۔

---

[1] یہ کلیہ آج ایک بین الاقوامی صداقت کے روپ میں نظر آرہا ہے۔

ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ زندہ قوموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیں، ورنہ وہ کاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دی جائیں گی یا ان کو تاریخ کے "عجائب خانوں" کے حوالے کردیا جائے گا گویا کہ وہ مردہ قومیں ہیں اور ان کا مقام دنیا کے اسٹیج کے بجائے میوزیم ہی زیادہ مناسب ہو سکتا ہے۔

علوم عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سری نگر (کشمیر)

(قسط دوم)

فلسفۂ یونان اور اس کے مقلدین پر تنقید | علامہ انور شاہ کو فلسفۂ یونان پر وسیع نظر تھی۔ اس کا اندازہ ان کے تنقیدی اشاروں سے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ماہر فن کی طرح تبصرہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ ابن رشد اور بوعلی سینا کے بارے میں کہتے ہیں:

وابن رشد هذا احذق عندی من ابن سینا ویفهم کلام ارسطو ازید منه[1]	میرے نزدیک ابن رشد ہی بوعلی سینا سے زیادہ ماہر ہے وہ ارسطو کا کلام بھی اس سے اچھا اور زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

علامہ کشمیری فلسفۂ یونان سے علماء اسلام کی کتابوں۔۔۔۔ کے توسط سے واقف ہو گئے تھے۔ انھوں نے علامہ ابن تیمیہ، امام غزالی، ابن رشد، امام ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، ابن سینا، صدر شیرازی، محمد باقر، جلال الدین دوانی اور ہندوستان کے بلند پایہ حکماء اور متکلمین کی کتابوں کا بغائر مطالعہ کیا تھا۔ ان سب کے علوم اور افادات ان کے رسائل اور امالی میں ملتے ہیں۔

علامہ کشمیری ارسطو، افلاطون اور دوسرے فلاسفۂ یونان کی پھیلی ہوئی منطق سے

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری: ج ۱ ص ۱۶۶۔

کچھ زیادہ متاثر معلوم نہیں ہوتے۔ وہ ان کے خود ساختہ عقول اور افلاک کو ان کی ذہنی عیاشی سمجھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ کے بارے میں پروفیسر محمد ابوزہرہ نے لکھا ہے:

فانه ليس بفيلسوف، هو الذی
يهيم فی احلام الفلاسفة وتأملاتهم
... واخيلتهم بل انه كل من
يقرر الحقائق ويناضل عنها بعقل
متأملٍ مدرك عميق بعيد الغور
فی الفروض والتقديرات هو ايضاً
فيلسوف وان كان يتكلم بالحقائق
الدينية المقررة وينطق باحكام
القرآن واحاديث الرسول صلی الله
عليه وسلم محررة ثابتة[1]

وہ ایسے فلسفی نہیں ہیں جو فلاسفہ کے
خواب وخیالات میں حیران وسرگرداں پھرتا
ہو۔ بلکہ وہ فلسفی ہیں جن کے سامنے پہلے طے
شدہ حقائق ہوتے ہیں اور پھر اپنی گہری اور
رسا عقل وفکر سے ان کی مدافعت کرتے
ہیں۔ ... مفروضات میں وقت ضائع کرنے
اور اوہام وظنون میں غور وفکر کرنے سے
دور رہتے ہیں۔ وہ مقررہ دینی حقائق ثابت
وقائم دینی احکام اور مقدس ومطہر احادیث
رسولؐ پر گفتگو فرماتے ہیں۔

یہی حال علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بھی ہے۔ ان کے دلائل ومباحث اپنی لطافت وندرت میں وہی قیمت رکھتے ہیں جو ذی شان ائمۂ متکلمین کے افکار وآراء کو حاصل ہے۔ ایک جگہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ میں ابن سینا اور فارابی کے خیالات پوری قوت کے ساتھ رد کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ تنبیہ کرتے ہیں:

كن علی بصيرة وفطنة ولا يغرنك
خضراء الدمنة وهكذا احال جميع
مزخرفاتهم وخزعبلاتهم اذا

تمہیں فکر وبصیرت سے کام لینا چاہیے۔
ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوڑا کرکٹ کی سبزی دھوکے
میں ڈال دے۔ فلاسفہ کی ساری ذہنی

[1] ابن تیمیہ : حیاته وعصره : ص ۲۷۔

امعن فیها النظر وغاص فیها الفکر استبان عوارها. فان تدهشك تعبیرا تهم الهائلة ولا تعجبك اطلاقاتهم الرائقة وما ذاك الا کالحادی لیس له بعیر وجعجعة من غیر طحین[1]

عیاشیوں اور چمک دمک کا یہی حال ہے جب گہری نظر سے انھیں دیکھا جائے اور ان پراچھی طرح غور کیا جائے تو ان کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آئے گا اس لیے تمہیں ان کی حیرت انگیز تعبیرات اور خوشنما اطلاقات مدہوش نہ کریں۔ ان کی مثال ایسے حُدی خواں کی ہے جس کے کوئی اونٹ نہیں ہے یا چکی کے شور و غوغا کی، جس سے آٹا نہیں نکلتا ہے۔

ایک اور جگہ عالم کے حدوث وقدم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ یونان اور ان فلاسفۂ اسلام کو جنھوں نے آنکھیں بند کر کے یونان کے ملحدانہ افکار اپنائے تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" حافظ ابن تیمیہ رح نقل کرتے ہیں کہ قدیم فلاسفہ میں سے بھی کوئی فلسفی عالم کے قدیم ہونے کا قائل نہیں تھا اور خود افلاطون بھی انہی میں سے تھا۔ اس کے بعد ارسطو آیا تو اس نے قِدَم عالم کا مذہب اختیار کیا۔ یہ باطل ہے اور اسلام میں اس کا قائل کافر ہے۔ تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ عالَم حادث ہے۔ ان بعض صوفیہ کی طرف بعض چیزوں کا قِدَم منسوب کیا جاتا ہے، جیسے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف۔ اگرچہ امام عبدالوہاب شعرانی رح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ انتساب شیخ اکبر پر افتراء ہے مگر میرے نزدیک یہ افتراء نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مسائل شیخ اکبر کے تفردات میں ضرور

---

[1] نفحة العنبر من هدی الشیخ الانور : علامہ یوسف بنوری : ص ۱۳۱۔ ۱۳۲

ہیں۔ بحرالعلوم (مولانا عبدالعلی) نے بھی چند باتوں کو شیخ اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ انتساب صحیح ہے۔ ہاں، جلال الدین دوانی نے حافظ ابن تیمیہ کی طرف عرش [illegible] قدیم ہونا منسوب کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں چند اشعار بھی نظم کیے ہیں جو حافظ ابن قیم کے قصیدۂ نونیہ کے وزن پر ہیں اور اسی سے ملائے ہیں[1]

ابن سینا پر تنقید | اس کے بعد علامہ کشمیری نے اپنے یہ اشعار پیش کیے ہیں جن میں ایک جگہ بو علی سینا پر اس طرح برستے ہیں:

لسنا نقول کما یقول الملحد ..... الزندیق صاحب منطق یونان

بدوام ھذا العالم المشھود والارواح فی ازل ولیس بفان

فھو ابن سینا القرمطی العدا مری شرك الردی وشرطیة الشیطان[2]

یعنی ہم وہ بات نہیں کہہ سکتے جو اس ملحد و زندیق یونانی منطق کے پجاری نے کہی ہے وہ یہ کہ عالم مشہود اور عالم ارواح قدیم اور ازلی ہے اور یہ کہ یہ غیر فانی ہیں۔ میری مراد ابن سینا قرمطی سے ہے جو شرک کا زبون اور شیطان کی سواری ہے۔

حضرت علامہ محمد انور شاہؒ نے بو علی سینا کے ملحدانہ خیالات پر جو تنقید کی ہے اس میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ ان سے قبل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے "الرد علی المنطقیین" میں اسے ملحد اور زندیق کہا ہے بلکہ ان سے قبل امام غزالیؒ نے بھی ابن سینا کی تکفیر کی ہے[3]

---

[1] فیض الباری: ج ۱ ص ۱۶۶ [2] ایضاً

[3] الاخلاق عند الغزالی: ذکی مبارک، التجاریۃ الکبریٰ، مصر: ص ۷۵ = ذکی مبارک نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تکفیر پر ایسا غم و غصہ ظاہر کیا ہے کہ امام صاحب کی شان میں سخت بد دینی سے بھی باز نہ رہا ہے۔ چونکہ دین کا درد، حدودِ شرع کی رعایت (ص ۲۹۰ پر)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"امام غزالی تکفیر او می نماید و الحق کہ اصولِ فلسفی او منافی اصولِ اسلام است"[۵۱]

فلسفۂ یاریۂ اور سفسطۂ متروکہ کو چھوڑ کر جہاں طب یا علم النفس سے متعلق کسی مسئلہ کی تحقیق کرنا ہوتی ہے تو اس وقت علامہ کشمیری، شیخ الرئیس کے اقوال و تحقیقات کو بطور حجت پیش کرتے ہیں اور وہاں اخذ و استفادے میں مذہبی حمیت کبھی ان کے سامنے حائل نہیں ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے رسائل و امالی پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہاں

(بقیہ حاشیہ ص۳۵۴) حفاظت، اسلامی عقائد و آداب کی نگہبانی اور جذبۂ احیائے ملت وہ باتیں ہیں جن سے مستغربین کو کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اس لیے ایسے لوگوں سے مذہب و ملت کے حق میں خیر خواہی کی امید رکھنا عبث ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ، جو خود قدیم و جدید فلسفے کے مغز تھے، جگہ جگہ بوعلی سینا سے چوکنا رہنے کی تلقین کرتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

(۱) یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر — ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

(۲) عروقِ مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

(۳) بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت

(۴) بوعلی دانندۂ آب و گل است — بے خبر از خستگیہائے دل است

(۵) ایک نظم "ایک فلسفہ زدہ امیر زادہ" کو خاقانی کے ان اشعار پر ختم کیا ہے۔

دل در سخن محمدی بند — اے پورِ علی ز بوعلی چند

چوں دیدہ را بیں ندارد — قائدِ قرشی بہ از بخاری

۵۱ مکتوبات: دفتر اوّل، مکتوب ۲۴۵، نور کمپنی پاکستان۔

ایک مثال پیش کی جاتی ہے، علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں:

"روح، نسمہ، نفس اور ذرا ایک ہی چیز کے مختلف نام نہیں ہیں بلکہ یہ اپنی ماہیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہیں۔ ذرا اگرچہ روح کے ساتھ قربت رکھتا ہے مگر اس کا اطلاق جسم پر بھی ہوتا ہے۔ بوعلی سینا نے بھی اس کا فرق ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے روح کا ترجمہ رواں اور حیوان کا ترجمہ جان سے کیا ہے۔"[1]

عصری علوم سے استفادہ | علامہ انور شاہ کشمیری نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ موجودہ سائنس ہی اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ وہ خود بہت سے مسائل جدید تحقیقات کی روشنی میں حل کرتے ہیں ہم چند مثالیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

رؤیا کی حقیقت | خواب کے بارے میں قرآن اور احادیثِ صریحہ میں بہت کچھ مذکور ہے۔ سورۂ یوسف میں تین قسم کے خوابوں کا ذکر ہے:-

(۱) منام (۲) رؤیا (۳) اضغاثُ احلام

فلاسفہ اور متکلمینِ اسلام نے خواب کی حقیقت و نوعیت پر بہت کچھ لکھا ہے اسی طرح جدید تحقیقات نے بھی خواب Dream کے بارے میں بہت سی نئی باتیں دریافت کی ہیں۔ نفسیات کے مشہور فاضل سگمنڈ فرائڈ S. Freud نے تعبیر خواب The Interpretation Dream کے نام سے جو کتاب لکھی اس نے لوگوں کو خوابوں کی ایک نئی دنیا سے روشناس کیا۔ علامہ محمد انور شاہؒ ایک حدیثِ قدسی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن میں جو رؤیا مذکور ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ یہ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ یعنی وہ حالت جسے نہ کامل نیند

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۔

کہا جا سکتا ہے اور نہ کامل بیداری۔ فرماتے ہیں کہ یہ میری ذاتی تحقیق تھی۔ اس کے بعد میں نے فرید وجدی کی دائرۃ المعارف کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ اہل یورپ کی تحقیق بھی یہی ہے:

ان الرؤیا لیس بنوم ولا یقظۃ کما	رؤیا کے بارے میں ایک عرصہ پہلے میری یہ
کنت حققت فی سالف من الزمان	تحقیق تھی کہ یہ نہ نیند کا عالم ہے اور نہ بیداری
بل ھی حالۃ متوسطۃ بینھما ولذا	کا، بلکہ یہ ان دو کی درمیانی حالت کا نام ہے۔
لا تزال تتسلسل ولا تنقطع الا بالنوم	یہ حالت تب تک بدستور قائم رہتی ہے جب تک
الغرق او الیقظۃ ثم اطلعت	کامل نیند یا کامل بیداری اس کو منقطع نہ کر دے۔
بعد زمن طویل علی دائرۃ المعارف	یہ میری ذاتی تحقیق تھی۔ پھر اس کے طویل مدت
لفرید وجدی فرأیت فیھا	بعد میری نظر فرید وجدی کی دائرۃ المعارف
تحقیق اھل اوربا الاٰن بعین	پر پڑی اور دیکھا کہ یورپ کے محققین کی تحقیق
ما کنت حققتہ سابقاً[۱]	بھی یہی ہے۔ اس طرح اس مسئلہ کے بارے میں
	میری جو ذاتی رائے قائم ہوئی تھی اب آج
	آنکھوں سے پڑھ کر اس کی تائید ہوئی۔

جمادات بھی شعور رکھتے ہیں جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کائنات کی ہر چیز شعور "Consciousness" رکھتی ہے۔ اب بے حس مادہ قبول کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ علامہ محمد انور شاہ فرماتے ہیں کہ احادیث کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ جمادات کو بھی شعور حاصل ہے۔ ایک حدیث ھذا اجبل یحبنا کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا احد پہاڑ کو جنتی اور عیر پہاڑ کو جہنمی کہنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[۲]۔ آگے

---

[۱] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۱-۲۲۔

[۲] فیض الباری ج ۳ ص ۴۳۔

فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے جمدان پہاڑ، جو مکہ میں واقع ہے، پر چلتے ہوئے فرمایا: سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْن ۔ اس پر میں متفکر ہوا کہ ایک بے حس پہاڑ کے پاس حضورؐ نے یہ کیوں فرمایا۔ پھر میں نے سمہودی کی وفاء الوفا میں دیکھا کہ یہاں آپؐ کا اشارہ کسی شاعر کے اس شعر کی طرف تھا[1]

وَ قَبْلَنَا سَبَّحَ جُوْدِيٌّ وَّالْجُمُدُ

صلصلۃ الجرس احادیث میں وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس میں وحی کی ایک قسم کو گھنٹے کی آواز کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ یورپ کے بازیگروں نے "صرع" کا افسانہ اسی پر کھڑا کیا[2]۔ اگرچہ بعد میں خود ہی اس افسانے کو دفن بھی کیا[3]۔ علمائے اسلام نے صلصلۃ الجرس کی مختلف شرحیں لکھی ہیں۔ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مختصر الفاظ میں اسے ٹیلیگراف کی گھڑگھڑاہٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

صلصلة الجرس ههنا كنقر اط التلغراف لأداء الرسالة[4]

وجہ شبہ اس قدر واضح ہے کہ صلصلۃ الجرس سمجھنے میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

قوتِ باصرہ کی حقیقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا: میں تمہیں نماز کی حالت میں ہونے کے باوجود اپنے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ رسول اللہؐ کا معجزہ تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ فلسفۂ جدیدہ میں

---

[1] فیض الباری، ج ۳ ص ۴۴۔

[2] The age of Faiath: Will Durant = P.164

[3] Mohammad: Margowiouth = P. 45

[4] مشکلات القرآن: علامہ محمد انور شاہ کشمیری، مجلس علمی ڈابھیل: ص ۱۲۴۔

اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قوت باصرہ جسم کے تمام اعضار میں موجود ہے[1]

واضح رہے متقدمین مسلمان سائنسدانوں میں ابن الہیثم نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ دراصل آنکھ نہیں دیکھتی ہے بلکہ دماغ دیکھتا ہے۔ بصریات میں ابن الہیثم نے جو تحقیقات پیش کی ہیں فضلاءِ یورپ نے عصر حاضر میں اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا یہاں تک کہ ان کی کاوشِ فکر کو سائنس کا ایک جزو ہی بنا دیا[2]

ایتھر یا جوہر بسیط | علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: قدیم فلاسفہ کے نزدیک فضا میں جو کچھ پھیلا ہوا ہے وہ جوہر بسیط ہے۔ مگر جدید تحقیقات نے اسے غلط ثابت کیا۔ جدید فلاسفہ یعنی سائنسدان فضائے بسیط میں اس پھیلے ہوئے مادہ کو ایتھر Eather کہتے ہیں، اسی ایتھر کو پہلے عمار کہا جاتا تھا[3]

ایتھر کے بارے میں یہ علامہ کشمیریؒ کا جدید رجحان ہوا، اب عرفاء کے مکاشفات کے ساتھ اسے اس طرح ملایا کہ اللہ نے اسی عمار سے نور محمدی ظاہر فرمایا۔ ضرب الخاتم کا پہلا شعر ہے:

تعالیٰ الذی کان ولم یک ماسوی

واوّل ما جلّی العماءَ بمصطفیٰ[4]

اس شعر میں صنعتِ ایہام ہے۔

علوم جدیدہ ہی اسلام کے قریب ہے | مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ

---

[1] فیض الباری۔

[2] عبقریۃ العرب: عمر فرّوخ: ص ۴۳۔ ۴۴، المکتبۃ العلمیہ، بیروت ۱۹۵۲ء

[3] فیض الباری

[4] ضرب الخاتم علی حدوث العالم، علامہ محمد انور شاہ: ص ۲ دیوبند ۱۹۲۶ء

کشمیریؒ کس طرح قدیم و جدید کے ڈانڈے ملانے کی کوشش کرتے تھے اور اسلام کے عقائد یا فوق الفطری امور کی صحت و واقعیت سمجھانے کے لیے کس طرح عصر حاضر کی علمی تحقیقات اور انکشافات سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو بتلایا تھا کہ پرانے فرسودہ فلسفہ کے برعکس موجودہ سائنس ہی اسلام سے میل کھاتا ہے۔

مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری (صاحب انوار الباری) لکھتے ہیں کہ ایک بار شاہ صاحب سے یہی بات پوچھی گئی کہ آیا فلسفۂ قدیم ہی اسلام سے قربت رکھتا ہے یا جدید عصری معلومات و تحقیقات۔ اس پر انھوں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ علوم جدیدہ ہی اسلام سے قربت رکھتے ہیں[1] علامہ کشمیریؒ جیسے دینی عالم کا یہ ملفوظ جب شائع ہوا تو بڑے بڑے اصحاب فکر و بصیرت نے علامہ کشمیریؒ کی ربانی بصیرت کا اعتراف کیا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے، جو قدیم و جدید اور دینی و دنیوی علوم کے شناسا و شناور تھے "صدق جدید" میں اس ملفوظ پر یہ رائے ظاہر کی:

> "بات ہے صاف اور کھلی ہوئی، لیکن صدیوں کے تعصب اور مذاق قدیم کی پاسداری نے پردے بھی ایسے تہہ بر تہہ ڈال دیے کہ اس حقیقت تک رسائی کے لیے ضرور انور شاہ ہی جیسے علامۂ وقت کی بصیرتِ ربانی کی پڑی۔ کاش ان کے اس قسم کے ملفوظات کی اشاعت اسی وقت ہوگئی ہوتی، اس سے بے زبانوں کی بھی زبان ہو جاتی اور ان سے متاخر نسل میں کم سے کم مولانا احسن گیلانی جیسے فاضل یگانہ تو اسی کے سہارے بہت کچھ لکھ ڈالتے"[2]

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی کتابوں میں ایک عجیب و غریب خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں ربانی علماء جیسے مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، حضرت

---

[1] نفحۃ العنبر ص ۵ [2] صدق جدید ۲۹ جنوری ۱۹۶۱ء

مجدد الف ثانی وغیرہم کے علوم وافادات کے پہلو بہ پہلو فضلائے یورپ کی جدید تحقیقات بھی نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے کبار صوفیاء نے جو حقائق بیان کیے ہیں طبیعیات کی جدید تحقیقات نے ان میں سے بہت سی باتیں قابلِ فہم بنادی ہیں اور علامہ کشمیریؒ نے اپنے کتب ورسائل میں اس طرح کی بہت سی باتیں پیش بھی کی ہیں۔ یہ خوبی راقم کو علامہ کشمیری کے معاصرین میں کسی اور عالمِ دین کی کتاب میں نظر نہیں آئی۔ ہم حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ سے بے خبر نہیں ہیں مگر ان کی "الکلام" صرف فلاسفہ اور متکلمین کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ سوانح مولانا روم کے آخری اوراق میں یہ خصوصیت ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں بھی بصیرت سے زیادہ مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر علامہ کشمیری کا یہ عمل اس لحاظ سے اور بھی قابلِ غور بن جاتا ہے کہ ان کا تعلق پرانے طرز کے علماء اور قدیم دینی حلقے سے تھا۔ اس حلقے کو قدیم ذوق کی سخت پاسداری تھی اور اس سے ایک قدم باہر نکالنا سخت مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا[۵] مگر علامہ محمد انور شاہؒ اس حلقے کے

---

[۵] حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"امام فخر الدین رازی اور علامہ مسعود بن عمر تفتازانی (م ۷۹۱ھ) کو عموماً طلبہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان نام بردہ حضرات کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ شیخ الہند اگر کسی مسئلہ میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو یہ بھی فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلے میں یوں ہے۔ طلبہ سمجھتے کہ یہ محققین ان حضرات سے بھی کوئی متقدم ہستیاں ہوں گی۔ مگر میں ایک عرصے کے بعد منتقل ہوا کہ محققین سے مراد مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے اساتذۂ کرام اور مشائخ عظام ہیں جو شاہ ولی اللہ پر ختم ہوجاتے ہیں۔"

دیکھیے: "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" مکتبۃ الفرقان بریلی ۱۹۵۹ء۔

علماء میں پہلے ایسے عالم نکلے جنھوں نے سلف و خلف کا احترام ملحوظ رکھ کر علمی مباحث و مسائل میں جمود و تعطل پر کاری ضرب لگادی۔ انھوں نے علم کو زمان و مکان کی بندشوں میں محصور نہیں سمجھا بلکہ ہر جگہ اور ہر دور کے علم سے بقدر ظرف استفادہ کیا۔ غرض علامہ انور شاہ بہت سے مسائل کو عرفاء کے افادات کی روشنی میں اس طرح حل کرتے ہیں کہ جدید تحقیقات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کمال ہمیں علامہ اقبال کے خطبات میں ضرور نظر آتا ہے۔ ان میں ایک طرف ہم برکلے، نطشے، آئن اشٹائن اور برگسون کے افکار و خیالات دیکھتے ہیں اور ان کے دوش بدوش رومی، ابن عربی، عراقی، محمود پارسا اور شیخ احمد سرہندی وغیرہ کے تجربات و مشاہدات بھی پاتے ہیں۔ ان خطبات میں پانچواں خطبہ "The spirit of Islamic culture" اس لحاظ سے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل اشعار پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہیں ان سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ کشمیریؒ علوم جدیدہ سے کس قدر متاثر تھے:

فسبحانہٗ من برھانہ کل اٰیۃٍ　　　وفی کل شانٍ منہٗ شأن قد اختفیٰ

یہ سارا کائنات وجود باری کی دلیل ہے اور ہر نشانی اور ہر حالت' اللہ کی مخفی شان ہی کا ظہور ما و راسکے وجود کی دلیل ہے۔

فذلک اعجاز وخرق لعادۃ　　　وان کان کل الکون اعجاز منتھیٰ

پس یہاں کی ایک ایک نشانی اور ایک ایک حالت ایک مستقل معجزہ اور خرق عادت ہے بلکہ بالآخر یہ ساری کائنات ایک معجزہ اور سر چکرا دینے والی چیز ہے۔

وقد قیل ان المعجزات تقدم　　　بما یرتقی فیہ الخلیفۃ فی مدیٰ

یعنی: پیغمبروں نے جو معجزات پیش کیے وہ دراصل آنے والی نسلوں کو عقلی و فکری ترقی کے لیے بمنزلۂ تمہید تھے۔

یکاشف ایضاً عن یدا فی ستارۃ من الخلق تعریفاً بہ من قد اجتبیٰ

یعنی: وہ مخلوق اور کائنات سے پردے ہٹاتا ہے تاکہ انسان کو اس کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کرے جس کے لیے اسے چناگیا ہے اور جس کے لیے اسے خلافت و نیابت عطا کی گئی ہے۔

فان قیل بین الرّوح فی الطب والحجیٰ تناسب الاٰن فقد یکتفی کذا

یعنی: اگر کہا جائے کہ طب میں روح اور فکر کے درمیان تناسب اور تعلق ہے تو یہ اطمینان بخش اور قابل قبول ہے۔

یقال الیٰ حین استھاموا وما دروا علاقۃ بین الرّوح والفکر کیف ذا
بیولاجیا اضحیٰ کذلک محبطاً لتحریجھم سرّ الحیاۃ وما انجلی[۵۱]

یعنی آج تک سرگرداں ہوکر پوچھا کرتے تھے کہ روح اور فکر میں کیسے تعلق ہوتا ہے مگر اب بیالوجی (Biology) (علم الحیات) نے زندگی کے اس راز کو بھی فاش کردیا۔

زمان ومکان کا فلسفہ بیسویں صدی کی ابتداء میں سائنسی دنیا، بالخصوص طبیعیات میں کچھ ایسی تحقیقات وانکشافات منظر عام پر آئیں جن سے طبیعیات سے متعلق بہت سے قدیم نظریات میں بھونچال آیا۔[۵۲] ان نظریات میں نظریۂ زمان ومکان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رُو سے زمان اور مکان کو مستقل بالذات وجود حاصل نہیں ہے یہاں تک کہ اس نظریے کی رو سے زمان اور مکان کو دو وجود کی حیثیت سے قبول کرنا بھی غلط ہے بلکہ ان کا وجود ایک دوسرے پر قائم ہے اور بجائے "زمان اور مکان" لکھنے کے "زمان — مکان" کہنا ہی درست ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے (شاید علامہ اقبال کی تحریک پر) مسئلہ زمان ومکان پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

---

۵۱ ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم: علامہ کشمیری: ص ۳۰۲۔

۵۲ دیکھیے مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندوی؛ خصوصاً مقدمہ کتاب از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

بحث کی۔ اگرچہ انھوں نے فلاسفہ، متکلمین اور عرفائ، نیز عصر حاضر کے مسلّم الثبوت مصنفین کی کتابوں سے جگہ جگہ استفادہ کیا ہے مگر پرستش کسی مکتبِ فکر یا نظریے کی نہیں کی ہے۔ انھوں نے معیار بالآخر اپنے فہم کو بنایا ہے جو اسلامی روح سے آشنا اور علوم نبوت سے مستفید اور مستنیر تھا۔ ہم ان دو رسالوں سے چند فوائد بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

زمان کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا ہے علامہ انور شاہ محدث فرماتے ہیں:

فالزمانُ انما هو فی مطمورتنا	زمانہ صرف ہمارے حدود میں واقع ہے، ورنہ
لیس عند ربك صباح ولا مساء	اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صبح ہی ہے اور نہ شام۔
کما رُوِی ذلك عن ابن مسعود[1]	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ایسا ہی نقل ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ صدیوں قبل علامہ ابن قیم نے بھی اپنے مشہور قصیدۂ نونیہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

قال ابن مسعود کلاماً قد حکا	ہ الدارمیُّ عنه بلا نکران
ما عنده لیلٌ یکون ولا نهارٌ	قلت تحت الفلك یوجد ذان
نور السمٰوات العلیٰ من نوره	والارض کیف النجم والقمر ان
من نور وجه الرب جل جلاله	وکذا حکاهُ الحافظ الطبرانی[2]

ترجمہ: دارمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے غیر منکر روایت نقل کی ہے کہ اللہ کے ہاں نہ دن ہی ہے اور نہ رات ہی۔ ان کا وجود آسمان کے نیچے ہے۔ بلند آسمانوں کا نور اللہ ہی کا نور ہے۔ یہی حال زمین، چاند اور تاروں کا بھی ہے۔ ان کا نور بھی اللہ تعالیٰ ہی کا نور ہے۔

---

[1] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۴۔

[2] عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۱۲۔

جیساکہ حافظ طبرانی نے نقل کیا ہے۔

ایک اور مقام پر زمانے کے مستقل وجود کو موہوم قرار دیتے ہوئے علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ ہم جن واقعات پر اعتبار کرتے ہیں اور حالات و واقعات کو بزعم خود متعین کرتے ہیں وہ سب بے حقیقت ہے کیونکہ وقت یعنی زمانے کا وجود ہم سے قائم ہے، نہ یہ کہ ہم ہی وقت کے وجود سے قائم ہیں۔ وقت کا وجود وجود ذہنی ہے۔ ذہن سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے:

وتوهم امتداد الزمان، وما بني عليه كله توهم، لا اصل له ... وانما هو من ايغال الوهم لا غير... ... ووضع وقت للحين ونحوه من الاوقات الموجودة قبله توهم ايضاً۔ انما الوقت بالحدوث في عالمنا۔ ولولم يكن في عالمنا لم يكن هو۔

زمانے کا پھیلاؤ ایک وہم ہے۔ اسے بنیاد بنا کر کسی چیز کو قائم کرنا، وہ بھی وہم ہی ہوگا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے بمحض وہم کا دھوکہ ہے۔ یہ بھی بالکل وہم ہے کہ موجودہ (یعنی متعلقہ) اوقات میں سے کسی وقت پر اعتبار کرکے عالم کے حدوث کا وقت مقرر کریں بے شک حدوث کا وقت ہمارے عالم ہی میں ہے اگر یہ ہمارے عالم میں نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔

ایسا اس لیے ہے کہ

هو بنا لا نحن به[1]

وقت کا وجود ہمارے وجود پر منحصر ہے نہ یہ کہ ہم اس کے وجود سے قائم ہیں۔

مختلف اجسام کے لیے مختلف نوعیت کے اوقات اور امکنہ ہیں۔	حضرت علامہ انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مکان اور زمان کی نوعیت ایک ہی نہیں ہے بلکہ مختلف

---

[1] مرقاۃ الطارم: ص ۴۔

ہستیوں کے لیے مختلف ہے مثلاً ھوا کے وقت کی نوعیت نور کے زمان ومکان کی نوعیت سے مختلف ہے اسی طرح روح کا زمان ومکان بھی دوسری نوعیت کا حامل ہے۔ تمام لطیف ہستیوں کا زمانہ اسی کے مطابق ہوگا اور عالم غیب میں جو چیز سب سے زیادہ مختصر ہوگی وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ طویل ہوگی۔ کسی چیز کو خیال میں لانے میں دو سال کی مدت درکار ہوتی ہے اور دوسری جگہ اسی چیز کے لیے ایک اشارہ کافی ہوتا ہے اس طرح صرف ایک چیز کے لیے دو مختلف مکان ٹھہرے:[1]

وقیل لجسمٍ اوھواءٍ ونورنا ۔ وروحٍ مکانٌ لا یقاسُ بما سوٰی

یعنی اجسام، ہوا، نور، روح وغیرہ کے لیے اپنا مخصوص "مکان" ہے جن کو ایک دوسرے پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

والابعد منہُ اقربُ غیرہٖ   فامکنۃٌ فیھا التفاوت قد سریٰ

کسی چیز کا بعید ترین مکان دوسرے کے لیے قریب ترین ہے اس طرح مختلف اور متفرق "مکان" کا سلسلہ چل رہا ہے۔

وکلّ لطیفٍ فالزمان لہٗ کذا   وَاقصرہٗ فی الغیب اطولنا مدیٰ

ہر لطیف ہستی کا ویسا ہی زمان ہوگا اور غیب میں جو چیز سب سے زیادہ مختصر ہوگی وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ طویل ہوگی۔

تخیّلُ امرٍ فی سنین ھنا لکم   سنینٌ وصیغٌ ھٰھنا موطنان ذا

ایک طرف کسی چیز کے تصور میں دو سال اور دوسری طرف اسی کے تصور میں ایک اشارہ درکار ہوتا ہے اس طرح ایک ہی چیز کے لیے دو مکان بن جاتے ہیں۔

کدھر ۹ | زمان ومکان کی بحث کے وقت اس مشہور حدیث پر نظر پڑتی ہے جس میں دھر کا

---

[1] ضرب الخاتم: ص ۱۳۔

بظاہر یہی خدا ہوتا نظر آتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تسبوا الدھر، فان اللہ ھو الدھر، یعنی زمانے کو گالیاں نہ دو بیشک زمانہ ہی خدا ہے علامہ اقبال کی ایک نظم "نوائے وقت" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث سے سخت متاثر تھے۔ انھوں نے اس نظم میں زمانے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہی قادر مطلق اور متصرفِ عالم نظر آتا ہے۔ زمانہ اس نظم میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہتا ہے:

خورشید بدامانم، انجم بگریبانم — در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
چنگیزی و تیموری مشتے ز غبارِ من — ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
پنہاں بہ ضمیرِ من صد عالمِ رعنا ہیں — صد کوکبِ غلطاں ہیں صد گنبدِ خضرا ہیں

یا مثلاً ایک اور نظم میں بھی مذکورہ بالا حدیثِ قدسی سے استفادہ کر کے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

زندگی از دھر، دھر از زندگی
لا تسبوا الدھر فرمانِ نبی ست

مگر اس قسم کے اشعار کو بنیاد بنا کر علامہ اقبال کو دہری قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ان کے ہاں وقت، زمانہ، زندگی، عصر، دہر کے مختلف معنیٰ ہیں۔ اس کے علاوہ دہر کو صوفیۂ کرام کے ہاں علیحدہ مفہوم و معنی بھی ہے۔ علامہ اقبال اپنے انگریزی خطبات کے پانچویں لیکچر The Conception of God and the Meaning of Prayer. میں لکھتے ہیں:

"محی الدین ابن عربی کے ہاں دہر اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ اسی طرح امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ کسی صوفی بزرگ نے انھیں "دہر" "دیہور" اور "دیہار" کی تکرار سکھایا تھا[1]"

(حاشیہ صفحہ ۳۲۲ پر)

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے ہاں بھی "دہر" کو (لغوی حیثیت سے نہیں) ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے ہاں تمام اجسام چاہے وہ لطیف ہوں یا کثیف کے زمان اور مکان ایک مقام پر دہر میں آکر مل جاتے ہیں:

الی ان یصیر الکل فی الدھر حاضراً فدھرٌ ودیھورٌ ودیھارٌ ن اعتلی[1]

یہاں دہر سے مراد وہی ہے جسے بعض اہل علم "سرمد" کہتے ہیں[2]

جہاں تک اس حدیث کے بارے میں علامہ کشمیری کے عقیدے کا تعلق ہے تو وہ وہی ہے جو متقدمین محدثین عظام کا رہا ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اس عالم میں جو کچھ ہے یہ صرف صفاتِ رب کے جلوے ہیں۔ یہاں کوئی چیز مستقل بالذات نہیں ہے:

اعلم ما من شیئٍ فی العالم بقضہ و قضیضہ الا ینتھی الی صفۃ من صفات اللہِ تعالیٰ ولیس فیہ شیئٌ مستقل[3]	جاننا چاہیے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب بالآخر اللہ کی صفات میں سے ایک صفت پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ یہاں کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔

زمان اور مکان بھی اسی میں شامل ہیں یہ اللہ کے صفاتِ فعلیہ میں سے ایک صفت ہے[4]۔ ایک اور جگہ حافظ ابن حجرؒ کی اس حدیث کے بارے میں رائے کا خلاصہ درج کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو زمانے کے سب وشتم سے منع کرنے کا مدعا یہ

(حاشیہ صفحہ ۳۶۷) تشکیل الٰہیات جدیدہ (انگریزی): ص ۴۳، دہلی ۱۹۷۵ء

[1] ضرب الخاتم: ص ۱۳

[2] خود علامہ کشمیری نے بھی شعر کے حاشیہ پر لکھا ہے: "وقد اجاد فی دائرۃ المعارف للبستانی من السرمد" ص ۱۳

[3] مرقاۃ الطارم: ص ۴۔ [4] فیض الباری علیٰ صحیح البخاری ج ۱

تھا کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ زمانہ ہی فاعل حقیقی ہے۔ فاعل حقیقی تو اللہ ہی ہے جب لوگ آلام و مصائب کے نازل کرنے والے کو گالیاں دیں گے تو وہ فاعل حقیقی یعنی اللہ ہی کی طرف لوٹیں گی (معاذ اللہ)

قال الحافظ معنی النھی عن سب الدھر ان من اعتقد انہ الفاعل للمکروہ فسبّہ اخطاء فان اللہ ھو الفاعل۔ فاذا سببتم من انزل ذلک بکم رجع السب الی اللہ[1]

حافظ ابن حجر کے نزدیک سب وشتم سے روکنے کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص نے یہ اعتقاد رکھا کہ دہر ہی کروہات کا فاعل ہے پھر اسے گالی دی تو اس نے غلطی کی کیونکہ فاعل تو صرف اللہ ہے۔ اس لیے جب تم نازل کرنے والے کو گالیاں دوگے تو وہ خدا ہی کی طرف لوٹیں گی۔

وجود باری اور قیومیت | باری تعالیٰ کا وجود ثابت کرنے کے لیے فلاسفہ نے ایک بڑی دلیل علت اور معلول کی دی ہے وہ اس سلسلۂ علت ومعلول کو علۃ العِلَل پر ختم کرتے ہیں اور اسی کو خدا بھی ٹھہراتے ہیں۔ دوسری طرف بعض صوفیائے کرام ہیں انھوں نے اپنے مشاہدات اور روحانی تجربات کی روشنی میں وجودِ حق کے اثبات میں اپنی دلیلیں دی ہیں مگر دونوں طرف سے جو انکار و نظریات پیش ہوئے وہ قرآن کے پیش کیے ہوئے "اللہ" سے پوری طرح میل نہیں کھاتے، کہیں صفات وکمالات میں نقص نظر آتا ہے اور کہیں خالق ومخلوق عین اور متحد دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو رسالوں کا مرکزی مضمون یہی اثبات باری ہے انھوں نے اس بارے میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ جس خدا کا

---

[1] انوار المحمود شرح صحیح ابی داؤد ج ۲ ص ۵۶۸۔

وجود ثابت کیا جاتا ہے اس میں وہ سارے اوصاف وکمالات نظر آتے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ وہ فلاسفہ کے نظریہ کی طرح محض خانہ پری کا خدا نہیں ہے جس نے کائنات تو بنائی مگر اس سے غیر متعلق ہوا اور اب محض تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خالق کے ساتھ قیوم بھی ہے۔ علامہ محمد انور شاہ کے نزدیک صوفیۂ کبار کا فلسفۂ وحدۃ الوجود دراصل یہی فلسفۂ قیومیت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ولما کان وجود کلّ ممکن ومتعلقًا بہ استمسلہٗ وھو قیومہٗ لم یقدح فی نعت الاحدیۃ۔ ھو الاوّل والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئٍ علیم[۱]

یعنی جب عالم کا وجود ذاتِ واجب کے وجود سے قائم ہے تو اسی ذات نے اس کو تھام بھی لیا اس طرح وہ عالم کا قیوم بھی ہوا۔ اس کی قیومت سے اس کی صفتِ احدیت پر قدح وارد نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ اول وآخر اور ظاہر و باطن بھی خود ہی ہے وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اپنی ایک درسی تقریر میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

کذالک الوجود وتوابعہ من الکمالات والخیرات فی ای ممکن وجد فی ای مرتبۃ تحقق ھو وجود الباری عزّ اسمہٗ ملکًا لانّہٗ ھی کمالاتہ لیس للممکن منھا نصیب الّا القدر الذی للارض من نور الشمس۔ وھذا

اسی طرح وجود اور اس کے خیرات وکمالات کے مظاہر، چاہے وہ ممکنات میں سے کسی بھی ممکن میں پائے جائیں وہ اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے (کیونکہ خیر محض ہونے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے) ممکن (مخلوق) کے کمالات اللہ کے کمالات ہیں۔ ان میں اس کو صرف اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا زمین کو

---

[۱] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: ص ۷۔

مسئلة وحدة الوجود وتعدد الموجودات التى ذهب اليها المحققون ۔ ؎	آفتاب کی روشنی ہے۔ (یعنی جس طرح زمین کو اپنی روشنی نہیں ہے بلکہ اس کی روشنی کا دارومدار آفتاب کی روشنی پر ہے) وحدۃ الوجود اور تعدد موجودات جیسے مسائل، جنھیں بعض محققین نے اختیار کیا ہے کی بنیاد بھی یہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخلوق کا وجود عین وجود خالق ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خالق کو اپنے مخلوق کے ساتھ ایسا دائمی ربط و اتصال ہے جو اس سے کبھی بھی منفصل نہ ہو سکے۔ محیط و قیوم ہونا خدا کے لیے ضروری ہے کہ کائنات کا وجود اسی کے وجود پر منحصر ہے۔ ورنہ وہ خدا ہی کیا جس نے کائنات تو بنادی اور اب اس کے ساتھ بےتعلق رہتے ہوئے محض ایک تماشائی ہوا۔ اس طرح کا اعتقاد خدا کے لیے نقص اور عیب کا مستلزم ہے، جس سے وہ منزّہ اور پاک ہے۔ اسلام جس خدا کو خدا کہتا ہے وہ خالق ہونے کے ساتھ قیوم بھی ہے۔ اس کے وجود سے مخلوق کا وجود قائم ہے مگر خالق و مخلوق کا یہ ربط و اتصال ویسا بھی نہیں ہے جیسے بعض صوفیہ نے پانی اور بلبلہ یا دھاگے اور گرہ کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ بلکہ اس ربط میں عینیت کے ساتھ کمال درجے کی غیریت بھی ہے۔ علامہ کشمیری اسے ایک مثال سے سمجھاتے ہیں جس کو یہاں اس طرح پیش کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) کُرۂ شمس ــــ ذاتِ حق (۲) ــــ جرمِ شمس کا نور ــــــــــ وجودِ حق

(۳) شعاعِ شمس ــــ صفاتِ حق (۴) محلِ شعاع ــــ اعیانِ ثابتہ یا معلوماتِ حق

تفصیل یہ ہے کہ

؎ انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۵۴۹۔

کرۂ شمس کو بطور مثال ذاتِ حق کہا جائے آفتاب کے جرم میں جو نور ہے اسے وجودِ حق مانا جائے آفتاب کی شعاعوں کو صفاتِ حق اور ان شعاعوں کے مقام وقوع سے اعیانِ ثابتہ (یا اشیاء کون) مراد لیا جائے پس جس طرح کرنیں خارج میں اشیاء کائنات پر پڑتی ہیں اسی طرح اللہ کی تجلی اللہ کے معلومات (جو اعیانِ ثابتہ بھی کہلاتے ہیں) پر پڑتی ہے۔ اب جس طرح شعاع شمس عین جرم شمس نہیں ہے اسی طرح یہ معلومات حق بھی عین ذاتِ حق نہیں ہیں مگر ان میں جو ربط و اتصال ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ آئینے پر آفتاب کا جو عکس پڑتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عکس عین آفتاب ہے مگر اگر آفتاب کا وجود نہ ہوتا تو عکس بھی کہاں وجود میں آسکتا تھا[1]

علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ علت و معلول کے فلسفے سے خدا کا ازلی وجود ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے نت نئی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فلسفے کے بغیر بھی وجود باری ثابت ہوتا ہے، لکھتے ہیں:۔

ولیعلم ان التقدم الباری علی العالم لیس هو من تلقاء العلية فقط کما بنیٰ السید باقر المسألة علیه فاورد علیه منافشون ما اوردوا، انما هو نعت الشیٔ علیٰ حیاله من تلقاء الاحدية والفردية والوترية يقتضی تقدم العدم علیٰ العالم مرةً وبقی ذلك	جاننا چاہیے کہ عالم پر ذاتِ باری کا تقدم فقط علت و معلول کی بنا پر ہی نہیں ہے جیسا کہ سید باقر نے اس مسئلہ کی عمارت یہی اسی پر کھڑی کی ہے جس پر کرید نے والوں نے وہ اعتراضات کیے جو مخفی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تقدم اللہ کی ایک صفت و نعت ہے۔ یہ صفت باری تعالیٰ میں اس کے احد، فرد، وتر ہونے کی جانب سے ہے۔ یہی صفت عالم کے

---

[1] انوار المحمود ج ۲ ص ۵۴۹۔

الذات مستمرا بعد وجود العالم	اتنا ہی معدوم ہونے کے متقاضی ہے اور عالم
ایضاً اذ هو موصوف ابداً ابلغه	کے وجود میں آنے کے بعد باقی رہے گی۔
بعد العدم . ولا نظر الی من	کیونکہ وہ عالم ہمیشہ اس صفت سے متصف
هو داخل فی مطمورته بل النظر	ہے کہ یہ عدم کے بعد وجود میں آیا ہے دیکھنا
الی المجموع من حیث المجموع،	یہ نہیں ہے کہ اس گنجینۂ عالم میں داخل کون
استشعر به احد ولم یشعر۔	ہے بلکہ مجموع کو من حیث المجموع دیکھنا ہے۔
دریا بوجود خویش موجے دارد	کسی نے اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش تو کی ہے
خس پندارد کہ این کشاکش با اوست[۵]	مگر پھر بھی نہیں سمجھا ہے، جیسا کہ کہا ہے:

دریا اپنے وجود سے موجیں مارتا ہے مگر تیرنے والے تنکے کو گمان ہے کہ
اس کی کشاکش ذاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے چند افادات، جنھیں راقم نے اپنے مبلغ علم اور محدود فہم کے مطابق سمجھا، پیش کیے گئے۔ اصل میں علامہ انور شاہ کی تصانیف (امالی) جن میں ان کے دو رسالے (ضرب الخاتم اور مرقاۃ الطارم) زیادہ قدر و اہمیت کے حامل ہیں، میں عقلی علوم سے متعلق بہت سے افادات بکھرے ہوئے ہیں۔ ان افادات کو جمع کرنے اور پھر آسان اردو میں منتقل کرنے کی کافی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اس طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ وہ علامہ کشمیری کے خاص شاگرد اور علم و فضل میں بقول ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی "دین و دانش کے ماہر کامل" تھے۔ وہ یقیناً علامہ محدث کشمیریؒ کے ایک ایک افادے کو کتاب بنا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں نظریہ

---

۵ مرقاۃ الطارم: ص ۷۔

قیومیت[1] عنوان کے تحت وحدۃ الوجود پر نہایت دلآویز افکار و خیالات اور لطیف دلنفیس نکتے پیش کیے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے ماہرِ فن نے اعتراف کیا ہے۔

"مسئلۂ قیومیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ تازگیٔ فکر اور ندرتِ عنوان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے"[2]

اگرچہ حضرت مولانا گیلانیؒ نے اس بحث میں علامہ کشمیری سے استفادہ کرنے کا کوئی ذکر کتاب میں نہیں کیا ہے مگر اپنے ایک دوسرے مضمون میں وہ صاف لکھتے ہیں:

"خاکسار نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں اسی وحدۃ الوجود (مسئلۂ قیومیت) کے مسئلہ کی جو تشریح و تفصیل کی ہے سچی بات یہ ہے کہ بنیادی امور اس کے شاہ صاحب کی تقریر ہی سے ماخوذ ہیں"[3]

---

[1] الدین القیم: ص ۱۲۰ تا ۱۳۵ نفیس اکیڈمی کراچی۔

[2] ایضاً۔

[3] حیات انور: ص ۶۰، طبع اول دیوبند ۱۹۵۵ء۔

ایک مکتوب گرامی

مولانا زید ابوالحسن فاروقی صاحب

سعید احمد اکبرآبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم گرامی مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔

میں نے مجلہٗ برہان کے شمارہ نمبر ۵ جلد نمبر ۸۵ بابت ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق نومبر ۱۹۸۰ء میں آپ کا تبصرہ پڑھا، آپ نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حفظہٗ اللہ و بقاہ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم" پر دقیق نظر سے اچھا تبصرہ کیا ہے ۔ البتہ آخر میں آپ نے اظہار تعجب کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ۔

دوسری طرف جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے حضرت مجدد اس درجہ نرم اور متساہل ہیں کہ سجدۂ تعظیمی کو رخصت قرار دیتے ہیں (ص ۱۶۳ و ۳۲۶)

حضرت مجدد کے ارشاد گرامی کو جناب شیخ بدرالدین سرہندی نے کتاب "حضرات القدس" کے "الحضرۃ السابعۃ فی دفع الشکوک" کے اواخر میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے ۔

"دریں اثنا مردے دور از خداشناسی بہ سلطان گفت کہ دیدید تکبر ایں شیخ را کہ بر شما کہ ظل اللہ و خلیفۂ او تعالیٰ اید سجدہ نہ کرد بلکہ تواضع برسمے کہ با یک دیگر می کنند بجا نیاورد ۔ سلطان ازیں سخن بشورید و حکم بہ قید گوالیار نمود ۔ وقبل ازیں شاہزادۂ دیں پناہ شاہجہاں کہ با ایشاں اخلاص تمام داشت، علامی فہامی افضل خاں و خواجہ عبدالرحمٰن مفتی را با کتب فقہ پیش ایشاں فرستادہ بود کہ سجدۂ تحیت برائے سلاطین آمدہ

است، اگر شما سجدہ کنید ہیچ گزندے از بادشاہ بشما نہ خواہد رسید من ضامن و متعہدم شوم" ایشاں فرمودند کہ ایں رخصت است، عزیمت آن است کہ غیر حق را سجدہ نکنند"

آپ حضرت مجدد کے اس ارشاد گرامی کو دقیق نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت کا یہ ارشاد مطلق نہیں ہے کہ بلکہ اس کا تعلق ان احوال سے ہے جو حضرت کو پیش آئے تھے اور شاہزادۂ دیں پناہ کو جس کا کھٹکا تھا کہ مخالفین حضرت کو سجدۂ تحیت نہ کرنے کی وجہ سے قتل کرادیں گے۔ چونکہ جان بچانے کے لیے اس شخص کو جس کا قلب مطمئن ہو، غیر اللہ کو سجدہ کر لینا یا زبان سے کلمات کفر کہہ دینا جائز ہے۔ بنابریں شاہزادے نے علماء گرامی قدر کو کتابیں دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا، شاہزادے کو جو کھٹکا تھا وہ بے اساس نہ تھا، شیخ بدرالدین کی اس تحریر سے،

"دریں اثنا مردے دوراز خداشناسی بہ سلطانی گفت"

واقعے کی سنگینی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت مجدد نے جان کی بازی لگائی اور رخصت کو اختیار نہ کیا بلکہ " فَقَدْ صَدَعَ بِالْحَقِّ فَهَنِيئًا لَهُ " کے مصداق بنے۔

یہ عربی کا مبارک جملہ سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور واقعہ اس طرح پر ہے کہ مسیلمۂ کذاب نے دو افراد کو از صحابۂ کرام گرفتار کر لیا اور ان سے اپنی نبوت کا اقرار کرانا چاہا۔ ایک نے اقرار نہیں کیا اور اس نے شہادت کو ترجیح دی اور وہ قتل ہوا دوسرے نے جان بچانے کے لیے کہہ دیا اور وہ بچ گیا۔ اس واقعہ کی خبر جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا:

"اما الاول فقد اخذ برخصة الله تعالیٰ واما الثانی فقد صدع بالحق فهنیئا له"۔

پہلا شخص جان بچانے والے نے) اللہ کی رخصت پر عمل کیا، اور دوسرا حق پر جما رہا اور مبارک ہو اس کو یہ عمل۔

علماء اعلام نے حق پر قائم رہنے والے کے عمل کو عزیمت سے یاد کیا ہے۔ غالباً "اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" سے ان حضرات نے اس کا اخذ کیا ہوگا، کہ "یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے" اور ہو سکتا ہے کہ رخصت کی مناسبت سے اس کا استعمال کیا گیا ہو۔

سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ "مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ" کے بیان میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں تحریر فرمایا ہے:-

فقد اجمع العلماء علی انه من اکره علی الکفر اکراها ملجیا یجوزله ان یتلفظ بما اکره علیه مطمئنا قلبه بالایمان بهذه الآیة۔ ا ھ

ج ۵ ص ۳۷۷

علامہ سید آلوسی نے تفسیر روح المعانی کی ج ۴ ص ۷۴۴ میں لکھا ہے:

الآیة دلیل علی جواز التکلم بکلمة الکفر عند الاکراه وان کان الافضل ان یتجنب عن ذلك اعزازا للدین:

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن کی ۱۰۶ ص ۱۸۸ میں لکھا ہے:

اجمع العلماء علی من اکره علی الکفر فاختار القتل انه اعظم اجراً عند اللّٰه ممن اختار الرخصة۔

حضرت مجدد کے زمانے میں شیخ نظام تھانیسری مشہور مشائخ میں سے تھے، ان کے بعض خلفاء کو ان کے مرید سجدۂ تعظیم کیا کرتے تھے۔ جب یہ خبر حضرت مجدد کو پہنچی تو آپ نے شیخ نظام کو مکتوب ارسال کیا جو کہ دفتر اول کا مکتوب ۲۹ ہے، آپ نے اس فعل کی قباحت بیان کی ہے اور آخر میں تحریر فرمایا ہے:

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم　　　کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

یہ امر مسلم ہے کہ حضرت مجدد قدس سرہٗ ایک بشر تھے اور سہو و خطاء سے بشر خالی نہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کی کسی بات پر اعتراض کیا جائے۔ مع ہذا آپ نے جس امر کا ذکر کیا ہے، میری نظر میں حضرت مجدد نے اس امر میں اولوالعزم افراد کا کردار ادا کیا ہے۔ جان کی بازی لگادی اور سجدۂ تحیت بادشاہ کو نہ کیا۔ ان ذلک من عزم الامور۔

حضرت مجدد نے اس سجدۂ تحیت کو رخصت کہا ہے جو جان بچانے کے لیے کیا جائے۔ هذا ما أردت ان اقوله لفضیلتکم، وفقنا اللہ سبحانہ لما فیہ صلاح دیننا ودنیانا واٰخرتنا، والسلام

سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ　　　زید ابوالحسن فاروقی

۲۰ جنوری ۱۹۸۱ء　　　درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر، شاہ ابوالخیر مارگ۔ دہلی ۶

تبصرے

عیون العرفان فی علوم القرآن : از پروفیسر قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۳۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت 15/ پتہ: ایجوکیشنل ہاؤس، سول لائنز علی گڈھ۔

علوم قرآن پر عربی زبان میں کتابیں کثرت سے لکھی گئی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور و متداول اور جامع کتاب علامہ جلال الدین السیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن ہے لیکن اول تو ان کتابوں میں مباحث بہت مبسوط اور منتشر ہیں جن کو سمیٹنا ہر شخص کا کام نہیں ہے اور پھر جو حضرات عربی سے واقف نہیں ہیں وہ تو ان کتابوں سے استفادہ کر ہی نہیں سکتے، اس بنا پر پروفیسر بلگرامی نے یہ خوب کیا کہ اس موضوع پر یہ کتاب اردو میں لکھدی، یوں تو علوم قرآن کا دائرہ نہایت وسیع ہے جن پر بڑی بڑی ضخیم مجلدات لکھی گئی ہیں لیکن اس کتاب میں بحث و گفتگو کو جمع و ترتیب قرآن، اسباب نزول اور محکم و متشابہ تک محدود رکھا گیا ہے اور درحقیقت قرآن مجید سے متعلق یہی وہ تین اہم مباحث ہیں جن کا علم قرآن کے ہر طالب علم کو ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں موضوع بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جسے تشنہ چھوڑدیا گیا ہو، جو کچھ لکھا ہے قدیم و جدید لٹریچر کے وسیع اور عمیق مطالعہ اور غور و فکر کے بعد مع حوالوں کے صاف و سلیس اور شگفتہ زبان میں لکھا گیا ہے، گویا کہ فاضل مصنف نے ضخیم مجلدات کا عطر نکال کر دیا ہے

کوزہ میں بند کردیا ہے، عام مطالعہ کے علاوہ کتاب اپنے اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ اسے مدارس اور کالجوں کے نصاب، دینیات میں داخل کیا جائے۔

فقہ الزکوٰۃ: ترجمہ و تلخیص از جناب شمس پیرزادہ صاحب۔ تقطیع متوسط، ضخامت ۴۸۷ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۔/25 روپے، پتہ: ادارۂ دعوۃ القرآن ۵۹، محمد علی روڈ، بمبئی 3 400004

قطر یونیورسٹی کے مشہور لائق و قابل اور فاضل وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے زکوٰۃ کے مسائل و مباحث پر ایک محققانہ کتاب دو جلدوں میں عربی میں لکھی تھی جس کا عالم اسلام میں بڑا چرچا ہوا تھا، اس کتاب میں جو نو ابواب اور بیسیوں فصول پر مشتمل ہے اولاً اس پر مفصل بحث کی ہے کہ زکوٰۃ جو عبادت ہے اور ایک بہترین قومی نظام مالی ہے اس کو اسلام میں کس درجہ اہمیت ہے۔ اس کے بعد زکوٰۃ جن چیزوں پر واجب ہوتی ہے مع ان کے نصاب اور دوسرے مسائل و مباحث کے ان کو باب وار الگ الگ بیان کیا ہے اور پھر قرآن مجید میں جو مصارف زکوٰۃ بیان کیے گئے ہیں ان کو بسط و تفصیل اور تحقیق بلیغ کے ساتھ ایک ایک فصل میں الگ الگ بیان کیا ہے، زکوٰۃ کے معاملہ میں ایک دو نہیں بیسیوں مسائل ہیں جو فقہا کے درمیان مختلف فیہا ہیں مثلاً زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے یا نہیں، سونے چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں، اسی طرح مصارف زکوٰۃ کے باب میں کیا مؤلفۃ القلوب کا حکم اب بھی باقی ہے؟ نیز یہ کہ غارمین، یعنی مقروض لوگوں میں کون لوگ داخل ہیں، زکوٰۃ کا ایک مصرف "سبیل اللہ" بھی ہے، یہاں اس سے مراد صرف جہاد ہے یا ـــــ وہ کام جو تقرب الی اللہ کے لیے کیا جائے وہ بھی اس لفظ کے عموم میں داخل ہے فاضل مصنف نے ان سب اختلافی مسائل پر کلام اس طرح کیا ہے کہ پہلے ہر امام کے دلائل و براہین الگ الگ بسط و تفصیل سے بیان کیے ہیں اور پھر ان پر محاکمہ کر کے اپنی رائے مدلل

تحریر کی ہے، علاوہ ازیں زکوٰۃ کے کتنے ہی جدید مسائل ہیں جن سے آج عالم اسلام دوچار ہے مثلاً سونے چاندی کے نصاب کا تعین، پراویڈنٹ فنڈ اور بونس پر زکوٰۃ نیز یہ کہ اگر کوئی اسلامی حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے تو کیا وہ کوئی اور ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔ فاضل مصنف نے ان سب مسائل جدیدہ پر بھی بڑی سیر حاصل اور محققانہ بحث کی ہے زکوٰۃ کے علاوہ صدقۃ الفطر اور عشر و خراج پر بھی مفصل اور بصیرت افروز کلام کیا ہے، مصنف کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کتاب نہایت جامع، مبسوط و مفصل اور بڑی محققانہ ہے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے توازن و اعتدال سے لکھا ہے، انداز نگارش بہت سلجھا ہوا اور عام فہم و دلنشین ہے، لائق مترجم نے اس اہم کتاب کا اردو میں ملخص ترجمہ کر کے ایک بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، ترجمہ کی زبان شگفتہ و سلیس اور رواں دواں ہے۔ ارباب ذوق کو اس کے مطالعہ سے شادکام ہونا چاہیے، مولانا سید ابوالحسن علی میاں نے اس کتاب کا جو مقدمہ لکھا ہے وہ بجائے خود زکوٰۃ کی اہمیت اور کتاب کی عظمت پر ایک مستقل مقالہ ہے جو پڑھنا چاہیے۔

<u>عقیدت کے پھول</u> از جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۶۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت مجلد -/25 :- پتہ: بیدل اکاڈمی، بیدل منزل، بیکانیر۔

عارف صاحب مرکز میں تعمیرات و مکانات کے نائب وزیر ہیں، مگر ذوق شعر و ادب اور تصوف کی دولت انھیں ورثہ میں ملی ہے، چنانچہ موصوف کے والد ماجد مولانا محمد عبداللہ مرحوم نامی گرامی عالم اور صوفی تھے اور شاعری بھی کرتے تھے، بیدل تخلص تھا اس بنا پر عارف صاحب صوفی بھی ہیں، نقشبندی سلسلہ میں بیعت ہیں اور ساتھ ہی شاعر شیوا بیان بھی، زیر تبصرہ کتاب ان کا مجموعۂ کلام ہے جس میں نعتیہ اور بعض

صوفیائے کرام کی مدح و منقبت میں چھوٹی بڑی نظموں کے علاوہ بعض نظمیں امام حسین اور واقعۂ کربلا پر ہیں، لیکن ان نظموں کی یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ امام حسین اور شہدائے کربلا کا ماتم جس طرح ہر سال بڑی دھوم دھام اور طمطراق سے منایا جاتا ہے اس پر سخت تنقید کی گئی ہے، چنانچہ درس شہادت کے عنوان سے جو ایک طویل نظم ہے اس کے ایک بند کے آخری شعر میں کہتے ہیں:

احسان کر رہے ہو یہ روحِ امام پر
رونا ہی صرف سیکھے ہو مولا کے نام پر؟

ایک اور بند کا آخری شعر ہے:

کیسا یہ احترام ہے خونِ شہید کا
جو کام کر رہے ہیں وہ شمر و یزید کا۔؟

اس کتاب کا اجرا پچھلے دنوں پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کے سلسلہ میں جو ایک بین الاقوامی سیمینار نئی دہلی میں ہوا تھا اس موقع پر کانفرنس کی نہایت دلآویز و فکر انگیز افتتاحی تقریر کے بعد وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کیا تھا، پھر اس کتاب پر نائب صدر ہند جناب محمد ہدایت اللہ نے چار صفحات کا جو پر مغز اور دلچسپ پیش لفظ لکھا ہے وہ خود موصوف کے لطیف و حسین ذوق شعر و ادب کا آئینہ دار ہے اس پیش لفظ میں نعت گوئی کی سنگلاخ وادی کے نشیب و فراز پر کلام کرنے کے بعد موصوف نے بالکل بجا لکھا ہے کہ "عارف صاحب کی نعتوں میں ایمان اور ایقان کی پختگی، تاثیر و نفوذ، فن کی عظمت، اسلوب کی دلآویزی اور عقیدت کے جذبات کی شدت ہر شعر میں نمایاں ہے (ص ۱۳) اس کتاب کا مطالعہ" ہم خرما و ہم ثواب" کا مصداق ہوگا۔

گلزارِ خلیل　از جناب خلیل الرحمٰن خلیل مرحوم تقطیع متوسط ضخامت ۹۶ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت مجلد درج نہیں پتہ: شوکت آرا بیگم

۱۰ بی - امداد علی لین - کلکتہ - ۱۶

خلیل الرحمٰن صاحب کلکتہ کے عجیب خوش ذوق اور باغ وبہار انسان تھے، کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم - اے کرنے کے بعد کلکتہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے۔ اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے عہدہ تک پہنچے اور اسی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ لیکن شعر وادب کا ذوق فطری تھا اور اردو تو ان کی مادری زبان تھی، فارسی شعروادب کا بھی بڑا پاکیزہ اور لطیف مذاق رکھتے تھے اس بنا پر سرکاری ملازمت کی غیر شاعرانہ مصروفیتوں کے ہنگامہ میں بھی دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے رہے، ادبی مجلسوں میں اپنا کلام سناتے اور سخن شناسان گرامی مرتبت سے بے ساختہ داد پاتے تھے، ۱۹۷۵ء میں راہی ملک بقا ہوگئے، تو ان کی محبوب بیوہ نے جن کی نسبت انھوں نے ایک فارسی غزل میں کہا ہے:

شوکت آرا بہ خلیل آمدہ ہمراہ او
شان وشوکت شرف وعز ووقار آمدہ است

مرحوم کا کلام جو کچھ بھی ملا اسے یکجا کر کے شائع کر دیا ہے، یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں اردو فارسی، غزل نظم مرثیہ سب کچھ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے مرحوم کو ہر صنف سخن پر یکساں قدرت تھی - فارسی کلام میں حافظ کا رنگ نمایاں ہے۔ متعدد اردو فارسی نظمیں اور غزلیں نعت میں بھی ہیں ان میں بڑی بے ساختگی اور دل بر داشتگی ہے جو شاعر کے عشق نبوی کا آئینہ دار ہیں۔ اردو غزلوں میں سوز وگداز، درد وکرب، نزاکت خیال اور جدت اسلوب وطرفگی اظہار و بیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں غزلوں میں جو رمزیت ہے وہ اس کی دلیل ہے کہ شاعر نے غم روزگار کو غم جاناں بنالیا ہے اور یہ ایک شاعر کے فنکار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ امید ہے ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔ (س)

باغی ہندوستان

مؤلفہ مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی (ریٹائرڈ اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔)

اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے ایک "باغی" مجاہد علامہ فضل حق خیرآبادی اسیر انڈمان اور آپ کے سلسلے کے بعض اکابر علماء کا تذکرہ ہے شروع میں ہندوستان کی علمی حیثیت اور مسلمانوں کے ورود کے بعد دینی و دنیوی علوم کی ترویج و ترقی کا مختصر بیان بھی ہے۔

آخر میں علامہ کے قلم سے نکلا ہوا رسالہ "الثورۃ الہندیہ" ہے جس میں علامہ نے پہلی جنگ آزادی کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اس جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کتنا حصہ رہا ہے اور خود ان پر اور دوسرے اکابر پر حاکم و مسلط قوم (انگریز) نے کیا کیا ستم روا رکھے مؤلف نے اس عربی رسالہ کا ترجمہ سلیس اردو میں کیا ہے جو متن کے ساتھ درج ہے۔

اس کتاب میں علامہ کے ایک مکتوب گرامی مورخہ ۱۲۷۵ھ کا عکسی بلاک اور علامہ کی ضبط شدہ حویلی کے دروازے کے اندرونی و بیرونی منظر کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا تعارف امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے کرایا ہے۔ پہلا ایڈیشن اوائل ۱۹۴۷ء میں مدینہ پریس بجنور نے ایک ہزار نکالا تھا جو اسی سال ختم ہو گیا۔ اسکی مانگ ہند و پاکستان سے برابر جاری ہے دوسرا ایڈیشن مکتبہ قادریہ لاہور نے ۱۹۷۴ء میں اسی تعداد میں نکالا وہ بھی ختم ہو گیا تیسرا ایڈیشن پھر مکتبہ قادریہ نے ۱۹۷۸ء میں نکالا جو قریب الختم ہے۔ سائز ۲۲×۱۸ کتابت و طباعت و کاغذ بہتر، صفحات ۴۶۰، قیمت ۴۴ روپے: ملنے کا پتہ: مکتبہ نادیہ علمیہ دفتر جمہور محمد علی روڈ بالائے قلعہ علی گڑھ، یو۔پی۔: مکتبہ برہان ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت وعصمت ، تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول ، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس ، روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب اور کوئین

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط ، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب واخلاق ۔ عروج وزوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عربی ثقافت ، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ روہیلکھنڈ ، ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات ، لا مذہبی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ بزم عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف وسلوک ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات ، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ المغازی ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل ، عربی ادب میں حصۂ ہندوستان